قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

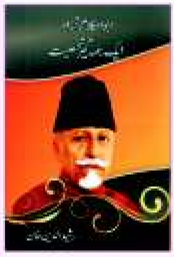

مصنف: رشیدالدین خان

صفحات: 684

قیمت: 235 روپے

فرہنگِ مولانا ابوالکلام آزاد

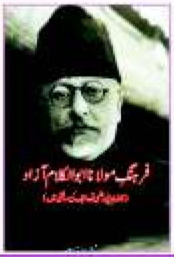

مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 669

قیمت: 290 روپے

درسِ بلاغت

ادارہ

صفحات: 230

قیمت: 85 روپے

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ابوسفیان

صفحات: 203

قیمت: 110 روپے

گوپال متل (مونوگراف)

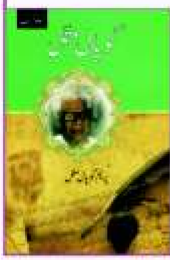

مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117

قیمت: 80 روپے

کوثر چاندپوری (مونوگراف)

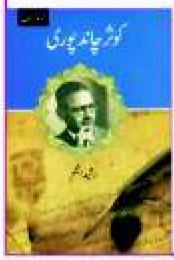

مصنف: رشید انجم

صفحات: 150

قیمت: 90 روپے

ہندوستان میں تانیثیت

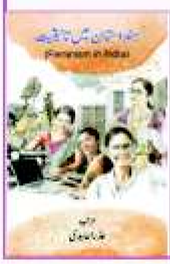

مرتبہ: عذرا عابدی

صفحات: 392

قیمت: 180 روپے

برق اور مقناطیس

مصنف: محمد یٰسین

صفحات: 158

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:21، شمارہ:09، ستمبر 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی موجودہ صورتِ حال احرار اعظمی 6

نقد و نگاہ

ولی: لسانی خود مختاری عبدالحق 9
مشرق و مغرب کے ناقدانہ شعور پر ایک نظر محمود شیخ 11
میر کی شاعرانہ عظمت مسعود جامی 15

پس نو آبادیاتی مطالعات شگفتہ یاسمین 17
مطالعہ کی اہمیت شاہ اجمل فاروق ندوی 23
اردو ناولوں میں عورتوں کی ترجمانی واثق الخیر 27
نئے لفظی نظام کا شاعر: ناصر کاظمی محمد حنیف خان 32
انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں بلال احمد ڈار 35

زبان اور زمینی صورت حال

اردو کی خوشبوؤں سے معطر جہان ہے رضا الرحمٰن عاکف 40

جن کی یاد آتی ہے

بیکل اتساہی
ایک درویش صفت سخن ور تابش مہدی 44
انور جلال پوری ملکہ نسیم 47

عالمی ادبیات

حادثاتی ناموں سے مشہور عربی کے چند شعرا شمس کمال انجم 49

دبستان مہجر کا ایک عظیم شاعر
ایلیا ابو ماضی محمد نعیم صدیقی 52

نیا آسماں نئے ستارے

اردو کی ابتدائی خواتین ناول نگار زلفی حسیب 54
راجستھان میں سیرت نگاری شائستہ جبیں 58
اردو تحقیق کا غواص
ڈاکٹر محی الدین قادری زور صلاح الدین ساہا 60

معاشیات/سماجیات

معاشی ترقی میں مادی و غیر مادی عوامل کا تصادم سید اطہر رضا بلگرامی 63

کمپیوٹر

گرافکس 67

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 69

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 82

ہماری بات

بچے ملک کا مستقبل اور قوم کا سرمایہ ہیں۔ اس سرمایے اور مستقبل کا تحفظ ہماری معاشرتی ذمے داری ہے۔ مگر ہماری بے توجہی کی وجہ سے بچوں کا بچپن کھوتا جارہا ہے۔ ان کی معصومیت معدوم ہوتی جارہی ہے۔ کچی عمر میں ان کے کندھوں پر بھاری بوجھ ہے۔ صورتِ حال ایسی بن گئی ہے کہ بچے غربت یا اپنے بوڑھے ماں باپ کی معاشی کفالت کے لیے مزدوری کرنے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے ان کے بچپن کی ساری آرزوئیں، تمنائیں، خواب اور خوشیاں چھن جاتی ہیں۔

یہ صرف ایک ملک یا ایک قوم کا قصہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بچوں کا یہی دکھ درد ہے۔ تاروں کو دیکھنے کی عمر تناؤ میں بدل جائے ،کھیلنے کودنے کی عمر میں فکرِ معاش ستانے لگے تو اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوسکتی ہے؟ ہمارے ملک میں بھی بچوں کی زندگی سے بہت سے المیے جڑ گئے ہیں۔ چھوٹی سی عمر میں اداسیاں، محرومیاں ان کے ننھے منے وجود سے چمٹ جاتی ہیں اور ان کی پوری توانائی اور طاقت کو سلب کرلیتی ہیں۔ یہ صورتِ حال بہت تشویشناک ہے۔ ہمیں اِس پر سنجیدگی سے توجہ دینی پڑے گی تا کہ ہم بچوں کے مستقبل اور ان کے بچپن کو محفوظ رکھ سکیں۔ بچوں کے حقوق، تحفظ نگہداشت اور روشن مستقبل کے لیے ایک مضبوط لائحہ عمل تیار کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے اور اس کے لیے پہلا قدم بچوں میں خواندگی کا جذبہ پیدا کرنا، ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کرنا اور ان کی ذہنی نفسیات اور ترجیحات کے پیش نظر تعلیمی مواد تیار کرنا ہے۔ اس محاذ پر اگر ہمیں کامیابی مل گئی تو یقینی طور پر یہی بچے ہمارے ملک کی تعمیر و تشکیل بھی کریں گے اور مستقبل کو ایک نیا رنگ بھی دیں گے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت پر اس وقت سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ماہرین تعلیم کو آگے آنا ہوگا اور ان کے لیے ایک ایسا نصاب تیار کرنا ہوگا جو ان کے لیے مفید ہو۔ اسی سے جڑا ہوا مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کے لیے کیسا ادب تیار کیا جائے اور ان کی کردار سازی کس طرح کی جائے؟ تفریح کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کس طرح کیا جائے؟ ماضی میں بچوں کے لیے بہترین کہانیاں، نظمیں وغیرہ ہمارے بزرگوں نے لکھی تھیں۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی خاص طور پر بچوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے کہ انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں تحریر کیں جنھیں پڑھ کر بچوں کے اندر سلیقہ اور شعور پیدا ہوا۔ اسی طرح بعد کے ادیبوں نے بچوں سے دوری نہیں بلکہ قربت اختیار کی اور ان کے لیے بہت کچھ ایسا لکھا جس سے ان کے اندر قومی شعور بیدار ہوا اور وہ اپنے مستقبل کو روشن کرسکیں۔ مگر اب حالات بدل رہے ہیں، بڑے قلم کار بچوں کے لیے لکھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ گو کہ بچوں کے ادب کا وافر سرمایہ موجود ہے پھر بھی ضرورت ہے کہ ہمارے بڑے قلم کار آج کے بچوں کی ذہنی ضروریات کو سمجھتے ہوئے بچوں کے ادب سے جڑیں کیونکہ ان کے جڑنے سے ہمارے پاس بچوں کے ادب کا بہتر اور عمدہ ذخیرہ ہوگا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ادبِ اطفال پر سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی ہے اور برسوں سے جو ایک جمود سا طاری تھا وہ ٹوٹ رہا ہے۔ ادب اطفال کے حوالے سے سمینار اور سمپوزیم بھی منعقد ہورہے ہیں جن میں ادبِ اطفال کو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کرنے کے حوالے سے معنی خیز گفتگو بھی ہورہی ہے۔ بہت سے ادارے بچوں کے لیے دیدہ زیب، جاذبِ نظر کتابیں بھی شائع کررہے ہیں۔ مختلف ریاستوں میں جہاں اس وقت بچوں کے لیے عمدہ کتابیں شائع ہورہی ہیں وہیں اچھے رسائل بھی شائع ہورہے ہیں۔ اس ضمن میں قومی اردو کونسل کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ قومی اردو کونسل نے اپنے سلسلۂ مطبوعات کے تحت بچوں کے لیے کہانیاں، ناول، ڈرامے، سوانحی ادب، سائنسی ادب، سماجی ادب پر مشتمل کتابیں شائع کی ہیں اور خاص طور پر سائنس اور ماحولیات پر توجہ دی ہے۔ دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ کتابیں بھی قومی اردو کونسل سے شائع ہوئی ہیں۔ بچوں کے لیے کونسل کی جو مطبوعات ہیں وہ یقیناً بیش قیمت ہیں اور ان میں عصر حاضر کے بیشتر موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قومی اردو کونسل ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' بھی شائع کررہی ہے جس میں بچوں کی دلچسپیوں کا بھرپور مواد ہوتا ہے۔ یہ رسالہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ممالک میں بھی مقبول ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سارے ادارے ہیں جہاں سے بچوں کے لیے بیش قیمت کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ پیامِ تعلیم، امنگ، باغیچہ، گل بوٹے اور روشن ستارے، جیسے رسالے شائع ہورہے ہیں۔ یقینی طور پر بچوں کے ادب پر بہت اچھا کام ہورہا ہے مگر اس وقت ضرورت ہے کہ دنیا کی بڑی زبانوں اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں لکھے جانے والے ادب اطفال کی سمت و رفتار کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں اردو میں ادب اطفال کے لیے ایک مربوط لائحہ عمل تیار کیا جائے اور اس کے لیے کل ہند سطح پر ادب اطفال اکادمی کا قیام ضروری ہے، اس سلسلے میں اردو کے تمام ادارے، انجمنیں، اکادمیاں ساتھ ہوں تو یقینی طور پر بچوں کے ادب کے فروغ کے ضمن میں بہتر کام ہوسکے گا۔

شیخ عقیل احمد

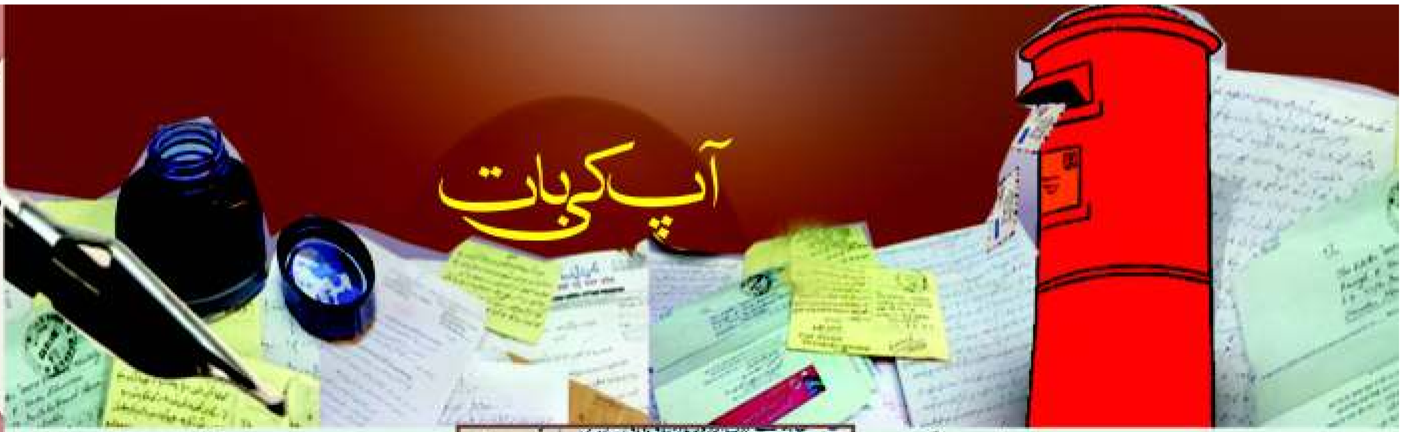

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ بہت تاخیر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ زیرِ نظر شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے کتاب کلچر کی اہمیت و عظمت کو واضح کیا ہے۔ بقول آپ کے بے شک کتاب اسرار و رموز سے آشنا کرتی ہے اور آدابِ زندگی بھی سکھاتی ہے لیکن آج کتاب کی جگہ موبائل اور انٹرنیٹ نے اپنا جال اس طرح پھیلا دیا ہے کہ لائبریریوں، مدرسوں اور کالجوں میں کتابیں پڑھنے والے انگلی بھر موبائل میں مقید ہو چکے ہیں جبکہ کئی ذاتی اور سرکاری لائبریریوں میں نایاب اور نادر کتابیں دھول میں اٹی ہوئی دیمکوں کی غذا بنتی جا رہی ہیں لیکن یہ اٹل حقیقت ہے کہ اس مطالعہ شکن ماحول میں بھی کچھ قارئین اور قلم کار موجود ہیں جو کتابوں اور رسالوں کو آنکھوں اور دلوں سے لگائے ہوئے ہیں کیونکہ بقول آپ کتابوں سے ہی اپنی روایت اور تہذیب کا رشتہ وابستہ اور پابستہ رہ سکتا ہے۔ قومی کونسل نے مختلف ریاستوں اور اضلاع میں کتاب میلے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ مستحسن ہے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

✍ 'اردو دنیا' کے اگست ماہ کے شمارے کا سرورق اس بار نابغہ روزگار شخصیتوں کی خوبصورت تصاویر سے آراستہ و پیراستہ منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر عبدالحی نے کشمیر میں منعقد کتاب میلے کا ایک ہمہ گیر واحسن رپورتاژ پیش کیا ہے۔ جناب محمد قاسم انصاری کا اردو شاعری میں شری رام چندر جی اور ان سے وابستہ داستانوں پر مبنی مضمون از حد معلومات افزا و تحقیق طلب ہے۔ والمیکی (بالمیکی) کے شہرہ آفاق صحیفہ 'رامائن' کے ہی نام کا استعمال گوسوامی تلسی داس جی کے صحیفہ 'شری رام چرت مانس' کے نام کے علاوہ مزید 'رامائن' نام کے ساتھ بھی، صحیح نہ ہونے کے باوصف، دیگر بیشتر ادبا کی ہی مانند اس مقالے میں بھی صفحہ 41 پر کیا گیا ہے۔ املا کی معدودے چند اغلاط یہ ہیں 'کی عوام' (کے عوام)، 'بھرا (بھرتا) اور اگلے ص پر بھی 'جگناتھ' (جگناتھ' یا 'جگن ناتھ')، 'سپ نکھ' (سروپ نکھا)۔ اسی ص پر محولہ ایک شعر میں 'تقصیر' لفظ کے بعد 'عطا ہو' یہ الفاظ بے حد کھٹکتے ہیں۔

نکولن کے وی صاحب نے اپنے مقالے میں غیر مسلم ادبا کی 'تاریخ اردو ادب' میں خاص حصہ داری درج کرنے کا ایک از حد مفید و معلوماتی تجزیہ کیا ہے۔

محترمہ اسما نے بادشاہ نواب واجد علی شاہ 'اختر' کی مانند ہندوستانی عوام میں مروجہ تیوہاروں، رسوم وغیرہ کی جو بے مثال عکاسی کی ہے، اس کا اپنے مضمون میں بخوبی سیر حاصل محاکمہ کرنے میں کامرانی پائی ہے۔ موصوف نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم یک جہتی کے لیے اپنے وسیع المشرب ہونے کے جو متعدد جامع اور مستند ثبوت فراہم کیے ہیں، محترمہ اسما نے ان کا غیر جانبدار محاسبہ کرتے ہوئے اپنے عمیق و دقیق مطالعے پر بھی ایک مثبت مہر نصب کی ہے۔

گذشتہ دیگر شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی ایک خاص غلطی کی جانب یہ خاکسار آپ کی توجہ مبذول کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس بار بھی ص 48 پر 'سوال نامہ' مستقل کالم کے تحت 'عربی کے 'وجہ' اسم مونث لفظ کے با ضابطہ جمع مذکر لفظ 'وجوہ' ہونے پر بھی 'وجوہات' کا ہی اعادہ درج کیا گیا ہے۔ آگے سے اس کی بجائے 'کے وجوہ' ان صحیح الفاظ کی اشاعت کی جائے۔ دست بستہ گزارش ہے کہ اب تو اس غلطی کی تصحیح کروا دی جائے۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک**: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک، پٹیالہ

✍ 'اردو دنیا' کا شمارہ جولائی 2019 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر تصویر معنی خیز ہے جس میں کتابوں کو بتلایا گیا ہے کہ کتاب زندگی کا سچا ساتھی ہے، کتابوں سے ہی دنیا کی ترقی ہوتی ہے، سماج اور معاشرہ مہذب کہلاتا ہے، بغیر کتاب کے زندگی بے کار ہے، کتابوں سے دل لگانا، کتابوں کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے تاکہ شخصیت سازی و کردار سازی میں مدد مل سکے۔ سماج سے کتابی کلچر ختم ہو کر سائبر کلچر آ رہا ہے جس کی وجہ سے ایک اخلاقی خلا سماج میں پیدا ہو رہا ہے، کتب سے اخلاقی درستگی ہوتی ہے، مدیر محترم نے ہماری بات اداریہ میں کتابوں کی دنیا اور سماج میں کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے عصری معاشرے کو کتابوں سے کیسے جوڑا جائے اور مطالعہ کے رجحان کو فروغ دیا جائے۔ شکیل احمد نے زبان اور زمینی صورت حال میں اردو کے تعلق سے جو باتیں بتلائی ہیں وہ قابل غور ہیں۔ نقد و نگاہ میں تقی عابدی نے 'کس کس نے حالی کی مخالفت کی' میں حالی پر جن لوگوں نے اختلافی رویہ اختیار کیا ہے ان کی نشاندہی کی ہے۔ مضمون معیاری اور تحقیقی ہے۔ شمس بدایونی نے غالب صدی کے بعد دیوان یعنی 1869 سے لے کر 1969 تک کا احاطہ کیا ہے۔ علی عباس نے اردو کا پہلا نثری سفرنامہ میں تحقیقی تدوینی بحث کی اور تاریخی سنین کے لحاظ سے اردو کے پہلے سفرنامہ پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں عجائب فرنگ یوسف خاں کمبل پوش کو اردو کا پہلا سفرنامہ قرار دیا ہے۔ مہتاب جہاں نے سلاطین دہلی کے علمی و تعلیمی رجحانات و کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ محمد نہال افروز نے 1980 کے بعد اردو اور ہندی کی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ میں افسانہ نگاروں کے افسانے اور ان میں کہی گئی باتیں پیش کی ہیں۔ غیر افسانوی ادب معلوماتی مضمون ہے جس میں مقالے، مضمون، انشائیہ وغیرہ کا اجمالاً تعارف پیش کیا ہے۔ اس شمارے کے دیگر مشمولات بھی غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور معنویت سے بھرپور ہیں۔ یہ شمارہ منفرد ہے اور اردو ادب کے طالب علموں، خاص کر ریسرچ اسکالر کے لیے ایک اثاثہ سے کم نہیں۔ میں مدیر اور ان کے رفقا کو مبارک باد دیتا ہوں۔

❖ **ناظم علی**: سابق پرنسپل، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

احرار اعظمی

مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی موجودہ صورتِ حال

کسی دور میں بمبئی کو ایک ریاست کا درجہ حاصل تھا اور اس کی سرحدیں گجرات کے مشہور تاریخی شہر احمد آباد تک پھیلی ہوئی تھیں مگر یکم مئی 1960 میں مہاراشٹر کے نام سے ایک الگ صوبے کا قیام عمل میں آیا جس کی راجدھانی بمبئی (موجودہ نام ممبئی) ہے جو کہ مہاراشٹر کی راجدھانی ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی معاشی راجدھانی بھی ہے۔ صنعتی اعتبار سے یہ صوبہ دنیا میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ تعلیمی میدان میں بھی اس صوبے نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ خاص کر تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ موجودہ دور میں جہاں ایک طرف ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اردو کی صورت حال افسوس ناک اور اردو اسکولوں کی حالت خستہ ہے وہیں دوسری طرف مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال دوسرے صوبوں کی بہ نسبت بہتر ہے۔ یہاں کے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے اس لحاظ سے ریاست مہاراشٹر کے اسکولوں کو ملک کے دوسرے صوبوں کے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں پر سبقت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 2018 تک کی معلومات کے مطابق مہاراشٹر میں حکومت سے منظور شدہ، 5240 / اردو ذریعہ تعلیم اسکول قائم ہیں جس میں طلبا کی تعداد 1329120 / ہے اور 39603 / اساتذہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں ممبئی بلدیہ کارپوریشن، حکومت مہاراشٹر اور مختلف اداروں کے ذریعے چلائے جانے والے اسکول شامل ہیں۔

یہاں پر ایک زمانے سے اردو تعلیم کا، پرائمری سے سیکنڈری سطح تک معقول انتظام رہا ہے۔ اردو تعلیم کے فروغ میں حکومت مہاراشٹر اور ممبئی بلدیہ کارپوریشن نے ہر دور میں فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا ہے اس لیے شہر اور مضافات کے ساتھ ساتھ ریاست کے دوسرے شہروں اور گاؤں میں گرام پنچایت، بلدیہ کارپوریشن اور حکومت مہاراشٹر کے اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم نظام قائم رہے۔ ریاست میں ایسے بہت سے پرائمری اور سیکنڈری اسکول ہیں جن کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اس کے علاوہ کئی انگریزی، ہندی اور مراٹھی میڈیم اسکولوں میں بھی اردو بحیثیت ایک مضمون کے نصاب میں شامل ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی کوشش بھی جاری ہے کہ جن اسکولوں میں اردو مضمون نصاب میں شامل نہیں ہے وہاں اسے نصاب میں شامل کیا جائے جس کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی جارہی ہے۔ انجمن اسلام الانا ٹرسٹ، جس کے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کے علاوہ ریاست کے مختلف علاقوں میں انگلش میڈیم اسکول بھی ہیں جس میں انھوں نے ایک مضمون اردو کا رکھ کر جائزہ لیا تو اس کے نتائج کافی تسلی بخش ثابت ہوئے۔

مہاراشٹر کے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے کئی طلبا زندگی کے مختلف شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیتے ہوئے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ معروف نقاد، شاعر اور کالم نگار شمیم طارق نے اپنے متعدد مضامین میں، مہاراشٹر میں اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی ایسی مشہور و معروف شخصیات کا تعارف پیش کیا ہے جنھوں نے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں سے اپنا تعلیمی سفر شروع کیا تھا، اعلیٰ تعلیم کے لیے آگے بڑھے اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان شخصیات میں مشہور فلم اداکار یوسف خان (دلیپ کمار)، عبدالرحمٰن انتولے (سابق وزیر اعلیٰ حکومت مہاراشٹر)، وکیل مجید میمن (رکن راجیہ سبھا اور NCP کے قومی جنرل سکریٹری)، عبدالرحیم اندرے (معروف جراح) اور فریدہ نائیک (I.A.S) وغیرہ جیسے کئی نام شامل ہیں۔

1832 میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا، مہاراشٹر میں اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کی تاریخ 1827 سے ملتی ہے۔ 1874 میں انجمن اسلام، 1927 میں خیر الاسلام اور 1928 میں کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے قیام نے ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم فراہم کرنا ریاستی حکومت کی آئینی ذمے داری ہوتی ہے اس لحاظ سے حکومت مہاراشٹر کی امداد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آج مراٹھی اور انگریزی میڈیم اسکولوں کے بعد اردو اسکولوں اور طلبا کی تعداد تیسرے مقام پر ہے۔ عبدالشعبان کی تحقیق[1] اور مہاراشٹر پراتھمک شکشا پریشد کی اطلاع

کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کے تاریخی ارتقا کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے:

اسکولوں کی ارتقائی تاریخ	تعداد
1900 - 1827	156
1950 - 1901	750
1960 - 1951	296
1970 - 1961	413
1980 - 1971	434
1990 - 1981	679
2000 - 1991	928
2014 - 2001	1243
کل تعداد:	4899

یہ رپورٹ 2014 تک کی ہے (2018 تک کی تفصیل آگے آئے گی)۔ 2014 تک کتنے اردو اسکول، کس درجہ کے اور کون سی انتظامیہ کے تحت چل رہے تھے ان کی تفصیل اس طرح ہے:2

اقسام اسکول	گورنمنٹ لوکل باڈیز	پرائیویٹ ایڈیڈ	ان ایڈیڈ	ان ریکگ نائزڈ	تعداد
پرائمری	996	201	319	7	1523
پرائمری اوراپر پرائمری	1477	451	174	3	2105
پرائمری، اپر پرائمری اورسیکنڈری	3	5	9	0	17
پرائمری اوراپر پرائمری، سیکنڈری اور ہائرسیکنڈری	0	4	8	0	12
صرف اپر پرائمری	0	1	1	0	2
اپر پرائمری اورسیکینڈری	17	154	59	0	330
اپر پرائمری، سیکنڈری اور ہائرسیکنڈری	13	220	20	0	253
صرف سیکنڈری	62	222	232	8	524
سیکنڈری اور ہائرسیکنڈری	3	50	17	0	70
صرف ہائرسیکنڈری رجونیئر کالج	0	10	54	0	64
کل تعداد	2571	1418	893	18	4900

مہاراشٹر میں کل دس زبانوں کے اسکول ہیں (عربی مدرسے اس میں شامل نہیں ہیں)۔ 2014 تک مہاراشٹر کے سبھی اسکولوں کے طلبا کی تعداد 2,20,69,990 درج ہے جس میں مراٹھی ذریعہ تعلیم کے طلبا کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ ہے۔ انگریزی میڈیم کے طلبا کی تعداد نصف کروڑ کے قریب ہے۔ تیسرے نمبر پر اردو ذریعہ تعلیم کے طلبا ہیں جن کی تعداد 12,99,629 ہے اس کے بعد دوسری زبانوں کے طلبا ہیں۔ مذکورہ بالا، بالترتیب دو زبانوں میں لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کی تعداد زیادہ ہے جب کہ اردو میں لڑکوں کے مقابل لڑکیاں زیادہ ہیں۔

اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں میں طلبا کی تعداد ابتدائیہ میں زیادہ ہوتی ہے اور پھر بارہویں جماعت تک آتے آتے یہ تعداد نہایت ہی کم ہوجاتی ہے جس کا اندازہ ذیل میں 2014 کے اعداد وشمار کے جدول سے لگایا جا سکتا ہے:

اقسام درجہ	طلبا کی تعداد
ابتدائیہ	6,78,030
ثانوی	3,64,600
دسویں جماعت	1,86,371
بارہویں جماعت	70,628
کل تعداد	12,99,629

2014 کے بعد سے 2018 تک، مہاراشٹر میں پہلی جماعت سے بارہویں جماعت تک، اسکولوں، طلبا اور اساتذہ کے اعداد وشمار کی تفصیلات، مہاراشٹر پراتھمک شکشا پریشد سے حاصل شدہ نئی معلومات کے مطابق اس طرح ہے:

سال	اسکولوں کی تعداد	لڑکے	لڑکیاں	کل طلبا	کل اساتذہ
2014 - 15	5064	577145	764231	1341376	37685
2015 - 16	5144	573893	763356	1337249	38512
2016 - 17	5155	577360	767004	1344364	39060
2017 - 18	5240	567707	761413	1329120	39603

چند سال قبل تک مہاراشٹر کے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کے تعلیم یافتہ طلبا مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے تھے مگر آج انگریزی میڈیم اسکولوں کی بڑھتی مقبولیت کے سبب صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی اور مراٹھی میڈیم اسکولوں میں بھی طلبا کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے اور ان زبانوں سے بھی لوگوں کی دل چسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال کے باوجود ہندی اور مراٹھی میڈیم اسکولوں کی بہ نسبت اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں میں طلبا کا تعلیمی انقطاع کم ہے۔ موجودہ دور میں جیسے جیسے حکومت کی تعلیمی حکمت عملی بدلتی جارہی ہے اس کا اثر واضح طور سے تعلیمی اداروں پر دیکھا جا سکتا ہے اور خاص کر اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں پر حکومت کی ان حکمت عملی کے منفی اثرات کی نشاندہی واضح طور سے کی جاسکتی ہے۔ ان اسکولوں کے گرتے ہوئے معیار کی کئی وجوہ بیان کی جاسکتی ہیں جس میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ حکومت مہاراشٹر اور ممبئی بلدیہ کارپوریشن کی یہ حکمت عملی کہ وہ اپنے تعلیمی بجٹ میں کٹوتی کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 29/مارچ 2017ء کو مجلس قائمہ (Standing Committee) میں 2,31,163 کروڑ کا جو بجٹ پیش کیا گیا وہ گزشتہ سال یعنی 2016 - 17ء کے مقابلے 8,447 کروڑ کم تھا۔ گزشتہ سال بھی تعلیمی بجٹ میں کٹوتی کی گئی تھی اور مجموعی طور پر پچھلے دو سالوں میں تقریباً 19,942 کروڑ روپیہ کی کمی کی گئی ہے جب کہ حکومت مہاراشٹر اور ممبئی بلدیہ کارپوریشن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے 1200/اسکولوں کو ڈیجیٹل کرے گی اور کارپوریشن کے 100/اسکولوں کو نیم انگریزی میڈیم بنائے گی، نیز چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک 'بیٹی بچاؤ اور بیٹی پڑھاؤ' کی مہم شروع کی جائے گی مگر اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں پر اس مہم کا اثر کم دکھائی دے رہا ہے جس کی وجہ سے بعض اسکولوں کی حالت بہت خستہ ہے ساتھ ہی اساتذہ کی تقرری میں بھی کمی کی جارہی ہے جس کا اثر طلبا کی تعلیمی صلاحیت پر پڑ رہا ہے۔ اگر اسکولوں کا ماحول اچھا نہیں ہوگا، قابل اور لائق اساتذہ کی کمی ہوگی تو طلبا کو بہتر تعلیمی مواقع فراہم نہیں کیے جاسکیں گے۔

2۔ مہاراشٹر میں پرائمری سطح سے یونی ورسٹی سطح تک اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے والے اساتذہ کی تعداد غالباً بیالس ہزار سے زائد ہوگی مگر یہ شدت سے محسوس کیا جارہا ہے کہ اساتذہ کی تقرری میں پھیلی بدنظمی، بدعنوانی اور تنگ نظری کے سبب ایسے اساتذہ کا انتخاب نہیں ہو پا رہا ہے جو طلبا کے لیے مشعل راہ ثابت ہوسکیں، ان میں اردو زبان سے دل چسپی پیدا کرسکیں اور انھیں اس کی طرف متوجہ کرسکیں۔ جب کہ

مہاراشٹر کی کئی تنظیمیں طلبا اور اساتذہ کی رہنمائی کر رہی ہیں جس سے اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں، اساتذہ اور طلبا کا معیار بلند ہو سکے۔ طلبا اور اساتذہ اس احساس کمتری سے باہر نکل سکیں کہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کے اسکول کے طلبا کامیابی کی منزلیں طے نہیں کر سکتے۔

3۔ اس وقت ملک کے دوسرے صوبوں کی طرح مہاراشٹر میں بھی انگریزی تعلیم اور انگریزی میڈیم اسکولوں کی طرف لوگوں کی رغبت بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور مراٹھی میڈیم اسکولوں میں بھی طلبا کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے جب کہ لوگوں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہو تو اس کے لیے وہی کارآمد اور مفید ثابت ہوگی جس کی پرزور حمایت ہمارے ماہرین تعلیم نے بھی کی ہے اور ہماری توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کراتے ہوئے پرزور طریقے سے کہا ہے کہ جو کچھ ہم اپنی مادری زبان میں سیکھ سکتے ہیں وہ کسی دوسری زبان میں سیکھنا مشکل ہے۔ دوسری طرف انگریزی تعلیم اور انگریزی اسکولوں کے جو اخراجات ہیں وہ ایک عام آدمی برداشت نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ سرکاری محکموں کے اعداد وشمار کے مطابق انگریزی میڈیم اسکولوں میں طلبا کا تعلیمی سلسلۂ انقطاع، دوسرے اسکولوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

آج عالم کاری (Globalised) کے عہد میں سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ، زبان کا ثقافتی پہلو زیادہ اہم ہے یا کہ اقتصادی؟۔ دوسری طرف صرف اردو ہی نہیں ہندوستان کی سبھی زبانوں کے ماننے اور جاننے والوں کا یہ تصور بن گیا ہے کہ حد سے زیادہ عصری تقاضے اور اقتصادی محرومیت پر قابو پانے کے لیے انگریزی تعلیم سے عالم کاری دنیا میں مارکیٹ کی زبان، روزگار کے امکانات، جدید ٹیکنالوجی سیکھنے اور طرز زندگی کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

مہاراشٹر میں اردو کو ریاست کی دوسری زبان بنانے کے مطالبات جاری ہیں تا کہ اسے روزگار سے منسلک کیا جا سکے۔ یہاں کے اردو داں طبقے کو بھی یہ احساس ہوتا جارہا ہے کہ اردو زبان ثقافتی تحفظ کے لیے تو اہم ہو سکتی ہے لیکن عصری تقاضوں کو پورا اور معاشی حالات کو بہتر نہیں بنا سکتی۔

بارہویں کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے زبان وادب کے علاوہ اور کوئی مضمون اردو میں نہیں ہے۔ ہندوستان میں صرف مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی ہے جس نے سائنس، سیاسیات، سماجیات، معاشیات، تاریخ اور دیگر مضامین کو بذریعہ اردو نصاب میں شامل کرکے اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن ملک بھر میں اس کی یہ کوشش فاصلاتی تعلیم کے ذریعے انجام پارہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اداروں نے مذکورہ بالا مضامین کی اصطلاحی اردو لغت بھی ترتیب دی ہے جس سے اردو زبان کے طلبا استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کے اندر ریاستی سطح پر سرکاری، نیم سرکاری اور نجی دفاتر میں علاقائی زبان یا انگریزی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں کی ہر زبان (بشمول ہندی) پر علاقائی سرنامہ لگا ہوا ہے۔ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو اس علاقائی قید سے آزاد ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ اپنے حق سے محروم ہے جس کے ذمے دار غیر نہیں خود اس کے اپنے ہیں۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے تو یہ عالمی سطح پر صرف رابطے ہی کی زبان نہیں بلکہ تمام شعبۂ حیات کی رگوں میں سرایت کر گئی ہے۔ لہٰذا اقتصادی استحکام کے لیے اسے سیکھنا ضروری ہے۔ صرف اردو ہی کیوں! انگریزی زبان کے مقابل سبھی زبانیں اسی بدقسمتی کا شکار ہیں۔ اس بات کے مدنظر ہمیں اردو زبان کو انگریزی زبان کے مقابل رکھ کر نہیں دیکھنا چاہیے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو زبان اب صرف ثقافتی تحفظ اور جذبات کے اظہار تک محدود ہے؟ نہیں! ایسا سوچنا احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے۔ دنیا کے ماہرین تعلیم اور مفکرین کا متفقہ یہ قول ''بچوں کو تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے'' اب بھی صادق آتا ہے۔ انگریزی زبان بحرالکاہل کے اس بھنور کی طرح ہے جہاں دنیا کے سمندروں کا پانی بھنور کرتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی سبھی زبانوں کے علوم و فنون، انگریزی میں منتقل ہوتے ہیں اور انگریزی کے ذریعے ایک زبان دوسری زبان کی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون سے واقفیت حاصل کرتی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے مدنظر ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری یا غیر سرکاری جو بھی ادارے اردو کی بقا کے لیے کوشاں ہیں وہ انگریزی سے تمام علوم وفنون کو اعلیٰ تعلیمی پیمانے پر اپنی زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں جیسا کہ دارالترجمہ نے کیا تھا اور انگریزی زبان کو اردو کے تقابل میں دیکھنے کے بجائے اسے عصری ضرورت کے طور پر لازمی قرار دیتے ہوئے اس کی اصطلاحوں کو اردوانے کے باوجود قوسین میں انگریزی اصطلاح کو بھی ساتھ رکھیں تا کہ طلبا ابتدا ہی سے انگریزی اصطلاحوں سے واقف ہوں اور اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ زندگی میں انھیں دقت پیش نہ آئے۔

اردو ذریعہ تعلیم کو بہتر بنانے اور فروغ دینے کے لیے مہاراشٹر میں اداروں کی سرگرمیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ انجمن اسلام، خیر الاسلام، کوکن ایجوکیشن سوسائٹی، پونہ کالج اور اعظم کیمپس پونہ وغیرہ کے علاوہ ریاست کے مختلف اضلاع میں کئی نجی ادارے ہیں جو اردو اسکول کے طلبا میں خود اعتمادی قائم کرنے اور حوصلہ افزائی کے لیے علمی مقابلہ جاتی پروگرام کراتے رہتے ہیں۔ ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں اردو سرٹی فکیٹ کورس، ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کورس ہوتا ہے جس میں اکثریت غیر مسلم طلبا کی ہے جو اپنے ذاتی شوق یا فلمی دنیا سے جڑے ہونے کے لیے اردو سیکھنے آتے ہیں۔ 2019 میں این سی ای آر ٹی کے اشتراک سے ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو نے 3/ سے 13/ مارچ تک کا دس روزہ ورکشاپ (اردو اساتذہ کے لیے تربیتی کورس) کا انعقاد کیا تھا جس میں ریاست کے مختلف علاقوں کے نمائندہ اساتذہ نے شرکت کی تھی۔ 'ہندستانی پرچار سبھا' چرنی روڈ، ممبئی، جس کی بنیاد 1942ء میں مہاتما گاندھی جی نے رکھی تھی، یہاں تین سالہ اردو کورس ہوتا ہے جس میں غیر ملکی طلبا بھی اردو سیکھنے آتے ہیں۔ اس طرح اردو کی بقا اور اس کے معیار کو قائم رکھنے کے لیے مہاراشٹر میں عملی طور پر کوششیں جاری ہیں۔

مختصر یہ کہ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کو سب سے زیادہ خطرہ اردو اساتذہ اور اردو بولنے والوں میں پنپنے والی احساس کمتری سے ہے اگر اس مسئلے پر قابو پا لیا جائے تو یہ سمجھیے کہ اردو تعلیم کا مستقبل اس کے حال اور ماضی سے زیادہ شاندار اور کامیاب ہوگا۔

ماخذات اور حوالہ جات

1. "Urdu and Urdu Medium Schools in Maharastra" A bdul Shaban Economic & Political Weekly(EPW)July 18, 2015 Vol No 29 Page No 49

2. پراتھمک شکشا پریشد، حکومت مہاراشٹر، چرنی روڈ ممبئی

■

Shaikh Ahrar Ahmad (Ahrar Azmi)
Ph.D Research Scholar, Dept of Urdu
University of Mumbai, Kalina
Santacruz (East)
Mumbai - 400098 (MS)
Mob.: 09969460674 / 07498088534
Email: ahrarazmi1978@gmail.com

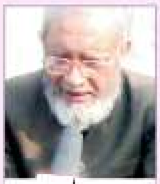

عبدالحق

ولی — لسانی خود مختاری

شمس الدین ولی (1650-1720) ہماری شعری ثقافت کا اعجاز اور فسوں سازیٔ فن کی علامت ہیں۔ وہ سرمایۂ سخن کے معمارِ اول ہی نہیں گوہر شاہ وار بھی ہیں۔ انھوں نے بے مثال خارہ تراشی اور فن گدازی کے لازوال پیکروں کی تخلیق کی ہے اور جہانِ نو کو بے کراں امکانات سے روشن کیا ہے۔ ولی سے قبل اور صدیوں بعد بھی اردو کو ایسا جامع کمالات قلم کار نہ مل سکا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ولی کے سامنے شعری سحر کاری کی کوئی ایسی مثال بھی نہ تھی جو انھیں مہمیز کرتی یا روایت سے روشناس کرتی۔ دکن میں ایک قابلِ قدر ذخیرہ ضرور موجود تھا مگر زیادہ تر داستان سرائی تک محدود تھا۔ ولی کی وسعتِ طلب رہ گزر کی روشنی کے لیے قلی قطب شاہ کی غزلیں ناکافی تھیں۔ ولی نے اردو غزل کو آبرو مندی ہی نہیں بخشی بلکہ فردائے قیامت کے لیے ایک میزان مقرر کر دیا۔ غزل بے پایاں امتیاز کے ساتھ دنیائے ادب میں رشک و حسد کا سبب بن گئی۔ حریفوں کو ولی کے شعری دستور دین کو قبول کرنا پڑا۔ ولی نے طرزِ تغزل کا آئینہ خانہ تعمیر کیا جو ہر دور کا اعتبار ٹھہرا۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی غزل گوئی پر ولی کے موثرات نشان زد کیے جا سکتے ہیں۔ اورنگ زیب کی بے نظیر وسعتِ نظری اور بصیرت کا فیضان اردو پر بھی ابر بہار بن کر برسا اور اردو کے دامنِ تخلیق کو ریزہ ہائے گہر سے سرشار کر گیا۔ فتح دکن ان کی سیاسی حکمت عملی تھی اور ہندوستان کو براعظم بنانے کی کارگر تدبیر بھی۔ بر سہا برس لاؤ لشکر کے ساتھ اورنگ آباد میں قیام اور جسدِ خاکی کو اسی سرزمین کے سپرد کر دینے کا عزم ان کی سرفروش زندگی کے عظیم مجاہدے کی مثال ہے۔ عاشقانِ پاک طینت کے مجاہدات زمین و زمان سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دہلی سے دکن کے طویل فاصلے ہی نہیں تفاوت و تضاد کو ہم آہنگ کرنے میں اس مرد درویش کا فیضان نظر ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔ ہماری کوتاہ بینی اس بدیہی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ہم نے صدق و صفا کے ساتھ اعتراف نہیں کیا۔ یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ اورنگ زیب نے بڑی مملکت کی بنیاد ڈالی اور شمال و جنوب کے لسانی و ثقافتی آہنگ کو ہم آمیز کرنے میں قابل قدر کام انجام دیا، جس کی کوئی تحریکی صورت نہیں تھی بلکہ دونوں علاقوں کے باشندگان کے شعور میں قربت کا احساس جاگزیں ہوا اور دبے قدم شمال و جنوب روبرو ہوئے۔ اس کی نمایاں مثال اردو ہے۔ اردو اس عظیم فرماں روا کے احسان سے گراں بار ہے۔ اردو کو ممکنات کی دنیا سے نئی آگہی حاصل ہوئی اور کئی صدیوں کی دکنی تخلیق سے متعارف ہوئی۔ ولی شمال و جنوب کے اتصال کی علامت ٹھہرے۔ اردو کو دنیا سے روشناس کرانے والے وہی ہیں جنھوں نے اورنگ آباد سے گجرات اور دہلی کے طویل فاصلے کو ایک جست میں طے کر کے سنگِ راہ کو سنگِ نشان بنا دیا۔ دہلی میں ریختہ کے چند شعرا مشقِ سخن میں مصروف تھے مگر ان کی تخلیق معتبریت سے محروم تھی، کیونکہ ابھی اردو کو نہ اعتبار حاصل تھا اور نہ ہی اس میں اظہار کی بھرپور قوت موجود تھی۔ علمی اسناد کے لیے اشرافیہ کی فارسی دانی کا علمی وقار لازم تھا۔ اردو کو خاطر میں لانا دلیل کم نظری تھی۔ فارسی کی لسانی برتریت تسلیم شدہ تھی۔ جہاں گیر کے چند اہم امرا تو پوری ایرانی تہذیب کو مسلط کر دینے پر آمادہ تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ولی ہی ہماری غزلیہ شاعری کے موجد ہیں۔

"ابتدائے ریختہ از وست۔ اول استاد این فن بنام اوست۔" (تذکرۂ میر حسن، انجمن ترقی اردو، ہند ص 184)

یہ ریختہ جو افتادہ و آمیختہ صورت میں ناسزاوار دید و شنید تھی۔ ولی نے اس کو رشکِ فارسی کے مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچا دیا۔ ولی کا یہ اظہار کہ ملک دکن کا باشندہ ہونے کے باوجود عراق و پارس دادِ سخن دینے کے لیے مجبور ہو گئے۔

ولی ایراں و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

ابوالمعانی کے ساتھ ولی 1113ھ/ 1700 میں دہلی وارد ہوئے۔ دہلی کے کوچہ و بازار سے گزرتے ہوئے ولی

کو لسانی مشاہدات سے بھی سابقہ ہوا۔ ریختہ کی عوامی مقبولیت سے بھی وہ آشنا ہوئے۔ فارسی کے فیضان کی وسعتوں اور اثرات کے ہم سب معترف ہیں۔ اردو نے اس زبان کے سب سے زیادہ اثرات قبول کیے۔ صرف زبان ہی نہیں ایرانی تہذیب وتمدن کے ساتھ ذکر وفکر کے سوز وساز میں عجمی تخیلات کے صنم کدے آباد ہوئے، جس سے آج تک ہم جاں بر نہ ہو سکے۔ فکرِ عرب بھی عجم میں تحلیل ہوکر ہم تک پہنچا۔ عربی مشاہدات کو ایران نے مسخ کیا اور ایک آمیزہ تیار کیا۔ وہی مرکب صورتیں یہاں کی آب وہوا کو بھی راس آئیں۔ فکر ونظر کی دنیا میں بڑے اندوہ ناک تصورات بالکل دبے قدم داخل ہوئے۔ دین ودانش کے محافظ بھی کافراوانی کی آہٹ کو محسوس نہ کر سکے۔ عقائد وافکار کی کشاکش نے جنم لیا۔ فارسی صرف شعر وادب کو ہی نہیں بلکہ فکر ونظر کے تمام اسالیب کا ذریعۂ اظہار بن کر مسلط ہوئی۔ تمام لسانی اکائیاں بے دست وپا ہوکر رہ گئیں۔ زیرِ تربیت اردو زبان کو بھی محروم ہونا پڑا۔ بھلا ہو شاہ سعد اللہ گلشن کا جنھوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ:

’’ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔‘‘ (نکات الشعرا ص 94)

اس مشورے میں فارسی سے بے نیازی کے ساتھ اردو کے حلقۂ گردن میں فارسی کے ساز دلبری کی پڑی بیڑی کو اتار پھینکنے کی ترغیب بھی تھی۔ فارسی مضامین کو بے کار کہہ کر انھوں نے انحراف کی رہ گزر پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ ریختہ کو ذریعۂ اظہار بنانے اور اپنانے کی ہدایت کی ہے۔ گویا یہ فارسی سے بیزاری کا آغاز ہی نہیں اس کے خلاف ایک احتجاجی آواز ہے جو اردو کی تقدیر بدل دینے کی پہلی آواز اور ولی کو اردو تخلیق کا گوہر شاہ وار بنانے کی غیبی بشارت تھی۔ اردو پر شاہ صاحب کا یہ بڑا احسان ہے۔ اس کی دوسری بڑی اہم مثال پروفیسر آرنلڈ کی ہے جنھوں نے اقبال کو شاعری ترک نہ کر کے اسے جاری رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

اس ضمن میں ہم مرزا مظہر جان جاناں کے بھی مشکور ہیں کہ انھوں نے 'بہ موافق محاورۂ شاہ جہان آباد' کی تحریک چلائی اور اردو کو خود کفیل زبان کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ فارسی سے مانگی ہوئی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی۔ اردو کی مقبولیت میں متواتر اضافہ ہو رہا تھا۔ فارسی سے قطع تعلق کا ایک اور اعلانیہ شاہ مبارک آبرو کا وہ حکیمانہ قول ہے جو اشعار کی صوت میں معاصرین سے مخاطب ہوکر ان کی ہدایت کے لیے قلمبند کیا گیا تھا۔ ان کے قول نے معاصرین کے شعری رویے میں یکسر تبدیلی پیدا کی۔ اردو کا قواعد بھی مرتب ہو گیا۔ فارسی الفاظ سے ترکِ تعلق اشعار میں برتا جانے لگا۔ فارسی الفاظ کی مدد سے ایہام گوئی کی روایت کو ناپسند کیا گیا اور کل تیس برس میں لسانی اظہار سے اجتناب کیا گیا، شاہ مبارک آبرو اس عہد کے ذی احترام شاعر ہی نہیں، بزرگ استاد بھی تھے۔ ان کے زیرِ تربیت تلامذہ اور معاصرین کی کہکشاں آباد تھی۔ ان کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
ان سی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ظرف ہے
جو کی لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اس کے ریختے میں حرف ہے

فارسی کے فعل وحرف کو لغو کہنے کی جرأت بڑی بات تھی۔ ایک جمہوری مزاج کی تشکیل ہو رہی تھی۔ شاہ حاتم نے اس مزاج کو محسوس کیا اور ڈگر بدل دی۔ انھوں نے 'دیوان زادہ' کے مقدمے میں بڑے پتے کی بات قلم بند کی ہے:

'بندہ دریں امر بہ مطابقت جمہور مجبور است'

تقریباً اسی دور کا ناخوش گوار تاریخی واقعہ سامنے آ چکا تھا۔ خان آرزو (1687-1755) ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے، جو لغات ولسان پر عبقری نظر رکھتے تھے۔ وہ شاعر تھے اور فنِ شعر کے پارکھ بھی تھے۔ اسی زمانے میں ایران سے وارد شیخ علی حزیں نے ہندوستانیوں کی فارسی دانی پر بڑے اعتراض کیے۔ اہلِ ایران برصغیر کے فارسی شعرا کو سبکِ ہندی کہہ کر کم تر درجے کا فن قرار دے چکے تھے۔ شیخ علی حزیں کی لسانی عصبیت نے ادبی معرکہ آرائی کو جنم دیا۔ ہندوستانی حمیت سے معمور خاں آرزو نے محاذ سنبھالا اور شیخ علی حزیں کے روبرو معرکے میں شریک ہوئے۔ یہ بظاہر لسانی بحث تھی، مگر کسی نہ کسی حد تک مقامی باشندوں کی زبان دانی کو بھی آواز دی گئی تھی۔ اس نے شعوری طور پر حریفانہ کشاکش کی راہ پیدا کی۔ مغائرت کی نفسیات سے احتسابی نظر کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ شاکر ناجی نے تو مذاق اڑایا ہے کہ فارسی پڑھنا چاکری کی علامت ہے کیونکہ یہ زبان پڑھ کر سرکار کا نوکر یا زر خرید غلام ہی ہو سکتے ہیں۔

میں کیے ناجی ریختے میں سیم تن
گرچہ زر حاصل کرے ہیں یا پڑھ کر فارسی

فارسی شعریات میں غرق ہوئے ولی کو بھی فارسی زبان کے استحصال کی بھرپور آگہی ہے۔ اردو کو رشکِ فارسی دیکھنے کی آرزو دل میں اضطراب پیدا کر رہی تھی۔ مسئلہ انفرادی امتیاز کا نہیں لسانی آزادی اور مادری زبان کے اقرار و اعتراف کا تھا۔ بیرونی زبان جو حلقۂ گردن میں ساز دلبری بن کر ہراساں کر رہی تھی۔ اس طوق سے گلوخلاصی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو
رکھتے نہیں نظیر آپس کی سخن میں ہم

ولی کا یہ احساس احتجاج بن کر شعر میں ڈھل گیا ہے کہ انوری و خاقانی کو دل سے نکال پھینکو۔ اپنی زبان اور شاعری کو قدر دانی سے نوازنے کی ضرورت ہے۔ بغاوت کی یہ آواز اشرافیہ کے لیے بھی تھی اور عوام کے دل کی آواز بن کر ابھر چکی تھی۔ فارسی کو فراموش کرنے کی تاکید ولی کی ہے۔ دل سے اردو کو رشکِ فارسی بنانے کا پرزور مشورہ بھی۔

بسار دل سوں اپس کے تو یادِ خاقانی
ولی کوں دیکھ کہ اب رشک انوری یہ ہے

یہ صرف شعری اظہار نہیں ہے بلکہ فارسی کے خلاف احتجاجی آواز ہے۔ جو برق و رعد بن کر کڑکی۔ نظیری، بیدل، طالب وکلیم کی کہکشاں روشنی کو ماند کر گئی پھر سبکِ ہندی کا بھی کوئی فن کار مطلع شعر پر نمودار نہ ہو سکا۔ غالب واقبال تو سبکِ ہندی کے بھی سزاوار نہیں ٹھہرے۔ دونوں عظیم شعرا نے اپنا زیاں کیا اور اردو کو بھی محروم کیا۔ ہم بھی سبک سار ٹھہرے۔ ولی آفریں باد کے ہی نہیں خراجِ تحسین وعقیدت کے حق دار ہیں۔ ان کے تفاخر میں تعلی کے ساتھ دعوائے لسان بھی ہے۔

پیدا ہوا ہے جگ میں ولی صاحب سخن
میری طرف سیوں جا کے کہو انوری کے تئیں

ولی اپنے عہد کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ شاعر تھے اور آج بھی ان کی مقبولیت کم نہیں ہے۔ ان کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام کے جتنے قلمی نسخے دنیا کے ذخیروں میں موجود ہیں کسی اور شاعر کے نہیں۔ اب تک تقریباً 65 سے زائد خطی نسخوں کی بازیافت یا حوالے نشان زد کیے جا سکے ہیں۔ سب سے قدیم، اب تک کی دریافت کے مطابق، 1125ھ کا نسخہ ہے۔ راقم کی تحویل میں کئی نسخے ہیں، جن میں مکمل اور نامکمل بھی شامل ہیں۔ ان میں ایک نسخہ بہت اہم ہے جو 1150ھ اور 1155ھ کے درمیان رقم کیا گیا۔ یہ ولی کے دوسرے نسخوں سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کلام بھی زیادہ ہے اور اہتمام سے کتابت کی گئی ہے۔ قدیم تحریر کتابت اور خط شکستہ آمیز ہونے کی وجہ سے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔

■

Prof. Abdul Haque
2315, Hudsan Line
Kings Way Camp
Delhi - 110009

محمود شیخ

مشرق و مغرب کے ناقدانہ شعور پر ایک نظر

جب مہاتما بدھ کی چتا پوری طرح جل چکی تو دیو پتر نے وہاں جمع لاکھوں کے مجمع کو مخاطب کر کے کہا:

''اے بھائیو! دیکھو مقدس ہستی کا جسد خاکی جل کر راکھ ہو چکا ہے لیکن جس صداقت کا درس انھوں نے ہمیں دیا وہ ہمارے اذہان میں موجود ہے اور ہمیں غلط راستوں پر چلنے سے روکتا ہے۔''

(مہاتما بدھ کی حکایتیں، پال کاروس، ص 225)

صدیوں سے مشرقی ادبیات میں صحیح غلط، نیکی بدی، خیر وشر، حق و باطل کے موضوعات نثری اور شعری پیکر میں منتقل ہوتے رہے ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ سماجی اقدار حیات، مثبت نظریات فکر و فن پر قائم رہ سکیں۔ اتحاد و اتفاق اور عدل و انصاف کو جزو انسانیت بنا کر پیش کیا گیا ہے تاکہ دنیا میں امن و سلامتی کا ماحول برقرار رہ سکے۔ باربرین ایج (Barbarian Edge) میں حالانکہ انسان اور انسانیت کی کوئی قدر و قیمت متعین نہ تھی لیکن جب بھی کوئی ظالم و جابر حکمراں عالم انسانیت پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے جذب و احساس کی معروف و مستند قدروں سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج بھی دنیا میں ظلم و جبر قتل و غارت گری کو ناپسندیدہ نظروں سے اس لیے دیکھا جاتا ہے تاکہ عدل و انصاف کی فطری اور جذباتی سچائیوں کو سنگ دل اور ظالم افراد کی بے رحم اور حیوانیت زدہ ذہنیت و کردار سے محفوظ و مامون رکھا جا سکے۔ عدل و انصاف اور بے انصافی کے تصورات کیا ہوں گے؟ انھیں معصوم فطرت انسانوں کی رحم دل اور منکسر المزاج طبیعت نے قانون قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ کی بصیرت افروز نقد و نظر نے مرتب کیا ہے۔

مذہبی صحیفے عالم انسانیت کی مثبت قدروں کی تعمیر و توثیق میں ممد و معاون ہیں اور اسی بنیاد پر فکرِ انسانی کو سماجی رفعت و پرواز حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادبیات میں خیر انسانیت اور بے ثباتی دنیا کا تصور عام ہے۔ انسانی وجود محض عارضی ہے صرف اعمال اور قدرِ محبت کا آفاقی تصور ہی باقی رہتا ہے، جس نے مرد و زن اور کائنات کی ہر شے کے درمیان ایک رشتۂ جذباتی استوار کیا ہے۔ خیر و شر کے عائلی تصورات ہی اعمال میں اچھے برے کی تمیز پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ تمیز ختم کر دی جائے تو زبان و بیان کا غیر جذباتی اور میکانکی تصور ہی باقی رہ جاتا ہے۔ تہذیب و ثقافت اور جذبۂ انسانیت و خیر سگالی کے متعین کردہ فکری تصوراتِ زندگی مردہ ہو جاتے ہیں۔ دوستی، محبت اور رفاقت کے غیر اصولی اور تجارتی تصورات و عمل ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں انسان کا کوئی بھی تخلیقی عمل آفاقیت سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ شعر و ادب میں وہ تازگی اور توانائی باقی نہیں رہتی جسے عالم انسانیت کا اعجاز و افتخار قرار دیا جا سکتا ہے۔

21 ویں صدی کی شاعری، افسانہ اور ناول میں جذبہ و تاثیر کی کمی کا احساس ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ فنکار میں خیر وشر کی روایتی سمجھ ابھی باقی ہے لیکن اتنا کافی نہیں ہے کیونکہ دورِ جدید کے مسائل انسان کی مادی ضرورتوں اور خواہشاتِ نفسی کے پیدا کردہ ہیں جن کا کوئی حل تہذیب جدید کی زنبیل میں نہیں ہے۔ ترکِ خواہشاتِ نفسی کے تصورات کے بغیر ادب و فن میں جاذبیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ خیر وشر کے بیان میں نہ تو قوتِ اخلاق ہوتی ہے اور نہ ہی قاری کا ذہن اسے قبول کرنے کا اہل ہوتا ہے کیونکہ سیاسی اور معاشی فلسفہ نے انسانی ذہن و کردار کو نفسِ امارہ کا غلام بنا دیا ہے۔ تمام اعمال انسان کے ذاتی نفع و ضرر کی بنیاد پر طے کیے جاتے ہیں۔ فن کار کا فن اور قاری کا ذہن و کردار بھی اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ باوجود اس کے تاریخ کے ہر دور میں کچھ خدا رسیدہ نیک بندے حرمتِ فکر و فن کی شمع کو روشن رکھنے کی جدوجہد میں مصروفِ کار ہوتے ہیں لیکن آج ان تک پہنچنا بھی دشوار ہے۔ تخلیقی کمزوریوں کو جائز قرار دینے کے لیے بھی جواز پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ خیر وشر کا اخلاقی اور آفاقی تصور بھی آج سیاسی فلسفے کی نذر ہو گیا ہے۔

ادب وفن اگر ایک سیاسی آرگن ہے تو اس کا اخلاق تصورات سے کوئی واسطہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ موجودہ ادب وفن خیر وشر کے اخلاقی اور آفاقی تصور سے آزاد ہوتے ہیں۔ خواہشات نفسی اور مادّی ضرورتوں کا بیان ہی موجودہ ادب وفن کی خصوصیت ہے۔ سبب یہ کہ سیاسی معاشرہ، فطری معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ اسے سیاسی فلسفہ نے پیدا کیا ہے اور سیاست ایک طرزِ حکومت ہے، طرزِ حیات ومعاشرت نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فطری اور سیاسی طرزِ حیات کو مفید اور کارآمد بنانے کے لیے جدید سائنس وٹکنالوجی کا بہتر سے بہتر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن جب بھی کوئی سائنٹفک فلسفہ ضابطۂ اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے تو اس کا دائرۂ کار صرف خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل اور ترجمانی تک محدود ہوجاتا ہے، جس کی انسان کی فطری، جذباتی اور اخلاقی زندگی کے اجتماعی فکر وتدبر سے کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔ دنیا کا کوئی بھی فلسفی محض عقلی اور نقلی صداقتوں کی تعمیر وتوسیع پر اپنے خیالات کی بنیاد رکھتا ہے۔ انسان کے جذباتی اور فطری وجود کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

جین جیکس روسو (Jean Jacques Rovsseav 17.12.1778) کے مطابق انسان کی ترقی کا خیال عقل کی روشنی میں تلاش کرنا جس نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، زمین اور آسمان کو اپنے عمل کا میدان بنانا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے نفس کا پورے طور سے تجزیہ کرکے اپنی سیرت اور سرشت اپنے فرائض اور اپنے انجام کے راز معلوم کرنا حد درجہ دلکش خیال ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ افسوس ناک حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ جس قدر ہمارے علوم اور فنون میں کمال ہوتا گیا اسی درجہ اخلاق انسانی میں پستی آتی گئی۔ حقیقت کی تلاش میں انسان ہزاروں غلط باتیں مان لیتا ہے اور ان غلطیوں سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو حقیقت کے علم سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ حقیقت صرف نظری اور ذہنی ہوتی ہے لیکن اس کے راستے میں انسان جو ٹھوکریں کھاتا ہے ان کا سیرت اور اخلاق پر برا اثر ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک متمدن زندگی انسانی اخلاق کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔ دولت کی لالچ، ہر دل عزیزی کی خواہش، شہرت اور عزت کی طلب، دکھاوے کی خواہش اور سب سے زیادہ آرام طلبی انسان کے اخلاقی معیار کو بہت زیادہ گرا دیتی ہے۔ اس کے خیال میں قدیم مصر، یونان اور روما شروع میں اخلاقی اعتبار سے بہت اچھے تھے لیکن جب سے وہاں علوم وفنون کی ترقیاں شروع ہوئیں ان کی ساری خوبیاں رخصت ہوگئیں اور عیش پرستی اور آرام طلبی آخرکار ان کے زوال کا سبب بنیں۔

(تاریخ افکار سیاسی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ص 234)

روسو کے یہاں ذاتی خواہش (Actual Will) اور نیک خواہش (Real Will) کا تذکرہ بڑی وضاحت سے کیا گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے ذاتی خواہش ایسی خواہش ہے جب انسان اپنے ہی جذبات کے تابع ہوکر کوئی کام کرتا ہے۔ یہ خواہش سمجھداری سے پرے، خودغرضی، مفاد پرستی، کم ظرفی اور آپسی رنجش پیدا کرنے والی ہوتی ہے لیکن نیک خواہشات کے تحت انسان اپنے ذاتی فائدے اور نفع نقصان کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے اور وہ ایک مہذب، نیک اور پاکباز انسان ہوتا ہے۔ موجودہ نظام سیاست میں طاقتور ملکوں کے مفادات اور اکثریتی طبقات کی خواہشاتی نقد ونظر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حق وصداقت کا فطری اور جذباتی اقدارِ حیات کا اجتماعی اور اخلاقی تصور معدوم ہوا جس کا لازمی اثر فکر وفن کی عائلی، مثبت اور مستند صداقتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ دولت اور شہرت کی طلب نے رفعتِ پرواز کی تمام فطری صداقتوں کو تہہ دام کرلیا ہے۔ اس لیے ادب وفن کی کوئی جہت فطرت آشنا نہیں کہی جاسکتی۔

خیر وشر کے اخلاقی نظریات ہی انسانی تہذیب و تمدن کے ممد ومددگار رہے ہیں۔ زبان کا تمام تر استعاراتی اور اصطلاحی نظمِ بیان اسی ایک حقیقت پر منحصر ہے۔ اگر بیان میں صرف عینی اور مادّی حقیقت پسندی کا تصور ہی باقی رکھا جائے تو غیر بیانیہ کے سوا زبان میں کچھ بھی باقی نہ رہے گا اور انسان صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَایَرْجِعُوْنَ۔ کے مصداق بے زبانی کے کرب سے دوچار ہوگا۔ سائنس اور تجارت کی زبان میں فارمولے اور نظریات تو ہوتے ہیں جذبات واحساسات کی شفافیت اور گہرائی نہیں ہوتی۔ کتنا بڑا فلسفہ کیوں نہ ہو جذبہ کا ترجمان کبھی نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ہوا میں کاربن ڈائی آکسائڈ، آکسیجن اور ہائیڈروجن گیس نہاں ہوتی ہیں اسی طرح ادب میں سائنسی اختراعات کا بیان تو ممکن ہے لیکن ادب کبھی سائنسی نہیں ہوسکتا کیونکہ انسان کوئی سائنسی آرگن نہیں، مٹی کا پتلا ہے اور ترقی یافتہ سائنس بھی یہ بتانے سے قاصر ہے کہ مٹی کے خواص کیا ہیں؟ سائنس انسان کی مادّی ضرورتوں اور خواہشاتِ نفسی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان کی جذباتی اور احساساتی قوتوں کی ترجمان نہیں۔ خصوصاً انسان کی فطری شخصیت کا بیان اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ انسان محبت کیوں کرتا ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب سائنسدانوں کے پاس نہیں ہے۔ جنس زدہ نفسیاتی فلسفہ کے ذریعے محبت کا جواز تلاش کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ محبت ایک فطری جذبہ ہے جس کی کوئی تاویل نفسیاتی فلسفے کے ذریعے پیش کرنا محض کارِ عبث ہے۔

موجودہ شعر وادب میں جذبۂ خلوص ومحبت کا بیان کم ہوتا جارہا ہے۔ نثر نگار اور شعرا عام طور پر ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن میں فنکار کی نفسیاتی کشمکش اور عوام کی سیاسی جد وجہد اور ذہنی محرومیوں کا بیان سرفہرست ہوتا ہے۔ حالانکہ جدید افسانہ اور ناول میں مرد وزن کردار بھی ہوتے ہیں لیکن وہ کسی سحرزدہ روبوٹک (Robotic) زندگی کے اسیر نظر آتے ہیں ان میں زندگی کی وہ چمک نہیں ہوتی جو کسی انسان کو جہدِ مسلسل کی جانب مراجعت کے لیے مجبور کرسکے۔ وہ بس ایک امیبا (Emoeba) کی طرح ارتقائی عمل سے گزر کر زندگی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انفرادیت زدگی کا تصور اس قدر مضبوط ہے کہ فنکار کو اپنے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ حالات و واقعات کے بیان میں سچائی تو ہوتی ہے مگر وہ تخیل آمیزی نہیں ہوتی جس سے قصہ کہانی کی تاثراتی فضا ہموار ہوتی ہے۔ کبھی تو تخیل مادّی حقیقت کے نزدیک ہوکر بھی جذبہ کی پناہ تلاش کرتا ہے اور کبھی عقل کی پناہ میں ہوکر بھی اپنا وجود ثابت کرنے میں ناکام ہوتا ہے۔ استعارہ، تشبیہ، تمثیل، تلمیح، اشارہ، کنایہ زبان کا وصف ہی نہیں، توازن اور اعتدال بھی ہیں جن پر زبان وبیان کی عمارت قائم ہے۔ حقیقت پسندی کا نفسیاتی شعور اور صارفیت زدہ ذہن کی تاویلات عقلی زبان وبیان کا مزاج ومعیار قائم رکھنے میں ناکام ہیں۔ مابعد جدیدیت مباحث کا سقم یہی ہے۔

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے دانشور سیاسی تہذیب و ثقافت کو مستند ثابت کرنے کے لیے مختلف تھیوریز (Theories) اور مابعد جدیدیت مباحث کے ذریعے اپنی اپنی انفرادیت ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ تاریخ عالم کی مستند اور قابل قدر روایتوں کو کالعدم قرار دے کر ذہنِ انسانی کو مغربی طرزِ فکر کو اختیار کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ مغربی سائنس اور ٹکنالوجی کا علم ہم مشرقیوں کے لیے نہایت ضروری ہے لیکن فطرت، جذبہ اور اخلاق کی مرتب کردہ مثبت قدروں کی قیمت پر ہمیں سیاسی اور صارفیت زدہ تہذیب وثقافت کو قبول کرنے میں تامل ہوسکتا ہے کیونکہ دیارِ مغرب میں ہر اس اخلاقی نظریہ کو متروک قرار

دیا جاتا ہے جس نے ماضی میں بہترین تخلیقاتِ ادب و فن پیش کرنے میں معاونت کی ہے۔ یونانی فلاسفہ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے یہاں اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ سیاست کا تصور ملتا ہے لیکن آدمی کے اندر خود احتسابی کا تصور بیدار کرنے کا عمل مفقود ہے۔ کارل مارکس اصلاحِ معیشت پر زور دیتا ہے لیکن کوئی اخلاقی ضابطۂ حیات پیش کرنے میں ناکام ہی رہا۔ دراصل سیاسی نظریہ ساز اور مفکرینِ ادب و فن تخلیقی شعور کی فطری اور آفاقی سمجھ سے ناواقف ہوتے ہیں اور وہ اپنی کامیابی کے لیے نفس اور مادّہ کی عینیت زدہ ذہنیت کو تقویت دے کر ادبی تحریک برپا کرنے پر یقین رکھتے ہیں اور الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تشہیر کے ذریعے شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ تجردِ عقلی کا غیر اخلاقی شعور نقد ہی مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔

مشرقی ادبیات میں اصلاحِ معاشرہ اور آدمی کے کردار پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ بعض تخلیقاتِ ادب میں خاص طور پر داستان اور مثنویات میں اخلاقی امور کی تلاش کو کارِ عبث ہی کہا جائے گا لیکن فرد اور خیال کی اہمیت و افادیت کو ہمیشہ سے تخلیقی کردار کی عملی زندگی میں تلاش کیے جانے کا رجحان عام ہے۔ سبب یہ ہے کہ مشرقی قومیں فطری زندگی کی عملی صداقتوں پر یقین رکھتی ہیں۔ اگر وہ اخلاقی ضابطۂ حیات کو ترجیح نہ دیں تو ان کی تہذیبی اور مذہبی شناخت کو ٹھیس پہنچے گی اور بہترین تخالیقِ ادب کی انفرادیت و افادیت بھی باقی نہ رہے گی۔ اس لیے عملی کمزوریوں کے باوجود وہ فطرت، جذبہ اور اخلاق سے وابستہ رہنا ہی پسند کرتی ہیں لیکن موجودہ نظمِ سیاست نے تمام اخلاقی امور کو مادّہ اور نفس کا ترجمان بنا کر فرد اور معاشرے کو ایک ایسے شعورِ نقد و نظر سے آشنا کیا ہے جس کا سلسلہ صارفی سماج کی بے حس اور کاروباری ذہنیت پر تمام ہوتا ہے۔

بین الاقوامی معاشرہ فطری، جذباتی اور اخلاقی بنیادوں پر ہزاروں سال سے قائم و دائم ہے جسے سیاسی اور معاشی اقدارِ حیات کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ انسان کا صارفیت زدہ ذہن ہر شے کو ایک معروض کی شکل میں دیکھتا ہے۔ لوگ دولت و شہرت کی طلب میں کسی اصول و ضابطے کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ انسان کی اس ذہنیت نے صارفی سماج کو وسعت دے کر عالمِ انسانیت کے سامنے فطری سماج کی عطا کردہ مثبت قدروں کی بقا اور تحفظ کا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ لوگوں میں قول اور فعل کا تضاد عام بات ہے۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہی نہیں نظم و نسق قائم رکھنے والے ادارے بھی سیاسی طور پر طاقتور افراد کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں، جس نے عدل و انصاف کے فطری تصورات و عمل کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی اخلاق میں امن و اعتدال کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ جرم کرتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ احتسابِ عمل کا تصور بھی اب باقی نہیں رہا۔ ان حالات میں صالح فطرت انسان کو تلاش کرنا بھی مشکل ہے۔ لہٰذا ادب و فن کی تمام جہتیں ایسے افراد کی متقاضی ہیں جو فطرت، جذبہ اور اخلاق کی متعین کردہ قدروں، اصول اور ضابطوں پر یقین رکھتے ہوں۔ ان کا مقصد دولت و شہرت اور اپنی انفرادیت ثابت کرنا نہ ہو۔ حالانکہ عوامی زندگی فطری اور جذباتی قدروں پر منحصر ہوتی ہے لیکن سیاسی اور صارفی سماج کے پروردہ افراد کا جذباتی کردار تسلی بخش نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا ایک سیاسی وژن رکھتے ہیں مگر فطری وجودیت سے ان کی وابستگی محض واجبی ہوتی ہے اور وہ مادّی آسودگی کے حصول میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں۔ لہٰذا انھیں مغربی افکار و نظریات میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آتی ہے۔ مشرقی تہذیب و ثقافت کی عطا کردہ مثبت قدروں پر محاسبہ قائم کیا جاتا ہے اور مغربی دانشوروں کے پیش کردہ ادبی نظریات ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

ناول اور افسانے کی ہیئت و موضوعات مختص نہیں ہیں اور نہ اسلوب و بیان کا کوئی طریقۂ اظہار ہی مخصوص ہے۔ ناول اور افسانہ نگار اپنے خیالات کو اپنی ہی شخصیت کا آئینہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تخیلاتِ فن پر عقلی محاکات کی فراوانی قصہ کہانی کی تمثیلاتی فضا کو ہموار ہونے ہی نہیں دیتی۔ غیر مرئی قوتوں کا بیان عینیت پسند خیالات کا متحمل نہ ہونے کے سبب معدوم ہو گیا ہے لیکن قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی اور تلمیح کے موضوعات مختص ہوتے ہیں۔ قصیدہ مدح سرائی، غزل عاشق و معشوق، مثنوی قصہ کہانی، رباعی پند و نصائح اور تلمیح تاریخی موضوعات کے لیے، حمد، نعت، مرثیہ، منقبت اور دیگر اصنافِ سخن کے موضوعات بھی متعین ہیں۔ تنقیدِ فن کے لیے مشرقی ادبیات میں زبان کے استعمال، اصطلاحی اسلوب و بیان اور خیال کی انفرادیت کے علاوہ بحر اور وزن کی خصوصیات پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ تنقید کی یہ روایت آج تک برقرار ہے۔ ندرتِ بیانی کے ذریعے مفہوم کو دو آتشہ بنانے کی روایت بھی صدیوں پرانی ہے۔ چونکہ شعرا فطری جذبہ و اخلاق کے قائل تھے اس لیے ان کے کلام میں 'وحدۃ الوجود' نظریے کا اثر کافی گہرا تھا۔ مشرقی تہذیب و ثقافت کی مثبت قدریں ذہنِ انسانی مہمیز کرتی تھیں۔ حقیقت و مجاز کے بیان میں متصوفانہ اصطلاحات نے جذب و احساس کی ایک ایسی غیر مرئی دنیا آباد کی تھی جس کا ایک تفکراتی کنارہ آفاقیت سے ہمکنار ہوتا تھا۔ مادّیاتی نقد و نظر کی وہ قدر و منزلت بھی نہیں تھی جو آج ہے۔

بعض اردو دانشوروں کو اردو ادب میں تنقید کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ سائنسی، مارکسی اور نفسیاتی تنقید کے بھی دبستانِ ادب بیسویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ورنہ اس سے قبل مغربی ادبیات میں بھی تنقید کا وجود، معشوق کی موہوم کمر، سے زیادہ نہیں تھا۔ مشرقی فلسفہ کا وجود غیر مادّی حقائق کا ترجمان ہے۔ اس لیے تنقید کا مغربی شعور بھی ناپید ہے۔

غیر مذہبی قوموں میں فلسفہ کا وجود مادّیاتی نقد و نظر کا ترجمان ہوتا ہے۔ اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والی قوموں میں فطری، جذباتی اور اخلاقی امور پر غور و فکر کا رجحان تو پایا جاتا ہے لیکن نفسی اور مادّی اہمیت و افادیت پر 'کُلُّ مَنْ عَلَیھا فَان' کی صداقت پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔ موجودہ دور میں فطرت و فن کی ایمائی قوتوں پر چونکہ مادّہ اور نفس کی حکمرانی ہے اس لیے تمام علوم و فنون ذہنی آلودگی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جس میں فن موسیقی، مصوری اور ادب بھی شامل ہیں۔

مذہب کا یقین اور سائنس و فلسفہ کی بے یقینی کے درمیان زمین اور آسمان کا بعد ہے۔ مذہب فطری، جذباتی اور اخلاقی طرزِ حیات کا محافظ ہے لیکن سائنس اور فلسفہ انسان اور اشیا کے نفسی وجود کا قائل ہے۔ مذہب دنیا کی آسائش و آرائش کو فانی سمجھتا ہے۔ فلسفہ اور سائنس خواہشاتِ نفسی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مذہب مرنے کے بعد کی زندگی کو بہتر بنانے پر زور دیتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ حاضر و موجود پر یقین رکھتے ہیں۔ مذہب اور سائنس دونوں کی تاویلاتِ عقلی کا معیار جداگانہ نوعیت کا ہے۔ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مطابق 'عقل روحِ علوی کا جوہر ہے' لیکن فلسفہ اور سائنس روحِ علوی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں مذہب اور سائنس میں اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ دوسری طرف سائنس اور فلسفہ نے اپنا وجود برقرار رکھنے اور مذہبی اقدارِ حیات کو مسترد کرنے کے لیے فطری، جذباتی اور اخلاقی ضوابط کو کالعدم قرار دے کر خواہشاتِ نفسانی سے آراستہ زندگی کے ہزاروں مظاہر پیدا کر دیے ہیں اور انسان کسی پروانے کی طرح ان کے اطراف طواف کرتا ہے۔ سائنسی تحقیقات، اختراعات و ایجادات عالمِ انسانیت کے لیے

نہایت ضروری ہیں لیکن فلسفہ فطری اور جذباتی زندگی کا ناقد بھی ہے جس نے اپنی بقا کے لیے اپنے ہی اخلاق ضابطے پیدا کیے ہیں جن کا فطرت انسانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بجز خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کے۔

معاشرہ مختلف الخیال لوگوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے مذاہب جدا ہوتے ہیں۔ ان کی زبان اور زندگی کرنے کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ طرز معاشرت، تہذیب و ثقافت میں بھی اختلاف ہوتا ہے لیکن اقوام مشرق میں کئی خوبیاں مشترک بھی ہوتی ہیں مثلاً گناہ و ثواب کا تصور ان میں پایا جاتا ہے۔ زندگی بعد الموت پر انھیں یقین ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی فلسفی اور فنکار خیر و شر کے الوہی تصورات پر یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے ان میں مادّی اور نظریاتی ڈسپلن (Discipline) تو ہوتا ہے مگر اخلاقی ضابطۂ حیات کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوتی جو ہم مشرقیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ دیارِ مشرق کی نابغۂ روزگار شخصیتوں نے فطری، جذباتی اور اخلاق زندگی کی تعمیر میں اپنی تمام تر فکری اور نظریاتی توانائی صرف کی ہے اور تہذیب و تمدن کو خیر و شر کے الوہی تصورات کے ذریعے مزین کیا ہے۔ عدل و انصاف، غلط صحیح، نیک و بد اعمال کی تشخیص میں اپنی زندگیاں وقف کردیں اور حکومت سماج، خاندان اور فرد کو ایک مثبت ضابطۂ حیات کی پابندی کے لیے اخلاقی اور احتسابی طور پر مجبور کیا تھا۔ عدل و انصاف کے تصورات اسی ضابطۂ اخلاق کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں۔ اطالوی فلسفی سسرو (Cicero) کے مطابق انسان مملکت کے ان ہی قوانین کی اطاعت کرتا ہے جو قانونِ قدرت کے اصول اور ضابطوں کے مطابق ہوں۔' حقیقت بھی یہی ہے کہ کائنات کی ہر شے اور تمام دنیا کے انسان ایک فطری ضابطۂ حیات کے پابند ہیں جنھیں قدم قدم پر سیاسی تہذیب و ثقافت کے عطا کردہ غیر فطری نظریۂ حیات سے مصالحت کرنا پڑتی ہے۔ جس نے نقد و نظر کے مشرقی تصوراتِ ادب کی ایمائیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ تخلیقی ادب میں بھی اس کے اثرات در آئے ہیں۔ ناول، افسانہ اور شعر کی اس کمزوری نے فن کو اس کی آفاقیت سے محروم کردیا ہے۔

مذہب اور تہذیب کی بنیادیں دو مختلف و متضاد کیفیات و عمل پر منحصر ہیں لیکن مذہبی تعلیمات، تہذیبی عناصرِ فکر کے فطری در و بست میں معاون ہوتی ہیں۔ خاص طور پر قدرتی انصاف (Natural Justice) کے قوانین کو مثبت اور تعمیری خطوط پر منضبط کرنے میں مذہب نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مرد و زن کے جنسی رشتے کی استواری میں نکاح کو لازمی قرار دے کر انسانی رشتوں کی طہارت و پاکیزگی کو برقرار رکھنے پر خصوصی ضابطۂ حیات ترتیب دیا گیا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر عزیز و اقارب کے مراتب اور حقوق طے کیے گئے ہیں۔ مال و منال اور زمین جائیداد کی تقسیم میں اصول و ضابطوں کا تعین کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطری تہذیب و ثقافت کے مرتب کردہ آئین اور ڈکشن میں تشکیک، وسوسہ اور انتشار کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ 'یقین' ہی غور و فکر اور طرزِ عمل کا ماحصل ہے۔ جس نے انسانی کردار کی تعمیر اور تہذیب و ثقافت کی آبیاری میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مذہبی عبادات کی ادائیگی میں بھی 'یقین' ہی کو مرکزیت حاصل ہے۔ اگر اس یقین کو ختم کردیا جائے تو تمام مذاہب سیاسی اصول و ضابطوں کے حلیف بن جاتے ہیں اور فکری تاب و توانائی ختم ہوجاتی ہے۔ حیات و معاشرت کی فطری اور مثبت قدریں معدوم ہوجاتی ہیں۔ دل و انصاف اور نیچرل جسٹس کا تصور موقوف ہوجاتا ہے۔

مابعد جدید ادب میں بے کردار آدمی کا سیاسی شعور ہی اسے ظلم و جبر و استحصال کے خلاف نبرد آزمائی کا حوصلہ دیتا ہے۔ جس میں حرکت و عمل کی توانائی اور تازگی خود اس کی اپنی ہی مفاد پرست ذہنیت کی نذر ہوجاتی ہے اور اس پر محاسبہ قائم کرنا آسان ہوتا ہے۔ عدل و انصاف کا فطری تصور متخرب ذہن افراد کے ذاتی مفادات کا ترجمان ہوجاتا ہے اور خیال، نظریے اور فکری احساسات میں وہ توانائی بھی باقی نہیں رہتی جس نے انسانی کردار کو مضبوط و مستحکم اخلاقی بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ ان ہی وجوہات سے موجودہ دور میں ادب و فن کی جذباتی اور تاثراتی فضا ہموار نہیں ہوپاتی۔ تمام دنیا میں ادب و فن کا قحط پڑ گیا ہے لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہزار تغیرات زمانہ کے باوجود نہ صرف اردو بلکہ تمام مشرقی زبانوں کے ادب میں فطری وژن کسی نہ کسی حد تک برقرار رہے۔

ذہنی انتشار اور خلفشار کا بیان افسانہ، ناول اور شعر میں جزوی طور پر شامل تو کیا جاسکتا ہے۔ فنکار کی ذہنی اور ذاتی الجھنوں کی شمولیت بھی ممکن ہے لیکن اسے تخلیق کا کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سماجی معاملات کی پیشکش میں بھی ضروری نہیں کہ شاعر اور ادیب کے تجزیاتی نقد و نظر کو درست ہی قرار دیا جائے۔ فنکار، ناقد اور قاری سب کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے لیکن امیر ہو یا غریب جذبۂ الفت و محبت کی تاثیر تمام انسانوں میں مشترک ہوتی ہے۔ دنیا کی بھی مائیں صرف، ماں، ہی ہوتی ہیں۔ زمانے میں ایک محبت کے سوا تمام دکھ انسان کے پیدا کردہ ہیں۔ سیاست و معیشت کی پروردہ سوسائٹی میں سیاست و معیشت نے اتنے دکھ جمع کردیے ہیں جن کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔

انتشار نقد و نظر سے فنکار، ناقد اور قارئین کا محفوظ رہنا محال ہے۔ سبب یہ کہ تخیلاتی دنیا بے حد وسیع ہے۔ ایک ہی خیال مختلف سیاق و سباق میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ فنکار کبھی تو اسے نظر انداز کردیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسرے مفہوم میں اسے دوبارہ رقم کرلیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخیل کی وسعت اور جذبے کی گہرائی کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ الفاظ کا ذخیرہ چونکہ محدود ہوتا ہے اس لیے بیان میں پیچیدگی اور دہراؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھی ناقدینِ ادب بھی خیال کی اہمیت کو واضح کرنے اور قارئین کو متوجہ کرنے کے لیے کسی خیال یا نظریے کو بار بار دہراتے ہیں۔ اس طرح تخلیقی اختلاف کا پیدا ہونا بھی ایک لاشعوری عمل ہے۔ کوئی بھی خیال اپنی ترسیل و تفہیم کے لیے ایسے الفاظ منتخب کرتا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہوسکے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ناقد اور قاری اس سے مطمئن ہوں۔ اختلاف میں خیال کی دو مختلف صورتیں واضح ہوتی ہیں مگر دونوں ہی اپنے سیاق و سباق میں درست ہوسکتی ہیں۔ وجہ یہ کہ فنکار اور قارئین دونوں ہی اپنا ایک مخصوص وژن رکھتے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ سیاسی معاشرہ یا پھر فطری اور غیر ترقی یافتہ سیاسی معاشرہ سے ان کی وابستگی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی نفسی اور مادّی اور کبھی فطری اور جذباتی اصولِ زندگی کی جانب مراجعت کرتے ہیں۔ یقین اور وسوسہ کے درمیان یہ سفر حالانکہ روزِ اوّل سے جاری ہے لیکن دورِ جدید کے علمی اور سیاسی معاشرے کا اختصاص بھی یہی ہے جس کا ایک نمونہ عصرِ حاضر کے شعرا کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالانکہ غزلیہ اشعار میں اب وہ عاشق و معشوق کا بیان مفقود ہوگیا ہے لیکن کسی کسی غزل میں ایک دو شعر روایتی فکر و شعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ناول اور افسانہ کے اسلوب و بیان میں بھی اب کہاوتیں اور ضرب المثل کا گزر کم ہوگیا ہے۔ سادہ اور شفاف نثر نے بیان کی فطری اور جذباتی سمجھ پر نفسیاتی شعور کو ترجیح دے کر ذہن انسانی کو مادّیاتی اور سیاسی حقیقت پسندی کا ترجمان بنادیا ہے۔ قصہ کہانی کی رمزیت اور تخیلاتی محاکات کی فراوانی واقعات کے بیان میں نہ جانے کہاں گم ہوگئی ہے۔

■

Dr. Mehmood Shaikh
592, Naya Mohalla
Mirza Ghalib Marg
Jabalpur - 482002 (MP)
Mob.:9300353584

میر کی شاعرانہ عظمت

مسعود جامی

میر کا انتقال 20 ستمبر 1810 کو لکھنؤ میں ہوا۔ یوں تو ان کو اس جہانِ فانی سے گزرے 200 برس سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے تاہم اردو شاعری میں ان کی عظمت کا اعتراف آج بھی کیا جاتا ہے۔ میر تقی میر، میر تخلص، آگرہ میں 1723 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا، لیکن علی متقی کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ زیادہ تر گریہ و استغراق اور کیفِ جذبی میں گم رہتے تھے۔ میر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی۔

میر ابھی نو ہی برس کے تھے کہ ان کے اتالیق سید امان اللہ چل بسے، ان کے بعد ان کے والد نے تعلیم و تربیت شروع کی مگر چند ہی ماہ بعد ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ یہاں سے میر کی زندگی میں رنج والم کے طویل باب کی ابتدا ہوئی۔ والد کی وفات کے بعد میر دلی چلے گئے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ وہیں گزارا اور کئی بار اپنی آنکھوں سے اس شہر کو اجڑتے دیکھا۔ انھوں نے حالات اور واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے ایسے شاہکار تخلیق کیے جو نہ صرف اردو زبان کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث بنے بلکہ خدائے سخن میر تقی میر کا نام بھی صدیوں کے لیے زندہ جاوید ہوگیا۔ میر نے دلی کے اجڑنے کی المناک داستان کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر تقی میر ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغل مرکز کمزور پڑ چکا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے صوبے خودمختار ہو چکے تھے۔ پورا ملک لوٹ مار کا شکار تھا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن حملے کرتے اور عوام و خواص کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے۔ لوگ بھوکے مرنے لگے اور دولت لٹنے سے اقتصادی بدحالی کا دور شروع ہوا۔ میر اپنے اس دور کے احساسِ زوال اور انسانی الم کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری اس تمام شکست و ریخت کے خلاف غیر منظم احتجاج ہے۔ میر کے تصورِ غم کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں ''میر کا سب سے بڑا مضمون شاعری ان کا غم ہے۔ غم والم کو میر کی شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ غم میر کا ذاتی غم ہے اور یہی انسان کی ازلی اور ابدی تقدیر کا غم بھی تھا۔ یہ سارے غم میر کی شاعری میں جمع ہوگئے ہیں۔ بہ قول میر،

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
چشم رہتی ہے اب پرآب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت
مستقل روتے رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو اشک تو اور آگ لگا دیتے ہیں

بابائے اردو مولوی عبدالحق میر کے بارے میں لکھتے ہیں ''ان کا ہر شعر ایک آنسو اور ہر مصرع خون کی ایک بوند ہے۔''

ایک اور جگہ کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

''انھوں نے سوز کے ساتھ جو نغمہ چھیڑا ہے، اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔''

میر کا تصورِ غم تخیلی اور فکری ہے، یہ قنوطیت پیدا نہیں کرتا۔ مجنوں گورکھپوری، میر کے تصوراتِ غم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میر نے غمِ عشق اور اس کے ساتھ غمِ زندگی کو ہمارے لیے راحت بنا دیا ہے۔ وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔ میر کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے جذبات و خیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہتے ہیں۔''

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے
خونابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

میر کا دور شدید ابتری کا دور تھا۔ انسانی خون کی ارزانی، دنیا کی بے ثباتی اور ہمہ گیر انسانی تباہی نے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔ میر اس تباہی کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ وہ

خود اس تباہ حال معاشرہ کے ایک رکن تھے، جو صدیوں کے لگے بندھے نظام کی بربادی سے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گیا تھا اور اب اس کو جوڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ میر نے اس ماحول کے اثرات شدت سے محسوس کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس تباہی کے نقوش ملتے ہیں۔ لٹے ہوئے نگروں، شہروں اور اجڑی ہوئی بستیوں کے حالات، بجھے ہوئے دلوں کی تصویریں، زمانے کے گرد و غبار کی دھندلاہٹیں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں میر کے ہاں موجود ہیں۔

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس غم و الم کے عالم کے باوجود میر کی شاعری میں بلند حوصلگی بھی ہے۔ وہ سپاہیانہ دم خم رکھتے ہیں، فوجی ساز و سامان کے استعاروں میں مطلب ادا کر کے زندگی کا ایسا احساس دلاتے ہیں، جس میں بزدلی بہرحال عیب ہے۔ وہ رویہ جسے اہل تذکرہ بے دماغی یا بددماغی کہتے ہیں، دراصل وہ احتجاجی روش ہے، جو ہر سپاہ کا شیوہ ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''میر کو زندگی سے بیزار شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا غم بعد میں آنے والے شاعر، فانی کے غم سے مختلف ہے، جس کی تان ہمیشہ موت پر ٹوٹتی ہے۔ ان کا غم سودا سے بھی مختلف ہے۔'' میر کہتے ہیں:

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا
بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

....

حوصلہ شرطِ عشق ہے ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

میر نے فنی خلوص کو پوری صداقت سے استعمال کیا ہے۔ فنی خلوص سے یہ مراد ہے کہ شاعر زندگی کے واقعات کو جس طرح دیکھتا ہے، اسی طرح بیان کرے۔ میر کا انداز اسی لیے مقبول ہے کہ اس میں صداقت اور خلوص اور تمام باتیں بے تکلفی کے انداز میں کہی گئی ہیں۔ میر نے خیال بند شاعروں کی سی معنی آفرینی سے کام نہیں لیا۔ محض تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر عوام کا شاعر ہے۔ اس کے آس پاس کی زندگی سے درد و غم کے مضامین کے چشمے ابل رہے تھے۔ میر نے انہی مضامین کو سادہ الفاظ میں بے تکلف انداز میں پیش کیا۔ میر کے خلوص و صداقت کا اندازہ ان کے اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مرگئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

میر نے اپنے شیوۂ گفتار کو زیادہ موثر اور دلکش بنانے کے لیے تشبیہ و استعارے کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ یہ تشبیہات مردہ نہیں بلکہ ان کے اندر زندگی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے خالق کے خون میں گرمی اور حرارت ہے اور وہ پوری صداقت اور پورے فنی خلوص سے اپنی زندگی بھر کے تجربات و تاثرات کو ان تشبیہات و استعارات کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ ان میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ، مفلس کا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر کی شاعری کے فکری عناصر میں متصوفانہ رنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ میر کے والد صوفیانہ مزاج کے مالک تھے اور رات دن جذب و مستی کی کیفیات میں سرشار رہتے تھے۔ پھر میر بھلا کس طرح صوفیانہ تجربہ سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں تصوف کا تجربہ محض روایتی نہیں، یہ رسمی بھی نہیں، اس تجربے نے میر کے ذہن و فکر کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ وہ زندگی کو کسی عام انسان کی طرح نہیں دیکھتے، ان کی نظر صاف دل صوفی کی نظر ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

میر کو اس جہان فانی سے گزرے دو سو برس سے زیادہ عرصہ بیت چکا تاہم ان کی عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا جاتا رہے گا۔ بقول میر

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

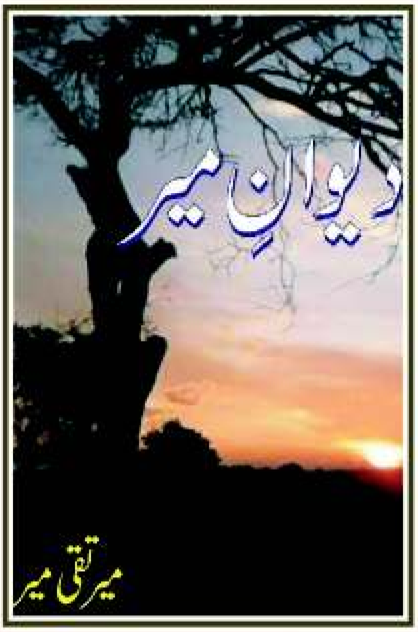

میر کی غزلوں کے 6 ضخیم دیوان ہزاروں اشعار پر مشتمل ہیں۔ مثنوی، مسدس، مخمس، رباعیات اور قطعات کے نمونے بھی وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ میر ایک ایسے شاعر تھے، جن کے فن کی ہر عہد پر غالب شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب سمیت کئی اساتذہ نے داد دی، بقول غالب

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

آخر میں استاد ابراہیم ذوق کا شعر پیش خدمت ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
یوں تو یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر اپنے کمال سے خود واقف تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میر ایک باکمال شاعر تھے۔ اپنے لیے میر نے فرمانے کا لفظ استعمال کیا۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں کہ یہ صرف میر کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے فرمانے کا لفظ استعمال کریں۔ میر کے اشعار میں ایسا درد اور سوز و گداز ہے کہ جس سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ چلتے چلتے چند اشعار جنھیں بھلانا ممکن نہ ہوگا سنتے جائیے

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
کہتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

■

Dr. Masood Jami
Jami Enclave, C-1 Jamia Nagar
Ranchi (Jharkhand)
Mob.:09504969822

شگفتہ یاسمین

پس نوآبادیاتی مطالعات

(ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے حوالے سے)

عالمی مسائل میں استعماری رنوآبادیاتی نظام حیات کی تشکیل و تعبیر بھی مطالعے کا ایک اہم موضوع ہے۔ نوآبادیاتی نظام حاکم و محکوم، فاتح و مفتوح قوم کی اس صورت حال کا نام ہے جس میں حاکم طبقہ محکوم قوم کو اپنا غیر تصور کرتے ہوئے اس سے اس طرح معاملہ کرتا ہے جس میں وہ خود کو بہتر و برتر اور محکوم قوم کو حقیر و کم تر سمجھتا ہے۔ یہ نوآبادکار رحاکم طبقہ اپنے محکوم طبقہ کے طرز حیات کو بے معنی قرار دیتے ہوئے اپنی مقتدرہ حیثیت کی بنا پر اپنے تصور حیات کو اعلیٰ، افضل اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ نوآبادیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے مظہر مہدی لکھتے ہیں:

''نوآبادیات حاکم اور محکوم کے قدیم اور روایتی رشتے کے برعکس اس نئے رشتے کا نام ہے جو کوئی غیر ملکی حکمراں طبقہ ایسے لوگوں کے ساتھ قائم کرتا ہے جو اس کے نزدیک کسی ملکی یا طبقاتی امتیاز کے حامل نہیں ہوتے۔ اس رشتے کی رو سے یہ محکوم آبادی نوآبادی کہلاتی ہے اور یہ حکمراں طبقہ پوری محکوم نوآبادی کا استحصال کرتا ہے اور وہاں کی معیشت اور معاشرے کو اپنے ملک (ہندوستان کے معاملے میں برطانیہ) کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد کے حصول کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔''[1]

ہندوستان میں استعماریت کو ممکن اور مستحکم بنانے کے لیے استعمار کاروں نے جو تدابیر اور حکمت عملیاں اختیار کیں، انھوں اس نے ہندوستانی قوم کے مختلف شعبہ حیات پر گہرے اثرات قائم کیے۔ انھوں نے اس تصور حیات کو فروغ دینے کے لیے مقامی افراد کی شناخت کو مٹانے یا منقلب کرنے، ان کے علوم، زبان، ادب، تہذیب، ثقافت، معاشرت، مذہب و عقائد کے بارے میں مصنوعی تصورات عام کیے جس سے نہ صرف اس قوم کے تابناک ماضی اور علمی و ادبی سرمائے کو مٹانے کی کوشش کی گئی بلکہ انھیں قابل اصلاح قرار دیتے ہوئے نئے پیمانوں کے مطابق اپنا محاسبہ کرنے کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں اصلاح پسند طبقے نے مغرب کو معیار قرار دیتے ہوئے علوم و ادب، تہذیب و ثقافت، مذہب و عقائد کی نئی نئی تعبیریں بیان کیں۔

استعمار کے نزدیک ہندوستانی قوم کے علوم، افکار، تہذیب، معاشرت اور ادب ہر شعبے میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ جس کا وسیلہ انھوں نے انگریزی تعلیم کو قرار دیا۔ گویا یہ نئی تعلیم وہ بنیادی محرک تھی۔ جس کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرت، مذہب اور اخلاق کی اصلاح کی جانی تھی، اور یہی اصلاح ان کی ترقی کی راہ ہموار کرنے والی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے ذریعے نہ صرف فکری، تہذیبی اور تعلیمی سطح پر تبدیلی آئی بلکہ ہندوستانیوں کو اپنے تحفظ و ارتقاء کے لیے سامراجی نظام کی پیروی کرنا ضروری ہو گیا۔ پرسیول اسپئیر کا خیال ہے کہ:

دربار مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی معاشرے میں تعلیم کا مطلب انگریزی زبان سے معمولی واقفیت حاصل کرلینا اور تہذیب کا مطلب مغربی طرز زندگی کی کورانہ تقلید ہو کر (رہ) گیا تھا۔''[2]

یہ امر پیش نظر رہے کہ استعماریت کے استحکام اور نوآبادیاتی معاشرے کی تقلیب میں سب سے موثر حربہ تعلیم و تربیت کا تھا۔ ہندوستان میں اس نظام کے مطابق جو نصاب تیار کیا گیا وہ برطانوی سامراج سے مرعوبیت اور اثر انگیزی کا نتیجہ ہے۔ مشرقی علوم کے مقابل علوم عقلیہ کی تحصیل پر زور دیا گیا کیوں کہ اب یہی علوم انسانی کی ترقی (مادّی ترقی) اور اس کی معاشی کفالت کا ذریعہ تھے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین اس اقدام کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عقلیت اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ذہنوں کو اگر بدلتی ہوئی دنیا کا احساس نہ دلایا گیا اور انھیں زندگی کے مطالبات و نئے حقائق سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو قوم زندگی کے اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گی گویا نظام حیات کی اس نئی بساط پر تعمیر و ترقی کے لیے اس کے اصول و معیار پر پورا اترنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جدید افکار و اقدار کے لیے ہمیں اپنے اصولوں سے مفاہمت کرنی پڑی۔ خارجی و مادی راحتوں کی خاطر اپنے مسلک زندگی و نشان راہ سے ہٹنا پڑا اور اس طرح بالآخر ہمارا معنوی وجود خطرے میں پڑ گیا۔''[3]

برصغیر کے مصلحین میں برطانوی استعمار سے مرعوب حلقے نے اس کا گہرا اثر قبول کیا۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام میں آقا اور غلام کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے مغربی طرز حیات سے مناسبت کو ناگزیر

قرار دیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کار نے مغربی خطوط کی روشنی میں ادب وعلوم میں اصلاح کی تحریک شروع کی۔ انھوں نے مشرقی نظم حیات کے مقابل مغربی طرز فکر کی برتری کو تسلیم کرلیا تھا اور یہ نقطۂ نظر کی ایسی تبدیلی تھی جس نے مشرقی نظام تعلیم، تہذیب اور ادب کے ہر شعبہ کے روایتی اوصاف و امتیازات کو بے اعتبار کردیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے ہندوستانی نظم حیات کی تشکیل نو کا کام انجام دیا۔ انھوں نے اپنی تعلیم، تہذیب، مذہب، معاشرت اور ادب میں ایک مصالحتی رخ اختیار کیا۔ اور مشرق کے ادبی تصورات کو غیر معیاری قرار دیتے ہوئے کلیتًا مغرب کے ادبی تصورات کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ محمد حسن عسکری اپنے مضمون 'پیروی مغرب کا انجام' میں مغرب سے اخذ و استفادے کی صورت حال کے متعلق حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جو چیز ایک ادب کو دوسرے ادب سے الگ کرتی ہے وہ طرز احساس کا فرق ہے۔ لیکن حالی کے زمانے میں لوگوں نے پیروی مغرب کے معنی یہ سمجھے کہ چڑیوں اور پھولوں پر نظمیں لکھی جائیں کیونکہ مسٹر ورڈز ورتھ بھی یہی کرتے تھے۔ یا پھر شاعری کے ذریعے لوگوں کا اخلاق درست کیا جائے کیونکہ یہ میکالے نے کہا ہے.... غرض حالی کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارے یہاں پیروی مغرب اس طرح ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے ادب سے ہر قسم کے معیار بالکل ہی غائب ہو گئے۔ ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ تھا وہ بھی گنوا بیٹھے ہیں.... پیروی مغرب کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے تھے اور یہ کہ ہم مغرب کا طرز احساس قبول کرلیں۔ لیکن ہم نے تھوڑی دیر کے لیے رک کے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہمارا طرز احساس کیسا تھا اور اس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں۔''[4]

شعر و ادب کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ نظر رہے کہ استعماری نظام نے اپنی سیاسی ضرورتوں کے تحت مشرقی ادب کے تصورات متعین کیے اور ہمارے ادب کی شعریات کو رد کرکے مغربی ادب کو مفید و توانا قرار دیا۔ مغرب کے اصول نقد کو معتبر اور آفاقی قرار دیتے ہوئے مشرقی ادب کی نئی نئی تعبیریں بیان کی گئیں۔ اس سے ان کا ایک مقصد جہاں ہندوستانی ادب و ثقافت کو مسترد کرکے اپنے ادب و ثقافت کو بہتر و برتر ثابت کرنا تھا وہیں ان کا ایک بڑا مقصد ہندوستانیوں کی ذہنی و اختراعی قوت کو سلب کرکے اپنا پابند بنانا تھا۔ لہٰذا مشرقی شعر و ادب کو بیہودہ، لغو اور مخرب اخلاق قرار دیا اور اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدلنے کے لیے انھوں نے ادب کے افادی پہلو پر زور دیا اور شاعری و نثر میں حقیقت کی ترجمانی پر اصرار کیا کیونکہ ان کی ضرورت کی مناسبت سے مغرب میں ادب کا یہی تصور ہے۔

مغرب پرستی میں اردو شعر و ادب کی تفہیم و تعبیر کا واحد طریقہ مغربی اصولوں کو سمجھا گیا اور مشرقی ادبی و تہذیبی روایات کو ناقص اور غیر معیاری قرار دیا گیا۔ مغرب سے استفادہ کا یہ رجحان اردو زبان و ادب کے لیے کس حد تک کارآمد تھے اس پر سوالیہ نشان لگایا گیا ایک حلقہ صاف صاف کہنے لگا ہے کہ جزوی خصوصیات کے اخذ و استفادہ تک تو کوئی حرج نہیں لیکن ادب کا بنیادی تصور ہر زبان کے اپنے لسانی و معاشرتی امتیازات سے مرتب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر قاضی افضال حسین کا یہ بیان قابل ذکر ہے کہ:

''متن کی قرأت یا اس کی تقدیر کے ایسے اصول ممکن ہی نہیں، جن کی رُو سے ہر زبان اور ہر زمانے کے ادب کا محاکمہ کیا جاسکے۔ مزید یہ کہ اگر ادب کے اصول آفاقی نہیں، بلکہ ہر زبان، ہر معاشرہ اور بعض صورتوں میں مخصوص زمانی عرصہ کی اپنی فکری و فنی ترجیحات سے نمو کرتے ہیں تو ان میں کوئی ترجیحی ترتیب قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ یعنی کسی ایک زبان یا ادبی روایت کے اصول دوسری زبان یا روایت کے اصولوں سے برتر یا فروتر نہیں ہوسکتے۔''[5]

استعماریت نے فکر و تہذیب کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کی اصلاح کے لیے بھی بعض بنیادی اصول مقرر کیے۔ اس میں کلام کو فطرت سے قریب کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس میں کوئی بات خلاف عقل یا قیاس بیان نہ ہو بلکہ ادب کا مواد فطرت کے تجربے پر مشتمل ہونا چاہیے۔ لہٰذا مشرق کے ادبی سرمایہ کا احتساب کرتے ہوئے مغربی نظریہ ادب کو واحد معیار نقد قرار دیا۔ اور ہمارے شعری، ادبی اور تہذیبی سرچشموں کو خشک اور ساقط الاعتبار ثابت کیا گیا۔ اس پس منظر میں شمیم حنفی ان ادبی اصلاحات کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قومی تعمیر اور معاشرتی اصلاح کے جوش میں یہ سمجھ لیا گیا کہ ہماری پرانی شعریات کا دائرہ نئی تہذیبی ضرورتوں کے حساب سے شاید ناکافی ہے۔ یہ سچائی نظر انداز کردی گئی کہ ہماری کلاسیکی شعریات میں اور پیش رو ادبی روایت میں اخلاقی مضامین باندھنے کی روش عام رہی ہے اور زندگی یا کائنات کی کوئی حقیقت ایسی نہیں جس کے بیان کی گنجائش عہد قدیم سے عہد وسطیٰ تک کی ادبی تاریخ میں ناپید رہی ہو..... مشرق کی مجموعی ادبی روایات اور شعریات میں انسان اور اس کی کائنات سے متعلق حقائق کی تفتیش، تفہیم اور تعبیر کا جو چلن صدیوں سے جاری تھا، اس کے پیش نظر مغرب کے تنقیدی تصورات بہت کم مایہ تھے۔ لیکن مغربی علوم و افکار اور طرز احساس کا جادو ایسا پھیلا کہ ہم اپنی معاشرتی ترجیحات اور امتیازات سے بخوشی دست بردار ہونے لگے۔''[6]

متن کی تشکیل میں اس معاشرے کے تصور کائنات (world view) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کی رو سے وہ فن پارہ کسی مخصوص معاشرے میں بامعنی بنتا ہے۔ اور اسی کے ذریعے اس متن کے حسن و قبح کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہند اسلامی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب داستان میں فوق الفطرت عناصر اور محیر العقول واقعات کی روداد داستانوں کا امتیازی وصف ہے وہیں مغربی معاشرے کے تصور کائنات کے سبب ناول میں واقعہ خیالی و فرضی ہونے کے باوجود ناممکن الوقوع نہیں ہوسکتا۔ انسانی منطق و فہم کے مطابق اس کا وقوع پذیر ہونا لازمی ہے۔ چونکہ فارسی اور اردو ادب (نثر و نظم) اس اصول کے تحت تخلیق بھی نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس بنیادی شرط کی مثالیں مغرب میں تلاش کی گئیں۔ ناول کا پودا، مغرب سے لاکر محکوم قوم کی زمین میں لگایا گیا۔ اس میں واقعہ کا تصور، ترتیب اور ان کا مقصود، سب نئے اور حاکم کی سیاسی ضرورتوں کے پابند تھے۔ نوآبادیاتی نظام حکومت نے مشرقی ادب، تہذیب اور تصور کائنات کو مہمل، خلاف عقل اور مخرب اخلاق قرار دیتے ہوئے نئی طرز کی کتابیں لکھوائیں۔ استعمار نے مغربی نظریہ حیات کو تشکیل دینے کے لیے متعدد علمی و ادبی اداروں کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اور اسی نقطۂ نظر کے تحت تیار کردہ ان تخلیقات میں 'باغ و بہار' اور 'فسانہ آزاد' جیسی کتابوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مشرقی معاشرے میں مغربی تصور کائنات کی اشاعت کے لیے نئے طرز کے قصوں میں 'ناول' کی صنف کو فروغ دیا گیا اس کے متعلق پروفیسر عقیل احمد صدیقی، ایڈورڈ سعید کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغرب میں ناول کا ارتقا جس نہج پر ہوا ہے اس سے یہی لگتا ہے کہ یہ صنف بنیادی طور پر '' اسلامی تصور کائنات کی دشمن ہے۔''[7]

اردو ادب میں ناول انگریزی ادب کی دین ہے اور اس پر مغربی فکر و ادب کے اثرات نمایاں ہیں کولونیل معاشرہ میں اس صنف کے ارتقا اور قبول عام ہونے کی وجہ یہی تھی۔ یہ استعماری نظام حیات کی عکاس و ترجمان تھی۔

اس ضمن میں علی عباس حسینی انگریزی میں صنف ناول کے بنیاد گذار ڈینیل ڈفو کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ فن ناول نگاری میں دو باتوں کے التزام کو ضروری خیال کرتا ہے، ''ایک تو یہ کہ قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔''[8]

ڈپٹی نذیر احمد اور ان کے متبعین نے اسی طرز پر ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ ان کے زیر اثر لکھے جانے والے ناولوں کی غرض و غایت ان کے مقدموں اور دیباچوں سے بخوبی ہوتی ہے کہ ان مصنفین نے اپنی ان تخلیقات کے ذریعے تعلیم، ترقی اور اصلاح کا جو تصور پیش کیا وہ نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا اور اس کے ذریعے کولونیل معاشرہ سے ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان مصنفین نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی علمی، تہذیبی اور معاشرتی صورت حال کو بدلنے اور اس کے ذریعے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔

اردو ادب میں صنف ناول کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے ہوتی ہے جو واضح طور پر مقصدی اور اصلاحی قصے تھے اور جس میں تعلیم، تہذیب اور ترقی کا نیا تصور پیش کیا گیا۔ نذیر احمد ایشیائی لٹریچر کے سخت مخالف تھے۔ اس لیے کہ یہ خیالی اور مبالغہ آمیز بیانات کے سبب ان خیالات کو پیش کرتا ہے یا ان جذبات کو تحریک دیتا ہے جو مخرب اخلاق ہیں۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''علومِ قدیمہ میں لٹریچر کا سخت مخالف ہوں۔ مسلمانوں میں ایز اے نیشن (as-a-nation) (بحیثیت قومی) جتنی خرابیاں کل تو نہیں اکثر اسی لٹریچر نے پیدا کی ہیں۔ یہ لٹریچر جھوٹ اور خوشامد سکھاتا یہ لٹریچر...... موجودات کی اصلی خوبی کو دباتا اور مٹاتا............ یہ لٹریچر توہمات اور مفروضات بے اصل کو فیکٹس (واقعات) بناتا۔ یہ لٹریچر نالائق ولولوں کو شورش دلاتا...... انگریزی پڑھنے سے اتنا تو ہوا کہ مجھ کو اپنے ہاں کے لٹریچر کے عیوب معلوم ہونے لگے مگر میں وہی کا وہی رہا۔''[9]

ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے محرکات و رجحانات اور معاشرتی پس منظر کے تحت ادب میں انقلابی تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے جدید خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کے لیے نیا اسلوب و آہنگ اختیار کیا۔ جو اصلاحی و اخلاقی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ واقعیت و افادیت کا بھی حامل تھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں زبان و بیان کا وہی طریقہ اختیار کیا جو نوآبادیاتی نظام کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق تھا۔ بقول ناصر عباس:

''ایک تو نذیر احمد کی 'قصہ گوئی' کو معاصر عہد میں قابل قبول ہونے کے لیے وہ زبان اور محاورہ اختیار کرنا پڑا جو دیسی زبانوں میں 'حقیقت نگاری' کی مثال ہو۔ دوسری طرف انھیں اپنے ناولوں کا معنیاتی نظام ان خیالات و تصورات پر استوار کرنا پڑا جن کا ناک نقشہ اور جن کی ضرورت و افادیت نوآبادیاتی حکمرانوں کے وضع کی تھی۔''[10]

انیسویں صدی کے وسط میں انگریز حکومت نے مختلف صوبوں میں جدید نظام تعلیم کو رائج کرنے خصوصاً تعلیم نسواں کی غرض سے نئے طرز کے مدارس قائم کیے۔ اس تعلیمی مشن کے تحت محکمۂ تعلیم کے حکمرانوں کی رہنمائی میں نہ صرف علمی تصانیف کے ترجمے ہوئے بلکہ ان نئے مدارس کی نصابی ضروریات کے تحت خاص قسم کی کہانیاں/ کتابیں لکھوائی گئیں۔ نذیر احمد خود اس نظام تعلیم کے پروردہ اور اس کے قدرداں تھے۔ دوسرے زمانۂ ملازمت میں محکمۂ تعلیم سے وابستگی کے سبب ان تعلیمی و اصلاحی سرگرمیوں سے بخوبی واقف تھے جو نوآبادیاتی حکمرانوں کے پیش نظر تھے اور وہ خود بھی اس قسم کی ترمیم و اصلاح کے حامی و مبلغ تھے۔ لہٰذا انھوں نے شعوری طور پر ایسے قصے لکھے جو اس نظامِ فکر کی مقصدیت و افادیت سے اس درجہ مطابقت رکھتے تھے (انھیں ان کے تین ناولوں پر یکے بعد دیگرے سرکاری انعام و اکرام سے نوازا گیا۔) گویا نذیر احمد کے ناول ان مقاصد کی ترجمانی کر رہے تھے جو نئے مدارس کے درسی نصابات کے ذریعے تشکیل پا رہے تھے۔

مراۃ العروس (1869) اردو کا پہلا انعام یافتہ ناول ہے جسے ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھا۔ انھوں نے دیباچہ میں ناول کی وجہ تخلیق یہ بیان کی ہے کہ اپنی بچیوں کو پڑھانے کے لیے ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہو۔ یہاں وہ نہ صرف مشرقی طرز حیات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں بلکہ اس کی خرابیوں اور خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس کی ایک مثال طبقۂ نسواں کو جاہل، توہم پرست اور بے اخلاق قرار دینا ہے۔ جب کہ یہاں مذہبی کتابوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت کا رواج ملتا ہے۔ لیکن یہ تعلیمی نظام نذیر احمد کے مقاصد کے مطابق نہیں تھا۔ یہاں دراصل ناول نگار کا مسئلہ صرف لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ لڑکیاں نوآبادیاتی نظام کے استحکام میں کس طرح معاون و مددگار ثابت ہوں۔

اس ناول کا واضح مقصد یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکومت قائم ہونے کے بعد انگریزی عمل داری میں جونئی اسامیاں قائم ہوئیں، ان پر کام کرنے کے لیے رفتہ رفتہ ایک نوکری پیشہ نچلا متوسط طبقہ وجود میں آرہا تھا۔ اس نچلے متوسط طبقے کی ایک متعین تنخواہ تھی اس طبقے کی لڑکیوں کو اپنی معاشی بنیادی حدود کے اندر رہنے کے ہنر کو ڈپٹی نذیر احمد ان کی تعلیم و تربیت بتا رہے ہیں۔ چونکہ مذہبی کتابیں ان مقاصد کے تبلیغ و تکمیل کرنے سے قاصر تھیں لہٰذا انھوں نے اس کے مقابل انگریزی نظام تعلیم کے تحت اس کتاب کو انھیں خطوط پر تیار کیا جو ان نئے حاکموں کے منشا کے عین مطابق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصہ کے مرکزی کردار اکبری اور اصغری دونوں کے لیے ماحول اور توارث کے یکساں عوامل کے باوجود دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے متضاد دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں حد درجہ تضاد نظر آتا ہے ایک سراپا شر اور دوسری سراپا خیر کا مجموعہ ہے۔ دراصل اکبری مشرقی نظم حیات کی پروردہ ہے۔ اس کے برعکس اصغری پڑھ لکھ کر (نہیں معلوم ہوتا کہ اصغری نے کون کون سی کتابیں پڑھیں کہ اتنی سلیقہ شعار اور سمجھ دار ہوگئی) صرف اپنے سلیقہ سے گھر کا نقشہ بدل دیتی ہے۔ گھر کا ماحول درست کرنے کے علاوہ اصغری کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بے کار اور قدرے آزاد مزاج شوہر کو انگریزی نوکری دلوادی۔

''اصغری: انگریزی نوکری تلاش کرو۔

محمد کامل: انگریزی نوکری تو بے سعی و سفارش کے نہیں ملتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مجھ سے بہتر بہتر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

———

اصغری: جو لوگ نوکری پیشہ ہیں ان سے ملاقات پیدا کرو۔ ان سے محبت بڑھاؤ۔ ان کے ذریعے سے تم کو نوکری کی خبر لگتی رہے گی اور ان ہی کے ذریعے سے تم کسی حاکم تک بھی پہنچ جاؤ گے۔''[11]

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے جلو میں ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ قدیم جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا اور استعماری نظام آہستہ آہستہ اپنی ایجادات و اختراعات کے ذریعے ہندوستانی زندگی پر قابض ہوتا جا رہا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی حکومت سے متاثر و مرعوب تھے۔ وہ ان حالات کے اسباب دریافت کرتے ہوئے انگریزی علوم کے سبب انگریزوں کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سارے ہندوستانیوں پر انگریز قابض ہیں.... سب کے سب پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور اسی سے خدا

نے ان کو یہ ترقی دی ہے کہ کہاں ان کی ولایت اور کہاں ہندوستان.... مگر علم کے زور سے اس ملک میں آئے۔ علم ہی کے زور سے سلطنت کی اور علم ہی کے زور سے اس کو اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ چلا رہیں کہ روئے زمین کی کسی سلطنت میں ایسا امن وانصاف اور ایسا نظام نہیں۔"12

اس طرح وہ نہ صرف انگریزی علمداری کو سب سے بہتر و برتر حکومت تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کو اپنا آقا/حاکم تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا غلام بھی قرار دیتے ہیں:

"صاحب نے پوچھا: کیا آپ کا کوئی لڑکا بھی میری کچہری میں تھا؟

مولوی صاحب نے کہا: محمد کامل"

صاحب نے کہا: "وہ تو ہمارے ساتھ آیا ہے۔ وہ آپ کا بیٹا ہے؟"

مولوی صاحب نے کہا: آپ کا غلام ہے"13

مولوی فاضل اور جیمس صاحب کی اس گفتگو سے محکوم طبقہ کی ذہنیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس نظام کا سیاسی جبر محکوم طبقے پر اس درجہ مسلط ہوا کہ وہ اپنی شناخت کو مٹا کر خود کو اس کا تابعدار تسلیم کرتا ہے۔ لیکن کسی حکومت کے دست نگر رہنا الگ بات ہے اور غلامانہ ذہنیت کو پروان چڑھانا جدا حقیقت ہے۔ اور یہی نوآبادیاتی نظام کی برکات وثمرات کا ایک قابل حیرت نتیجہ ہے۔ اس طرح نذیر احمد انگریزی تہذیب و معاشرت کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔ لہٰذا مغرب کی بے پردہ عورتوں کو مشرق کی باپردہ خواتین کے مقابلے میں حیا اور شرم کا پیکر قرار دیتے ہیں۔ دراصل اس ناول میں کوئی بھی واقعہ محض واقعہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے ذریعے وہ فضا تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں مشرق کا ہر فرد جاہل، بدطینت اور بدتہذیب ثابت کیا جاسکے۔ چونکہ استعماری نظام نے حاکم ومحکوم طبقے میں یہ حد فاصل قائم کی کہ ہندوستانی توہم پرست، غیر مہذب، ناشائستہ، جاہل اور کٹھ حجت قوم ہے۔ اس کے برعکس انگریز تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ، باسلیقہ، عقل مند اور ترقی یافتہ قوم ہے۔ لہٰذا ڈپٹی نذیر احمد اور بشمول دوسرے اصلاح قوم نے اس تفریق کے تناظر میں محکوم طبقہ کی تعلیم و اخلاق کی اصلاح کا کام انجام دیا اور عہد نو کے تقاضوں اور اخلاقی و معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے علوم جدیدہ پر زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ "علم و ہنر حاصل کریں جس سے دنیا وعاقبت دونوں درست ہوں"۔14 یہاں علم و ہنر سے مراد مشرقی علوم نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ:

"علم ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا ہے اور جو ہے وہ جہل سے بدتر ناحق کی کٹھ حجتی اور جھوٹی شاعری کے سوائے ہندوستان میں کچھ اور بھی نہیں۔"15

وہ مشرقی علوم کو مسترد کرتے ہوئے علم کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں:

"علم وہ باتیں ہیں جو کتابوں میں لکھی ہیں۔ حساب، جغرافیہ، تاریخ، اخلاق، طبعیات، طب، صرف و نحو، منطق، ہندسہ، ریاضی وغیرہ.......... تمام تر علموں کا نتیجہ یہ ہے کہ.......... کوئی چیز جو دیکھو اس کی حقیقت اور کوئی بات جو سنو اس کی وجہ سوچنی چاہیے۔"16

اس طرح نذیر احمد انگریزی علوم کی نشر و اشاعت کے ذریعے سائنسی فکر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق علم عقل کی غذا ہے اور علم سے مراد ہیں سائنسی علوم جسے وہ دین و دنیا کی درستگی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ قدیم علوم غیرافادی ہیں اور اس کے مقابل انگریزی علوم مفید و بکارآمد ہیں۔ لکھتے ہیں:

"جو علم بکارآمد ہیں انگریز سب سے زیادہ جانتے ہیں اسی علم کے زور سے وہ نادر کلیں ایجاد کی ہیں اور آئے دن ہوتی چلی جاتی ہیں کہ سن کر عقل دنگ ہوتی ہے۔ دنیا کا تمام کام کلون سے لیا جاتا ہے۔ کلیں سوت کاتیں۔ کلیں کپڑے بنیں اور کلیں آٹا پیسیں، کلیں کتابیں چھاپیں، کلیں باجے بجائیں، کلیں لوہار بڑھئی کا کام دیں بلکہ کلیں وہ کام کریں جو آدمی سے نہ ہوسکے۔"17

نذیر احمد نہ صرف انگریز قوم اور انگریزی علوم کے دلدادہ تھے بلکہ ان کو تمام روئے زمین میں سب سے زیادہ دانش مند، مہذب اور شائستہ قوم قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اس قوم کی طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے ایک انگریز خاندان کے حالات ہندوستانیوں کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں کیونکہ نذیر احمد چاہتے تھے کہ اس طرز حیات کی تقلید و پیروی کی جائے یا اسے اپنا آئیڈیل بنایا جاسکے۔ اس ضمن میں ہندوستانی معاشرے میں مسلمان عورتیں اظہار رائے کی آزادی، خلع کا حق اور عقد ثانی وغیرہ ان تمام حقوق سے محروم قرار دیتے ہوئے اس نظام حیات پر جابجا تنقید کی ہے۔ مثلاً انگریز خاتون کے ذریعے مغربی طرز حیات کے مقابل مسلمانوں کے طرز معاشرت پر اعتراض کرتے ہیں کہ:

"ہم لوگوں میں یہ بہت اچھا طریقہ ہے کہ شادی لڑکا لڑکی کی رضامندی سے ہوتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ رضامندی آپ لوگوں کے مذہب میں بھی شرط ہے مگر دیکھتی ہوں کہ اس کا برتاؤ کچھ بھی نہیں ہوتا۔"18

نوآبادیاتی نظام میں محکوم طبقے کا اپنے آقاؤں سے مطابقت و مناسبت اختیار کرنا ضروری تھا لہٰذا اس طبقے کی اصلاح کے لیے معیاری نمونہ اپنے حاکموں کا طرز حیات تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کے بتائے ہوئے طرز حیات کے مطابق اپنے معاشرے میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ ان کے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہو یا آزادی نسواں کا، اچھی بیوی کی صفات یا بچوں کی عمدہ تربیت کا، انتظام وانصرام کی عمدگی کا ہر جگہ حاکم طبقے کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اپنے دوسرے ناولوں کی طرح وہ ناول "فسانۂ مبتلا" میں مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زوال کو پیش کرنے کے لیے عورتوں کے موروثی حقوق کو تلف کرلینا، نکاح کے معاملہ میں اظہار رائے کی آزادی کا نہ ہونا اور بیوہ کے نکاح ثانی کی ممانعت وغیرہ ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ مغربی معاشرت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر چنچلی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ:

"ہم لوگوں میں مرد دوسری بی بی نہیں کرسکتے۔ اور مرد اور عورت دونوں کے حقوق کو تولا جائے تو شاید عورت ہی کا پلہ جھکتا ہوا رہے گا۔"19

ڈپٹی نذیر احمد اس قصے میں نہ صرف انگریز قوم اور ان کے طرز بود و باش کو تحسین آمیز قرار دیتے ہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ اختلاط پر بھی زور دیتے ہیں۔ اس طرح نذیر احمد نے قصے میں انگریز خاندان کے عادات و اطوار کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ انگریز خاندان کی حسن معاشرت اور اخلاق کو دیکھ کر حلیمہ کی ماں (ناول بنات النعش کا کردار) اس درجہ متاثر و مرعوب ہوتی ہے جس سے نوآبادیاتی طبقے کی ذہنیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"آگ لگے اس ملک کو جس میں ہنر کا نام نہیں ہم لوگ شہر میں بڑے سلیقہ شعار کہلاتے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ہنر اور سلیقہ آپ لوگوں پر ختم ہے۔ غرض میم صاحب سے ہو کر گھر آئے تو جدھر آنکھ پڑی تھی ہر چیز حقیر اور بھونڈی نظر آتی تھی۔"20

اس اصلاحی عہد میں نذیر احمد نے قومی اصلاح اور معاشرتی تعمیر میں مغرب کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس مغرب پرستی کی بنا پر اس طبقے کی بے حد مخالفت ہوئی۔ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنے ماضی کے احیاء و مراجعت کی کوشش نہ کی بلکہ مشرق کے مسلمہ اقدار و روایات اور مروجہ علوم کو متروک قرار دیتے ہوئے مغربی علوم و

اقدار کو اختیار کرنے پر زور دیا۔ جب کہ مشرق و مغرب کی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف بلکہ بعض معاملات میں متضاد ہیں۔ اشپنگلر کے مطابق:

''ایک کلچر دوسرے کلچر کا طرز احساس مستعار لے نہیں سکتا۔ اس کے خیال میں تو ہر کلچر زمان و مکان کا ایک مخصوص تصور رکھتا ہے۔ اور اسی سے اس کے طرز احساس کا تعین ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں، جو کسی اور کلچر کو منتقل کی جاسکے۔ ہر کلچر اپنے اظہار کے لیے مخصوص شکلیں پیدا کرتا ہے جو اسی کے ساتھ مرجاتی ہیں یہ کسی اور کلچر کے کام نہیں آسکتیں بلکہ دوسرے کلچر والے اسے سمجھ تک نہیں سکتے۔''21

اس دور کا اصلاح پسند طبقہ قوم کی قلب ماہیت کا خواہاں تھا۔ انگریزی تمدن اختیار کرنے سے ان کا مقصد قومی تعصبات کو گھٹانا اور انگریزوں سے میل جول بڑھانا تھا، لہٰذا ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' میں شاہ کردار ابن الوقت کی تبدیلیِ وضع، اعلیٰ تمدن، عمدہ معاشرت اور باعزت زندگی کے حصول کی شعوری کوشش ہے۔ اس طرز معاشرت کی قبولیت سے اس کا مقصد حکمراں قوم سے مناسبت و برابری کا درجہ حاصل کرنا ہے۔ ابن الوقت کا کردار انگریزی خواں طبقے کی داستان حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ انگریزی وضع و قطع کے ذریعے اپنے آپ میں ''جنٹلمین'' بن گیا۔ لیکن انگریز حکمراں نیٹو قوم سے برابری کی سطح پر ملنا جلنا اپنی حاکمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ انگریز حاکم شارپ کے رویے سے نوآبادیاتی حاکموں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑھاتا ہے۔ کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کو کسی طرح کی آسائش نہیں بے وجہ اختیار کرے گا اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟............ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بزور شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے؟''22

محکوم طبقہ نہ صرف اس جھوٹ کو سچ تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کو حق بجانب بھی سمجھتا ہے۔ مثلاً حجۃ الاسلام کا یہ بیان:

''بڑائی تو خدا کی ہے مگر خدا نے آپ لوگوں کو دنیاوی بڑائی دی ہے تو آپ کی چیزوں میں بھی بڑائی کی شان دی ہے یہاں تک کہ لباس میں، تو بلاشبہ جو اس لباس کو پہنے گا لوگوں کی نظر میں بڑا دکھائی دے گا۔''23

ابن الوقت نے شعوری طور پر مغربی طرز تمدن کو اختیار کیا اور اس نظام حیات سے مکمل طور پر مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نوآبادیاتی نظام میں حاکم و محکوم میں یکساں موانست کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس طرز کے متعلق ژاں پال سارتر لکھتا ہے:

''کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوئے بغیر اپنے جیسے انسانوں کو نہ غلام بنا سکتا ہے، نہ لوٹ سکتا ہے اور نہ قتل کرسکتا ہے۔ اس لیے وہ (نوآبادیاتی حکمراں) یہ اصول وضع کرتے ہیں کہ دیسی باشندہ ہمارے جیسا انسان نہیں، ہماری فوجوں کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدل دیں۔ انھیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مفتوحہ ملک کے باشندوں کو 'بالاتر بندروں' کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔ تاکہ نوآبادکاران سے بار برداری کرانے کو جائز قرار دیا جاسکے۔ نوآبادیات میں تشدد کا استعمال محض اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کی انسانیت ختم کردی جائے۔ اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی روایات کو مٹا دیا جائے۔ ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جائے اور ان کی تہذیب کو اپنی تہذیب دیے بغیر برباد کردیا جائے۔''24

استعمار نے اپنے مقبوضہ اور جبری حکومت کی ترقی و بقا کے لیے ہندوستانیوں کا حد درجہ اقتصادی و معاشی استحصال بھی کیا۔ انگریز حکومت کی سخت گیری اور نئے نظام زیست کے سبب حاکم و محکوم میں کسی طرح کی مناسبت نہیں رہی۔ برطانوی حکومت نے صنعت و حرفت کو متاثر کیا۔ علوم جدیدہ، سائنس اور ٹکنالوجی کو قومی و ملکی ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا لیکن یہ مشینی صنعت اہل حرفہ میں بے روزگاری کا سبب بنی۔ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی علمداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ انگریز کی عملداری میں امن ہے، انصاف ہے، زور نہیں، ظلم نہیں، مگر خدا جانے کیا بات ہے اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں۔''25

انگریز حکمرانوں نے بعض زرعی اصلاحات کے تحت انتظام مالگزاری کو زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی لیکن اس نظام کی بدولت زمینداروں اور کاشتکاروں کی حالت زبوں تر ہوگئی۔ ابن الوقت انگریز حکام کو متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''رعایا اور سرکار کا تعلق من وجہ بندے اور خدا کا تعلق ہے۔ یہاں انصاف سے کام نہیں چلتا بلکہ رحم و رعایت سے۔ سرکار کو قرار دار جمع کرنے میں ایک سود خوار بنیے کی طرح دمڑی دمڑی اور ادھی ادھی کا حساب نہیں کرنا چاہیے تھا۔''26

برطانوی استعمار، ہندوستانی قوم کے علوم و ادب، تہذیب و معاشرت پر ہی اثر انداز نہیں ہوا بلکہ اس نے ان مذاہب و عقائد میں اصلاح و ترمیم کی کوشش کی۔ ناول توبۃ النصوح میں ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں اثرات کے تحت مذہبی اصلاح کے پیش نظر ناول تخلیق کیا۔ سر ولیم میور نے اس کتاب کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اہالیان یورپ کے لیے مسلمانوں کی خانگی حالات سے آگاہی اور واقفیت کا ذریعہ قرار دیا اور اسے ''کوئی امر متعلق تعصب مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو'' داخل نہ ہونے کے سبب اوّل انعام کا مستحق بتایا۔

سر ولیم میور اور میتھو کیمپسن نے ناول شائع ہونے سے پہلے حاشیے پر اصلاح کی غرض سے کچھ ہدایات بھی لکھی تھیں۔ نذیر احمد نے حسب منشا ان صاحبان کے اس میں اصلاحات کیں۔

ناول توبۃ النصوح میں مذہبی اصلاح کے ذیل میں قرآن و حدیث یا کسی مذہبی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ یہ کام پادری کے ذریعہ دی گئی سنہری جلد والی کتاب سے انجام پاتا ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے ناول کا کردار کو ایک نئی آگہی نصیب ہوتی ہے۔ کہتا ہے:

''اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے، اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوق ہوں۔''27

نذیر احمد نے یہ ناول یورپی حاکموں کے حسب منشا اور سرکاری انعام کے اشتہار کی شرائط کے مطابق ترتیب دیا تھا۔ لہٰذا ناول میں کردار کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کرنے کے باوجود اسے اس کا سب سے بڑا عیب قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیمپسن نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مصنف نے جوان دنوں کے شاعروں کی تحقیر لکھی ہے وہ اسی لائق ہیں۔''28 چنانچہ انگریزی نظام میں یہ کمالات عیب بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کسی جبری نظام کی اطاعت و بندگی کے قائل نہیں بلکہ اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ کلیم پر اس نظام کے برخلاف ہونے کے سبب عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ وہ حصول معاش کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دولت آباد پہنچتا ہے جو دربار عیاشی میں ضرب المثل تھا لیکن حکومت انگریزی کے سبب اس کے اختیارات ایک کمیٹی کو دیے جاچکے تھے۔ یہاں وہ شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شاعری کے متعلق یہ خیالات پیش کیے جاتے ہیں کہ ''ایسے مضامین میں اشتغال و

انہماک رکھنے سے ذہول وغفلت، استحسان لہو ولعب، اختیار مالا یعنی کے سوائے کچھ اور بھی حاصل ہے“[29] گویا سرکار انگریزی کے ماتحت انتظامی کمیٹی کے صدر اعظم کے یہ خیالات نہ صرف شاعری کے بے وقعتی و ناقدری کو پیش کرتے ہیں بلکہ فن شاعری کے ساتھ ساتھ خدمت شاعری کے خاتمے کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ چنانچہ کلیم کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ”انتظام جدید کے مطابق ریاست میں کوئی خدمت شاعری باقی نہیں۔“[30]

اس طرح کلیم بحیثیت شاعر اس ریاست میں جگہ حاصل نہیں کر سکا لیکن ایک فوجی اور شوروپشت سپاہی کے طور پر اسے عزت ومنصب عطا کیا جاتا ہے اس لیے کہ بقول کیمپسن ”ہم شاعروں کو نہیں چاہتے ہم کو کام کے آدمی چاہئیں جو مالگزاری کی تحصیل کے وقت ان لڑاکے ٹھاکروں سے لڑائی بھڑائی کو خیال میں نہ لاویں۔“[31] اور جن کے ذریعے انگریزی نظام کو استحکام حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم جو مشرقی تہذیب وثقافت کا نمائندہ ہے وہ اس نظام کا ناکام پرزہ تھا اس لیے وہ ناکام ونامراد رہ جاتا ہے۔ کلیم کے انجام کے ذریعے جہاں مشرقی نظام حیات کے زوال کو پیش کیا گیا ہے وہیں سامراجی نظام کی اطاعت میں اس کی نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ کلیم کا یہ انجام منشائے مصنف کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ ناول کے آخر میں اس معتوب کردار کی ناکامی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نظام کے تربیت یافتہ افراد کی کامیابی وترقی کا ذکر بطور مثال کیا گیا ہے۔

استعماری نظام میں وہ طبقہ جو اس طرز حیات سے مطابقت نہیں رکھتا مجہول قرار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان پر برطانوی سامراج کے مسلط ہونے کے بعد ان کی نوازش و مہربانی حاصل کرنے کے لیے ان کی حاکمیت کو قبول کرنا ضروری تھا لیکن مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اس جبری نظام کا قائل نہیں تھا جس میں مولوی و علماء کرام شامل تھے۔ لیکن نذیر احمد نے وقتی مصلحت کے تحت خود کو محکوم و نااہل قرار دیتے ہوئے ان کی اطاعت وفرماں برداری کی تعلیم دی۔ نذیر احمد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ عوام اپنے مذہبی معاملات میں علماء کے مقلد اور ان کے پابند تھے۔ چونکہ عوام کے مولویوں پر اس انحصار کے سبب قوم کی ترقی وتعمیر کے لیے ضروری تھا کہ پہلے خود مولوی حضرات کی اصلاح کی جائے۔ ڈپٹی صاحب قومی و ملی انحطاط کا سبب انھیں مولویوں کو سمجھتے تھے۔

نذیر احمد انگریزی سامراج سے مرعوب تھے۔ انھوں نے مشرق کے مقابل مغربی علوم وافکار کی روشنی میں ہندوستانی قوم کی تعمیر وترقی اور اصلاح وتجدید کی کوشش کی۔ جس کی مثالیں ان کے ناولوں سے پیش کی جاچکی ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں بلکہ اپنی دوسری تصانیف، تقاریر، خطابت اور شاعری کے ذریعہ جو نظام حیات تشکیل دیا وہ مغرب سے مرعوبیت اور اثر انگیزی کا مثالی نمونہ تھا جسے نہ صرف انھوں نے برضا و رغبت قبول کیا بلکہ ہندوستانیوں کی ترقی وبقا کے لیے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ اردو ادب میں نذیر احمد کے تتبع میں کثرت سے اس طرز پر ناول لکھے گئے۔ اور ان مصنفین کے پیش نظر یہی اصلاحات تھیں جن کا خاکہ استعمار نے تیار کیا۔ لہذا ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے نہج پر تیار کی گئی دوسری تصانیف کا مطالعہ وتجزیہ بھی اسی نقطہ نظر کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے ذریعے اپنے علوم، اپنی زبان، ادب، تہذیب، ثقافت، اور اپنی اصل کی بازیافت کی جاسکتی ہے جسے نوآبادیاتی نظام میں مسخ کردیا گیا۔ ڈاکٹر نعیم احمد اس مطالعے کی ضرورت کے متعلق لکھتے ہیں:

”استعماریت کا مطالعہ اپنی نوعیت میں دراصل ان حربوں اور حکمت عملیوں کا مطالعہ ہے جن کی مدد سے یورپی ملکوں کا دنیا کے بڑے رقبے پر قبضہ ممکن ہوا اور اس قبضے نے ایسے ہمہ گیر اثرات ان ملکوں کی ثقافت، معاشی ڈھانچے، سیاسی طریقہ کار اور زبان وادب پر چھوڑے کہ آزادی حاصل کرلینے کے باوجود بیشتر ملک نہ تو اپنی منفرد شناخت قائم کرپائے ہیں اور نہ ہی ان اثرات سے پوری طرح نکل پائے ہیں۔“[32]

حواشی

1- مظہر مہدی: اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات (نوآبادیاتی ہندوستان 1857-1914)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1999، ص13
2- The Twilight of the Mughuls، 1951، بحوالہ شمیم حنفی، اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2011، ص186
3- پروفیسر قاضی جمال حسین: اردو ادب کا تہذیبی اور فکری پس منظر (1857 سے 1914 تک)، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، ص174
4- بحوالہ ستارہ یا بادبان، محمد حسن عسکری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، باراول 1977، ص103-04
5- پروفیسر قاضی افضال حسین: داستان کی نئی قرأت (ساحری، شاہی، صاحب قرآنی) مشمولہ سہ ماہی الفاظ، جولائی، اگست، ستمبر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2000، ص41
6- پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (مرتب)، ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریکات اور ان کے اثرات، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2011، ص18-19
7- بحوالہ عقیل احمد صدیقی، نذیر احمد اور کولونیل ڈسکورس کی مزاحمت (ابن الوقت و توبۃ النصوح کی روشنی میں) مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر، ڈپٹی نذیر احمد نمبر، خصوصی شمارہ، لیتھو آفسیٹ پرنٹرس علی گڑھ، جون 1994
8- علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2011، ص35
9- سید افتخار عالم بلگرامی (مرتب): حیات النذیر، شمسی پریس دہلی، 1914، 565
10- ناصر عباس نیر، معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش (نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح کا مطالعہ)، مشمولہ فکر ونظر سہ ماہی، مارچ 2014، جلد ۵۱، شمارہ ۱، ص23
11- ڈپٹی نذیر احمد: مراۃ العروس، کتابی دنیا دہلی، 2003، ص123
12- نذیر احمد، مرآۃ العروس، فیض مبتج (راجہ) رام کمار لکھنؤ، 1961، ص20
13- ایضاً، ص193
14- ڈپٹی نذیر احمد: بنات النعش، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 1983، ص30
15- ایضاً، ص120
16- ایضاً، ص106-07
17- ایضاً، ص130
18- ایضاً، ص135
19- ایضاً، ص137
20- ایضاً، ص138
21- The Twilight of the Mughuls، 1951، بحوالہ شمیم حنفی: اردو کلچر اور تقسیم کی وراثت، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2011، ص186
22- ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، (تصحیح وترتیب خلیق انجم) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، باراول 1980، ص254-55
23- ایضاً، ص252
24- ژاں پال سارتر: فرانز فینن کی کتاب 'افتادگان خاک' کا پیش لفظ، اردو ترجمہ از محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی، ص13-14، بحوالہ سرسید سے اقبال تک، قاضی جاوید، نگارشات، لاہور، 1986، ص11-12
25- ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، (تصحیح وترتیب خلیق انجم)، ص148
26- ایضاً، ص138
27- محمد نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر، دیباچہ توبۃ النصوح، مطبع نول کشور، کانپور، جولائی 1887، ص87
28- محمد نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر، توبۃ النصوح، ص87
29- ایضاً، ص13
30- ایضاً، ص208
31- ایضاً، ص207
32- محمد نعیم: اردو ناول اور استعماریت (انیسویں صدی کے ناول کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)، کتاب محل لاہور، 2017، ص5

Shagufta Yasmeen
Senior Research Fellow
Dept of Urdu, AMU
Aligarh- 202001 (UP)

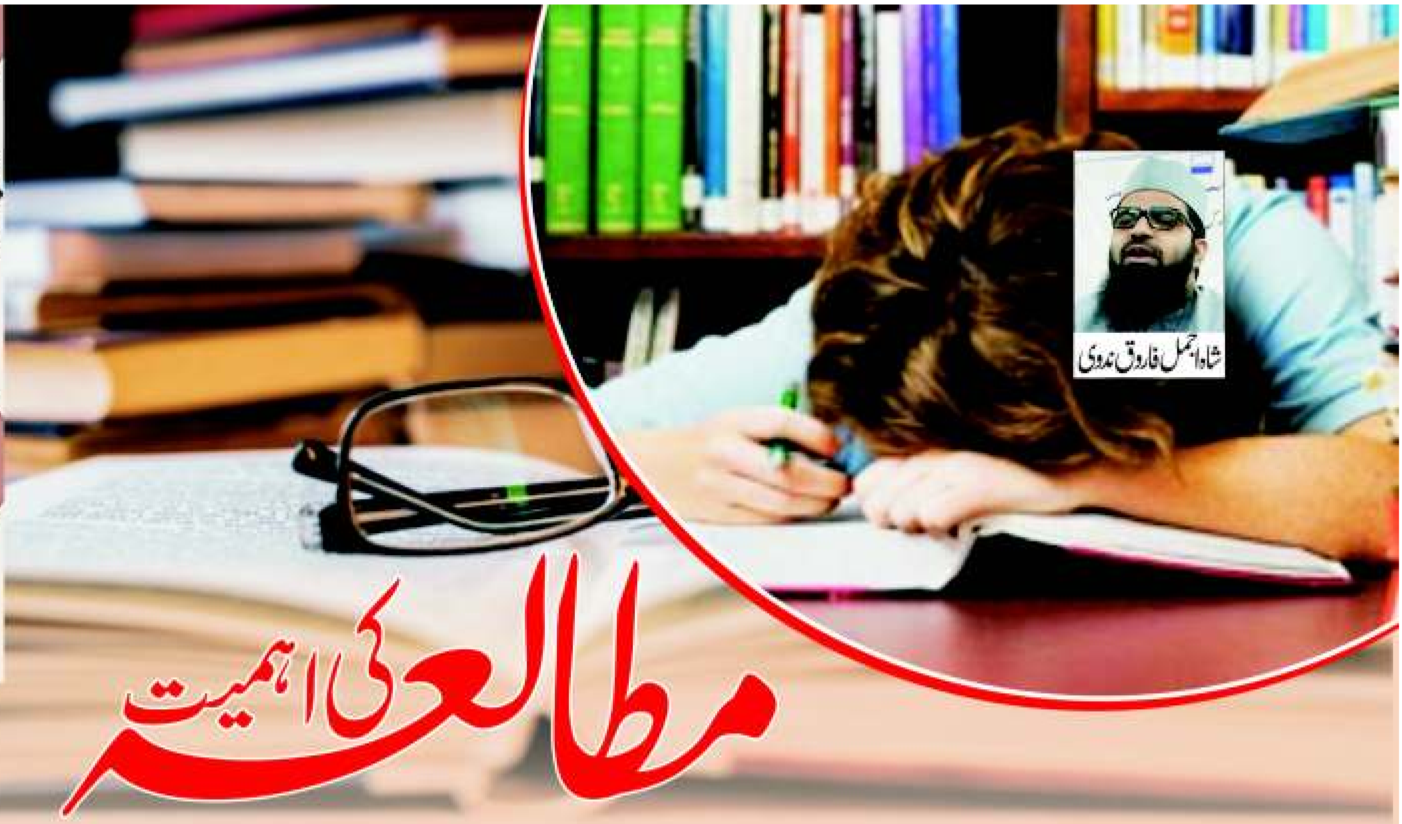

شاہ اجمل فاروق ندوی

مطالعہ کی اہمیت

انسان کی فطرت میں شروع ہی سے سیکھنے سکھانے کا مزاج رہا ہے۔ پہلے وہ نئی نئی بات سیکھنا چاہتا ہے اور پھر انھیں دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اسی فطری جذبے کی وجہ سے دنیا میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک انسان نے کسی تجربے سے کوئی نئی بات سیکھی تو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اُسے تحریر کردیا۔ دوسرے انسان نے جب اسی تحریر کو پڑھا تو اس کے اندر اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اُس نے مختلف ذرائع سے دوسری تحریریں بھی جمع کیں اور مزید تجربات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ جب بہت کچھ جمع کرلیا تو اُسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے خود بھی کوئی تحریر ترتیب دی۔ اس طرح کتابیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ کتابیں وجود میں آنے لگیں تو مطالعے کے شائقین نے انھیں جمع کرنا شروع کردیا۔ اس طرح ذاتی لائبریری کا رواج چل پڑا۔ پھر جن لوگوں نے اپنے کتابی ذخیرے سے دوسروں کو بھی مستفید کرنا چاہا، انھوں نے عوامی لائبریریاں قائم کرنی شروع کیں۔ کچھ لوگوں نے اس مفید چیز کو تجارت کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، تو کاتب، ناشر اور تقسیم کار وجود میں آنے لگے۔ غرض یہ کہ دنیا میں آہستہ آہستہ کتاب، مطالعہ، قاری، کتب خانہ، سلسلۂ تصنیف وتالیف اور مطبع سب وجود میں آگئے۔

کتاب اور انسان کا رشتہ

علم کی طلب اور سیکھنے سکھانے کے شوق نے کتاب اور انسان کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ قائم کردیا۔ یہ رشتہ کتنا قدیم ہے، اس کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ بعض تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین کتاب تقریباً 4500 سال پہلے لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب پاپُرس نامی ایک درخت کی چھال پر لکھی گئی تھی۔ اسی طرح عراق کے قدیم شہر نینوا (Nineveh) میں مٹی کی دس ہزار چھوٹی چھوٹی تختیوں کی ایک پبلک لائبریری پائی گئی تھی۔ 1900 ق م میں کریٹ (Crete) شہر میں پانچ ہزار سال پرانی لائبریری دریافت ہوئی تھی۔ بطلیموس اول (367 ق م – 283 ق م) نے 323 ق م میں اسکندریہ میں ایک لائبریری قائم کی تھی۔ 370 ق م میں یونان میں دنیا کا پہلا انسائیکلوپیڈیا مرتب ہوا تھا۔ 237 ق م میں مصر کی ایک لائبریری میں کتابوں کی فہرست ایک چٹان پر تراشی گئی تھی۔

برطانیہ کے ایک مشہور ناشر Wigan Lane Books نے 13/ مارچ 2018 کو اپنی ویب سائٹ پر ایک طویل مضمون شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں دنیا کی دس قدیم ترین کتابوں کے متعلق باتصویر معلومات جمع کی گئی تھیں۔ مضمون نگار کے مطابق دنیا کی سب سے قدیم موجود کتاب دو ہزار چھ سو تہتر سال پہلے ترتیب دی گئی تھی۔ یہ کتاب سونے کے چھ صفحات پر مشتمل ہے اور ستر سال پہلے بلغاریہ میں اسٹروما (Strouma) ندی کے قریب ایک سرنگ میں دریافت ہوئی تھی۔ یہ کتاب بلغاریہ کے نیشنل ہسٹری میوزیم میں موجود ہے۔

عیسوی کلینڈر شروع ہونے کے بعد کی انسانی تاریخ بھی انسان اور کتاب کے رشتے کی مضبوطی ثابت کرتی ہے۔ خاص طور پر چھٹی صدی عیسوی میں عرب سے اسلامی تہذیب شروع ہونے کے بعد کتاب اور انسان کا رشتہ اتنا مضبوط ہوگیا کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں اس کا خلاصہ پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ اندازہ لگانے کے لیے ایک دو مثالیں یہ ہوسکتی ہیں کہ دسویں صدی عیسوی میں ایران کے وزیر اعظم ابوالقاسم اسماعیل کی ذاتی لائبریری میں ایک لاکھ سترہ ہزار کتابیں تھیں۔ نویں صدی عیسوی کے عالم واقدی کی ذاتی لائبریری چھ سو صندوقوں پر مشتمل تھی۔ امیر امین الدولہ کی ذاتی لائبریری میں ایک لاکھ کتابیں تھیں۔

غرض یہ کہ دنیا میں نئے نئے تجربات حاصل کرنے، انھیں تحریر کرکے دوسروں تک پہنچانے اور زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے تحریریں جمع کرنے کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے۔ اسی لیے کتاب کو انسان کی سب سے بڑی ایجاد کہا جاتا ہے۔

کتاب کے اثرات

کتاب کے ذریعے دنیا میں نہ جانے کیسے کیسے انقلابات رونما ہوئے اور کیسی عظیم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ یہ انقلابات معاشرے کی سطح پر بھی رونما ہوئے اور فرد کی سطح پر بھی۔ مثال کے طور پر چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے بدوؤں نے ایک کتاب (قرآن مجید) کے ذریعے ہی سدا کے لیے دنیا کی امامت حاصل کی۔ اندلس کے مسلمان

مفکرین کی کتابوں پر ہی یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور یورپ اپنے موجودہ مقام تک پہنچا۔ قدیم ہندستان کی موریہ سلطنت کی بنیاد کوٹلیہ چانکیہ کی کتاب ارتھ شاستر پر قائم کی گئی تھی۔

اسی طرح ہر دور میں پیدا ہونے والی عظیم شخصیات نے خود کو کتاب سے وابستہ بھی رکھا اور کتابوں کو اپنا محسن بھی سمجھا۔ زندگی کے جس میدان میں بھی وہ کام کرتے رہے، اُسی کے ساتھ پڑھنے اور سیکھنے کا عمل جاری رکھا۔ کیوں کہ مطالعے کے بغیر انسان کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں مرجھانے لگتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عظیم بادشاہ سکندر اعظم (356-323 ق م) کے سرہانے اگر ایلیڈ کا رزمیہ نہیں ہوتا تھا، تو اُسے نیند نہیں آتی تھی۔ مشہور مغل شہنشاہ جہانگیر (1627-1569) اپنے ساتھ ہمیشہ دیوان حافظ رکھتا تھا۔ بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی (1948-1869) نے جان رسکن کی کتاب Unto the last کے بارے میں لکھا ہے کہ ''میں نے اسی کتاب کو پڑھ کر اپنی زندگی کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔'' مولانا عبید اللہ سندھی (1944-1872) ایک گم نام عالم کی کتاب 'تحفۃ الہند' کو اپنی زندگی میں انقلاب پیدا ہونے کا ذریعہ بتاتے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی (1956-1892) امام رازی کی 'تفسیر کبیر' کو اپنے اندر علم کے صحیح ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ اور اپنا پہلا رہ نما بتاتے تھے۔ میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''الفاروق'' کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اثر انداز کتاب کہتے تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (1999-1914) نے بچپن میں معروف سیرت نگار قاضی سلیمان منصور پوری کی مشہور کتاب 'رحمۃ للعالمین' پڑھی تھی۔ اس کتاب کو وہ ہمیشہ اپنی محسن کتاب بتاتے تھے اور اس کے اثرات اپنی زندگی پر محسوس کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تاریخ کی اکثر عظیم شخصیات نے اپنی تمام سرگرمیوں کے ساتھ مطالعے کو اپنی عادت بنائے رکھا۔ اُن میں سے بے شمار شخصیات ایسی ہیں، جنھوں نے کسی مصنف کی کسی کتاب سے متاثر ہوکر عظیم کارنامے انجام دیے۔ شخصیات کے علاوہ دنیا کے متعدد انقلابات بھی کتابوں کی بنیاد پر برپا ہوئے۔

منظم مطالعہ

ایک طرف انسان اور کتاب کا رشتہ ایک تاریخی حقیقت ہے، تو دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کتابوں کا مطالعہ منظم (Systamatic) ہونا چاہیے۔ بے ترتیب مطالعہ عام طور پر فائدے کے بجائے نقصان پہنچا دیتا ہے۔ منظم اور غیر منظم مطالعے کی مثال سلیقے سے ترتیب دیے ہوئے باغ اور بے ترتیب جھاڑ جھنکاڑ والے جنگل کی ہے۔ جس باغ میں مرتب انداز میں پیڑ پودے لگائے جاتے ہیں، کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے، پانی اور دوا ڈالی جاتی ہے، وہ باغ دیکھنے میں بھی اچھا لگتا ہے اور اُس کا فائدہ بھی خوب ہوتا ہے۔ لیکن بغیر کسی ترتیب کے اگنے والے پیڑ پودوں کا جنگل نہ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے اور نہ انسان کو اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ بالکل یہی فرق منظم اور غیر منظم مطالعے کا ہے۔ منظم مطالعہ کرنے والے انسان کی شخصیت بھی دل کش ہوتی ہے اور اس کے خیالات بھی انسان کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ جب کہ غیر منظم اور غیر مرتب مطالعہ کرنے والے لوگوں کا مزاج بھی عام طور پر خراب ہو جاتا ہے اور ان کے خیالات بھی دوسروں کے لیے مفید نہیں ہو پاتے۔ کیوں کہ کسی جنگل کی طرح ان کے ذہن میں ہوتا تو بہت کچھ ہے، لیکن اُس میں کوئی ترتیب، کوئی سلیقہ اور خوب صورتی نہیں ہوتی۔ اس لیے اپنے مطالعے کو مرتب انداز میں شروع کرنا اور اسی انداز سے آگے بڑھانا ضروری ہے۔

ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد آگے چل کر ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے، جب انسان کو کسی کی رہ نمائی یا مشورے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن یہ مرحلہ ابتدائی دور میں نہیں آتا، ایک حد تک پہنچنے کے بعد آتا ہے۔ کسی کے مشورے سے مختلف فنون کی متعدد کتابیں ہضم کرنے کے بعد آتا ہے۔ ابتدائی دور میں تو ہر کتاب یا ہر مضمون کسی کی رہ نمائی میں اور ہر تحریر پورے اہتمام کے ساتھ ہی پڑھنی چاہیے۔ تاکہ ذہن پختہ ہوجائے، فکر تشکیل پا جائے، ذہن میں علمی حقائق مرتب انداز میں راسخ ہو جائیں، کلیات دماغ میں بیٹھ جائیں اور انسان علم کی وسیع و عریض دنیا میں قدم بڑھانے کے لائق ہوجائے۔

مطالعے کی تکنیک

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مطالعہ ایک انتہائی اہم انسانی ضرورت ہے۔ اس کی اہمیت ہوا اور پانی سے کم نہیں ہے۔ اس کا اثر ہماری پوری زندگی پر پڑتا ہے۔ اچھی چیزوں کا مطالعہ ہماری زندگی کو کام یاب اور خراب چیزوں کا مطالعہ ہماری زندگی کو برباد کر دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں پورے اہتمام اور تیاری کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ اپنے مطالعے کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لیے ان دس چیزوں کا لحاظ رکھنا ہوگا:

۱۔ مقصد

مطالعہ مختلف مقاصد سے کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر مطالعے کے مقاصد یہ ہوتے ہیں:

الف۔ وقت گزاری: بہت سے لوگ کسی کا انتظار کرتے ہوئے، رات میں نیند نہ آنے یا سفر کے دوران وقت گزاری (Time Pass) کے لیے مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بہت سرسری قسم کا (Rough) مطالعہ ہوتا ہے۔ عام طور اس سے وقت گزاری کے علاوہ کوئی بڑی چیز تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن وقت کو پوری طرح ضائع ہونے سے بچالیا جاتا ہے۔

ب۔ وقتی معلومات: کبھی کبھی ہمیں کسی وقتی یا ہنگامی ضرورت کی وجہ سے کچھ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو ضرورت پیش آتی ہے، وہ پوری ہوجائے۔ آج کل اس طرح کا مطالعہ نیٹ پر کرلیا جاتا ہے۔ کتاب دیکھنے کی زحمت نہیں کی جاتی۔ اس طرح کے مطالعے میں کوئی گہرائی تو نہیں ہوتی، البتہ اس سے ایک وقتی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔ ایسے مطالعے کے ذریعے وقتی ضرورت پوری کرنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے، لیکن اس کا ایک بہت نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے مطالعے کے بعد خود کو بڑا عالم و فاضل، اسکالر اور محقق سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک صورت حال ہوتی ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل عام طور پر صحافی، مضمون نگار، مقالہ نگار، مقررین، مصنفین حتی کہ ڈاکٹریٹ کرنے والے اسکالرز بھی ایسے ہی مطالعے کے عادی ہوگئے ہیں۔

ج۔ حالات سے واقفیت: جو لوگ اپنے گرد و پیش اور دنیا کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں، وہ اس مقصد کے تحت مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ یومیہ اخبارات ہفت روزہ رسائل اور ماہانہ جرائد کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ مطالعے کی ایک مفید قسم ہے۔ اگر اس مطالعے کو مزید مرتب کر کے اہم خبروں اور مضامین کو محفوظ رکھنے اور ان پر مختصر تبصرہ لکھنے کی عادت ڈال لی جائے تو اس کی افادیت دو چند ہو جاتی ہے۔

د۔ زبانی چاشنی: بعض لوگ صرف زبانی چاشنی کے لیے مطالعہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ صرف اُن کتابوں کو پڑھتے ہیں، جن میں زبان و بیان کا حسن پایا جاتا ہے۔ اس طرح کی عمدہ اور مزے دار کتابیں پڑھ کر ذہن و دماغ کو لطف حاصل ہوتا ہے اور اچھی زبان لکھنا بولنا آتا ہے۔ یقیناً اس طرح کا مطالعہ بہت مفید ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم صرف اسی طرح کے مطالعے کے عادی ہو جائیں اور دوسری علمی کتابیں پڑھنا ہمیں بوجھ محسوس ہونے لگے، تو اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ نقصان دہ

ہوجاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح کا مطالعہ جاری تو رکھا جائے، لیکن اعتدال و توازن کے ساتھ۔

ہ۔ نفسیاتی تسکین: انسانوں کی نفسیات مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کو ڈراؤنے واقعات سننے یا پڑھنے میں مزہ آتا ہے، تو کسی کو جاسوسی ناولوں اور کہانیوں میں۔ کسی کو فنی مذاق یا پیار محبت پر مشتمل تحریریں بھاتی ہیں، تو کسی کو شکار کے واقعات۔ اس طرح کا مطالعہ انسان کی نفسیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ انسان ایسی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے، جس سے اس کی نفسیاتی تسکین ہو۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ صرف ایسی ہی کتابیں پڑھنے کے عادی ہوجاتے ہیں، وہ دوسری سنجیدہ اور علمی و تحقیقی چیزیں نہیں پڑھ پاتے۔ اس لیے اول تو اس طرح کے مطالعے سے بچنا چاہیے۔ کسی وقت زیادہ شدید اندرونی تقاضا ہو تو ان موضوعات پر صاف ستھری نثر لکھنے والوں کو پڑھنا چاہیے۔ وہ بھی صرف بہ وقت ضرورت۔ جیسے ریل گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے یا ریل اور جہاز کے دو چار گھنٹے کے سفر میں اس طرح کی چیزوں کو پڑھا جاسکتا ہے۔ یعنی جہاں کوئی فکری و علمی چیز پڑھنے کا موقع نہ ہو۔

و۔ غلط مقاصد: کچھ لوگ ہمیشہ ایسی ہی چیزیں پڑھتے ہیں، جس سے اُن کا جسمانی، روحانی یا ذہنی نقصان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جنسی جذبات کو بھڑکانے والی تحریریں، چوری ڈکیتی کے واقعات، جادو ٹونے کی ترکیبیں، ہیکنگ (Hacking) کے طریقے، وغیرہ۔ اس طرح کی نقصان دہ چیزیں کبھی کبھی کسی تحقیقی جذبے سے مفید مقاصد کے لیے بھی پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ 99.99 فی صد لوگ اس طرح کی کتب و رسائل منفی جذبات کے تحت ہی پڑھتے ہیں۔ یہ مطالعہ بہت نقصان دہ اور تباہ کن ہوتا ہے۔ جسمانی و روحانی بربادی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ دوری اختیار کرنی چاہیے۔

ز۔ علمی ارتقا: مطالعے کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے علم میں اضافہ ہو۔ ہم کائنات کے الٹ پھیر کو سمجھ سکیں۔ معاملات کی تہ تک پہنچ سکیں۔ حقائق کو جان سکیں۔ اپنی فکر کی تشکیل کرسکیں۔ روح کو مفید غذا پہنچا سکیں۔ ذہن و دماغ کو روشن کرسکیں۔ خود کو سنوار سکیں اور دوسروں کو سنوارنے کی فکر کرسکیں۔ مطالعے کا یہ مقصد سب سے اعلیٰ، سب سے نفع بخش اور سب سے اچھا ہے۔ ہر انسان کے سامنے مطالعے کے وقت یہی مقصد رہنا چاہیے۔ تبھی وہ کتاب اور علم کی حقیقت سمجھ سکے گا۔ کائنات کو سمجھ سکے گا۔ دنیا کے آغاز و انجام اور اس کی حقیقت کو جان سکے گا۔ اپنے وجود کے مقصد سے واقف ہوسکے گا اور انسانیت کے لیے مفید بن سکے گا۔ دنیا میں جتنے عظیم لوگ گزرے ہیں، سب اسی مقصد سے مطالعہ کرتے تھے اور مستقبل میں جو بھی عظیم بننا چاہتا ہے، اُسے بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مطالعے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ یہی مطالعہ انسان کو حیاتِ جاوداں عطا کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں سرخ روئی کا ضامن ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ اس مقصد سے کیا جانے والا مطالعہ ہی حقیقی مطالعہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے، جس کی وجہ سے دنیا میں علم پھیلا، کتابیں عام ہوئیں اور افادے و استفادے کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا۔

2. انتخاب کتاب

دنیا میں روزانہ سیکڑوں ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں جب بازار میں آتی ہیں تو قاری کی نظر سے گزرتی ہیں۔ قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ کون سی کتاب پڑھے؟ اور کون سی نہ پڑھے؟ کس کتاب کو خریدے؟ اور کس کی طرف نظر بھی نہ کرے؟ ایک مستند اندازے کے مطابق دنیا میں ہر سال بائیس لاکھ دس ہزار کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ آخر اتنی بڑی تعداد کہاں جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کتابیں قارئین کی عدالت میں پیش کی جاتی ہیں۔ جس کتاب کو قاری اہمیت دیتا ہے، وہ اہم بن جاتی ہے اور جس کو وہ بے کار قرار دیتا ہے، وہ بے کار بن جاتی ہے۔ قاری ہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کس کتاب کو لمبی زندگی ملنی ہے اور کس کو ایک مرتبہ شائع ہونے کے بعد پھر کبھی شائع نہیں ہونا ہے۔ ایسی سیکڑوں ہزاروں کتابیں ہیں، جو صدیوں لمبی عمر پانے کے باوجود آج بھی قارئین کی دل چسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ غرض یہ کہ صحیح کتاب کا انتخاب ایک بہت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے لیے بہت سمجھ بوجھ کر کتاب منتخب کریں۔ ورنہ ہمارے ذہن و دماغ پر غلط اثر پڑ سکتا ہے، ہماری سوچ غلط رخ اختیار کرسکتی ہے، ہم غلط راہ پر لگ سکتے ہیں اور ہمارا قیمتی وقت فضول اور غلط چیز کو پڑھنے میں ضائع ہوسکتا ہے۔

کسی بھی موضوع پر کوئی کتاب اٹھانے سے پہلے دو باتیں معلوم ہونا ضروری ہے:

الف: پہلی بات یہ کہ ہمیں کتاب کے مصنف کے متعلق معلومات ہو۔ وہ کس ذہن کا آدمی ہے؟ کیا فکر رکھتا ہے؟ اور اس کا اندازِ بیان کیسا ہے؟ کیوں کہ ہر کتاب مصنف کی سوچ کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اگر ہمیں مصنف کی سوچ اور اس کے اندازِ بیان کا علم ہے تو ہم بہ آسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو کتاب ہم اٹھانے جارہے ہیں، وہ کیسی ہوگی۔ کبھی کبھی اس کے برخلاف بھی ہوجاتا ہے اور اچھا مصنف خراب کتاب یا خراب مصنف اچھی کتاب بھی لکھ دیتا ہے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اس لیے مصنف کے متعلق مذکورہ دو باتیں معلوم کرکے ہم کتاب کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر آپ نے بغیر سوچے سمجھے صرف کتاب کا نام دیکھ کر کتاب اٹھالی تو اس بات کا غالب امکان ہے کہ مصنف کی سوچ یا اس کا اندازِ بیان آپ کو پسند نہ آئے اور آپ جلد ہی اس کتاب سے بے زار ہوجائیں۔ اس سے آپ کا وقت، پیسہ اور توانائی سب کچھ ضائع ہوجائے گا۔

ب: دوسری یہ بات معلوم کرنا ضروری ہے کہ جو کتاب ہم اٹھانے جارہے ہیں، وہ اپنے موضوع پر کس درجے کی کتاب ہے؟ ہر موضوع پر مختلف لوگ کتابیں لکھتے ہیں۔ ان میں سے دو چار کتابیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو پڑھ کر ہم اُس موضوع کی باقی کتابوں سے بے نیاز ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ہر فن کے متعلق ایسی ہی منتخب (Sellected) کتابوں کا مطالعہ کریں، تاکہ مختصر وقت میں متعلقہ موضوع کی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرسکیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم ایک موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھنے کے باوجود بھی زیادہ اہم معلومات حاصل نہ کرسکیں۔

انتخاب کے طریقے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص اوپر بیان کی گئی باتوں کا پتا کیسے لگا سکتا ہے؟ جو لوگ زمانے سے مطالعے کے عادی ہیں، انھیں تو اکثر مصنفوں اور مختلف موضوعات کی اہم کتابوں کا علم ہوجاتا ہے۔ لیکن جو شخص یا طالب علم زیادہ واقفیت نہیں رکھتا، وہ ان دونوں باتوں کا پتا کیسے لگائے گا؟

اس سوال کے جواب میں ہم تین آسان طریقے ذکر کررہے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی طریقے کے ذریعے آپ مذکورہ دونوں باتیں معلوم کرسکتے ہیں:

الف۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے کسی استاد یا کسی اور معتبر عالم یا اسکالر سے مسلسل رابطہ رکھیں۔ جب بھی کسی موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا چاہیں، اس سے مشورہ کریں۔ وہ جو کتابیں تجویز کرے، ان ہی کا مطالعہ کریں۔ آپ مختلف علوم کے مختلف ماہرین سے بہ یک وقت بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ہندستانیات کے کسی ماہر کو جانتے ہوں تو اس سے ہندستانیات کی کتابوں کا مشورہ کرلیں اور ادب کے کسی

موضوع کے لیے اس کے کسی واقف کار سے مشورہ کرلیں۔یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کوئی ایسا ہرفن مولا انسان ڈھونڈتے پھریں، جو ہر موضوع پر آپ کی رہ نمائی کرسکے۔

بہ ہر حال کسی ماہر سے مشورہ کرنا سب سے مفید طریقہ ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اس مشورے کے دوران ہمیں بہت سی ایسی باتیں بھی پتا چل جاتی ہیں، جو کسی کتاب میں نہیں ملتیں۔ اس لیے سب سے پہلے کسی صاحب علم سے ہی رابطے اور مشورے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ب۔ مصنف اور کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم کتاب خریدنے یا نکالنے سے پہلے کتاب کی پشت (Back) پر لکھے ہوئے مصنف اور کتاب کے تعارف کو پڑھ لیں۔ یا کتاب کے اندر ابتدائی صفحات میں مصنف اور کتاب کا تعارف کرایا گیا ہوتو، اس کو پڑھ کر مصنف کی فکر اور کتاب کے مقام کا اندازہ لگالیں۔ اس کے بعد ہی کتاب خریدیں یا لائبریری سے نکالیں۔

ج۔ اگر ہمارے رابطے میں نہ تو کوئی اہل علم ہو اور نہ کتاب میں مصنف کا تعارف لکھا ہو تو آج کل ایک آسان طریقہ انٹرنیٹ بھی ہے۔ نیٹ پر ہمیں کسی نہ کسی شکل میں کتاب اور مصنف کا تعارف نظر آہی جاتا ہے۔ کتاب پر کوئی تبصرہ کیا گیا ہو یا مصنف کے بارے میں کسی نے کچھ لکھا ہو، ایسی چیزیں اکثر نیٹ پر مل جاتی ہیں۔ اس لیے آج کل یہ بھی ایک آسان اور مفید طریقہ ہوسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمیں کتاب کے انتخاب میں بہت سمجھ داری دکھانے کی ضرورت ہوگی۔ نہ ہر کتاب پڑھنے کے لائق ہوتی ہے اور نہ ہر مصنف اس قابل ہوتا ہے کہ اُسے پڑھا جائے۔ لہٰذا کوئی بھی کتاب اٹھانے سے پہلے ہمیں مصنف اور کتاب دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مصنف کی فکر اور انداز بیان کیسا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ متعلقہ موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں اس کتاب کا کیا مقام ہے؟ اگر ہم کسی بھی موضوع کی ایک دو اچھی اور مستند کتابوں کا مطالعہ کرلیتے ہیں تو ہزاروں صفحات پڑھنے سے بچ جاتے ہیں اور ہمیں اس موضوع کی دوسری پچاسوں کتابوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

3. کتاب پر ابتدائی نظر

دنیا کے تمام کاموں میں تمہید کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی اسٹیج پر تقریر کے لیے کھڑے ہوکر ہم ضرور کچھ ابتدائی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی مقالہ لکھتے وقت کچھ تمہیدی باتیں بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کشتی یا باکسنگ کے میدان میں اترنے والا پہلوان یا باکسر اکھاڑے میں پہنچ کر کچھ دیر اچھلتا کودتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ مطالعے کا بھی ہونا چاہیے۔ جب ہم کسی کتاب کا مطالعہ شروع کریں تو پہلے ہمیں ابتدائی چیزیں پڑھنی چاہییں۔

ابتدائی چیزوں کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے مصنف کتاب کی لکھی ہوئی تحریر اور اس کے بعد اگر دوسرے کسی شخص کی تحریر بھی ہو تو اُسے پڑھ لینا چاہیے۔ عام طور پر مصنف کتاب اپنے مقدمے میں کتاب لکھنے کا مقصد، اس موضوع پر دوسری کتابوں کا تذکرہ اور اپنی کتاب کے ابواب وغیرہ کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں مختصر طور پر کتاب کی معلومات حاصل ہوجاتی ہے اور ہم کتاب کو پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بغیر مقدمہ پڑھے ہمارے ذہن میں بہت سارے سوالات باقی رہ جاتے ہیں اور ہم یک سوئی کے ساتھ کتاب کا مطالعہ نہیں کرپاتے۔ مثال کے طور پر آپ سیرت نبوی کے موضوع پر علامہ شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النبی'' کی پہلی جلد اٹھائیں اور اُسے پڑھنا شروع کردیں۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال گردش کرتا رہے گا کہ جب سیرت نبوی کے موضوع پر ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا تو یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ لیکن اگر آپ اصل کتاب پڑھنے سے پہلے اس کا مقدمہ پڑھ لیں تو ہر بات واضح ہوجائے گی۔ آپ کے ذہن میں کوئی سوال باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے اصل کتاب پڑھنے سے پہلے تمہید کے طور پر کچھ صفحات کا مطالعہ اور کچھ صفحات پر طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔

تمہید کے طور پر ان چیزوں کو دیکھنا چاہیے:

الف۔ کتاب کا سرورق (Title) اور لوح (Inner Title): کبھی کبھی کتاب کا سرورق نہ دیکھنے سے بڑا دھوکا ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات کتاب کے نام کے نیچے کوئی ایسی مختصر عبارت لکھ دی جاتی ہے، جس سے کتاب کے موضوع اور اس کے مواد کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

ب۔ تفصیلات کا صفحہ: عام طور پر کتاب کے صفحہ نمبر 2 / پر کتاب کی تفصیلات دی جاتی ہیں۔ کتاب کا نام، مصنف کا نام، سال اشاعت، تعداد، قیمت اور ناشر وغیرہ۔ اکثر پڑھنے والے اس صفحے کو اہمیت نہیں دیتے، حالاں کہ اس صفحے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو کتاب ہم پڑھنے جارہے ہوتے ہیں، وہ کسی کا ترجمہ ہوتا ہے۔ لیکن مترجم کا نام سرورق کے بجائے تفصیلات والے صفحے پر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کتاب پہلی مرتبہ کب چھپی تھی؟ اور اب تک اس کے کتنے اڈیشن شائع ہوئے؟ ان چیزوں کی تفصیلات بھی اسی صفحے پر دی جاتی ہیں، جس کو پڑھ کر ہمیں کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اسی صفحے پر یہ تفصیل بھی لکھ دی جاتی ہے کہ جو تصویر سرورق پر لگی ہے، وہ کس موقعے کی ہے؟

ج۔ مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ: ہر مصنف کتاب شروع کرنے سے پہلے ایک مقدمہ لکھتا ہے۔ اس کا عنوان مقدمہ، پیش لفظ، دیباچہ، سخنے چند، سخن گفتنی وغیرہ ہوتا ہے۔ عنوان چاہے کچھ بھی ہو، لیکن اس تحریر کو پڑھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کیوں لکھی؟ کتاب لکھنے میں کیا طریقہ اختیار کیا؟ کہاں کہاں سے استفادہ کیا؟ دوسری کتابیں ہونے کے باوجود اس کتاب کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اور اس نے اس کتاب کی ترتیب کیا رکھی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس لیے اصل کتاب پڑھنے سے پہلے ان کا جاننا بہت ضروری اور بہت مفید ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب 'خطبات بھاول پور' اٹھائیں۔ کتاب کے نام سے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کتاب کا مرکزی موضوع کیا ہے؟ فہرست دیکھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسلامیات کے مختلف موضوعات پر الگ الگ خطبات موجود ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب یہ الگ الگ موضوعات کے خطبات ہیں تو سب کو ایک جگہ کیوں جمع کیا گیا ہے؟ لیکن جب آپ کتاب کے مقدمے میں یہ پڑھیں گے کہ یہ کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بھاول پور میں دیے تھے، تو آپ کا یہ اعتراض ختم ہوجائے گا اور مختلف موضوعات کے خطبات کو ایک ہی کتاب میں جمع کرنے کا مقصد بھی سمجھ میں آجائے گا۔

یہ تین چیزیں وہ ہیں، جن کو بہت دھیان سے دیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ ان کے علاوہ دو چیزیں اور ہیں، جن کو پڑھنا مفید ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کتاب کی فہرست اور دوسری ہے وہ تحریر جو مصنف کتاب کسی دوسرے سے لکھواتا ہے۔ اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے ان دونوں چیزوں کو پڑھنا بھی بہت مفید ہوتا ہے۔

■

Shah Ajmal Farooq Nadwi
G-5/A, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:9654058854

واثق الخیر

اردو ناولوں میں عورتوں کی ترجمانی

زمانہ قدیم سے ہی عورت پدرسری سماج میں مسائل سے جوجھ رہی ہے۔ ہر دور میں معاشرے نے اپنے اپنے مزاج، ذوق کی مناسبت سے عورت کو قبول کیا ہے اور اسے نظرانداز بھی کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سماج کی تشکیل اور بقا میں عورت مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ مرد کے ساتھ مل کر وہ بنی نوع انسان کو منزل بہ منزل آگے کی طرف بڑھاتی رہی ہے۔ ماقبل تاریخ کا دور ہو یا تاریخی دور عورت نے ہر دور میں انسانیت کی تشکیل اور تعمیر وترقی میں بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ اس کا رول تو نمایاں ہے لیکن کیا اس کی حیثیت بھی نمایاں ہے اور اسے وہ درجہ دیا گیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ دیکھیے آخر کیا وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بھی عورت اپنے تشخص کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ معاشرے کی بے حسی کا شکار ہے۔ اس کے خلاف جرائم کی تعداد میں اضافہ ہی ہورہا ہے۔ آئے دن اخباروں اور رسالوں میں اس نوع کے واقعات نظر سے گزرتے ہیں۔ کہیں بچیاں مرد کی ہوس کا شکار ہورہی ہیں تو کہیں شوہر کے ذریعہ بیوی پر ظلم ہورہا ہے۔ ایسے وقت میں عورت ذات جس ذہنی کرب سے گزرتی ہے اس کو اردو ناول نگاروں نے بیان کیا ہے۔

اردو ناولوں میں ابتدا سے ہی عورتوں کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ جن میں ازدواجی تعلقات کی پیچیدگیوں سے لے کر روزمرہ کی زندگی کے احوال سبھی کچھ شامل ہیں۔ جدید تعلیم کے اثرات کے سبب انسانی سماج میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا عکس بھی ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ تہذیبی ٹکراؤ اور جدید طرز زندگی کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور گھریلو حادثات وواقعات اور خاتون خانہ کی حقیقی روداد بھی ناول کا اہم حصہ ہے۔

ایک عورت کیا سوچتی ہے، کیا محسوس کرتی ہے، اس کی کیا خواہش ہے، کون سے عوامل اس کی شخصیت کی تکمیل یا تخریب کا سبب بنتے ہیں۔ ان نکات پر سرسید تحریک کے زیر اثر ان کے رفقاء نے توجہ دی۔ سرسید کے رفقاء عورتوں کو سماج کی تعمیر وترقی میں ایک اہم رکن سمجھتے تھے۔ سرسید کے اہم رفیق پہلے ناول نگار نذیر احمد کو بھی اس کا احساس تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے اپنے ناولوں کا موضوع ہندوستانی سماج کو بنایا۔ انہوں نے ادب میں مافوق الفطرت عناصر جن، بھوت، پریت اور طلسم کے غیر انسانی عناصر کو ترک کرکے اپنے سماج کے عام انسانوں کے روزمرہ کو بیان کیا ہے۔

نذیر احمد کو اپنے ہم عصروں میں عورتوں کی اصلاح کی ضرورت اور اہمیت کا شعور سب سے زیادہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ دور کی اخلاقی پستی اور معاشرتی انحطاط کے اثر سے طبقہ نسواں بھی محفوظ نہیں ہے اس لیے انہوں نے طبقہ نسواں کی پستی کے اسباب اور اس کے مسائل کو خاص طور سے اپنے ناولوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں توجہ کا مرکز متوسط طبقے کی عورتوں کے مسائل ہیں۔ عورتوں کے مسائل کی عکاسی کرکے ان کی پستی کے اسباب کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں جاگیردارانہ نظام کی ستائی ہوئی عورت کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ کیونکہ اس نظام میں عورت کو مرد اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ نذیر احمد نے عورت کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ ان کی آپسی رنجشوں، اخلاقی پستی، جہالت، ضعیف الاعتقادی، رسم و رواج کی پابندی، مذہب سے بے گانگی اور اسی قسم کی دوسری برائیوں پر، جن کی وجہ سے اچھی مائیں اور سلیقہ شعار بیویاں نہیں بن سکتی تھیں، بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس طبقے کی معاشرتی زبوں حالی کا انھیں شدید احساس تھا۔ ناول 'مراۃ العروس' میں عورتوں کی سماجی بے وقعتی پر روشنی ڈالی ہے۔ نذیر احمد کو جاگیردارانہ عہد کی ان مظلوم عورتوں سے شدید ہمدردی تھی جو مردوں کی ملکیت بن کر رہ گئی تھیں اور جنھیں صرف اس لیے جاہل رکھا جاتا تھا کہ مردوں سے مساویانہ حقوق کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔ وہ عورت معاشی اعتبار سے مردوں کی محتاج تھی اور کسمپرسی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ سماجی زندگی میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔

عبدالحلیم شرر نے زیادہ تر تاریخی ناول لکھے ہیں۔ لیکن ان کے ناولوں میں بھی عورتوں کے مسائل کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے ناولوں کی عورتیں بہادر بھی ہیں اور مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں شریک کار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے معاشرتی ناول میں عورتوں کی کم تر حیثیت اور پستی کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے پردہ کی سخت گیری کی مخالفت اسلام کی روشنی میں کی ہے۔ ان کا ناول 'حسن کا ڈاکو' میں عورتوں کی تعلیم کی پرزور حمایت ملتی ہے۔ ناول کا نسوانی کردار 'مہ لقا' کو جدید تعلیم سے آراستہ دکھایا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ کالج کے دوسرے لڑکے مہ لقا کی طرح انگریزی نہیں بول

سکتے۔ ناول 'خوفناک محبت' میں جاگیردارانہ معاشرت میں پلی ہوئی عورت کا کردار پیش کر کے شرر نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ جاہل اور ناتربیت یافتہ عورتیں گھریلو نظام اور معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتی ہیں۔ شرر خوشگوار ازدواجی زندگی کے لیے عورتوں کی تعلیم کو ضروری بتاتے ہیں۔ اسی طرح ناول 'مینا بازار' میں روایتی پردے کی سخت مخالفت کی ہے۔ ناول 'دلچسپ' بھی عورتوں کے مسائل کے حوالے سے اہم ہے۔ اس میں بیوہ کی شادی کی وکالت کی گئی ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناولوں میں عموماً لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کے اسباب وعلل کو پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے عورتوں کی زندگی کے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں اگر ایک طرف مردوں کی جاگیردارانہ ذہنیت اور عیش کوشی کی ملامت کی ہے تو دوسری طرف بیگمات کے اعلی اقدار، روایات اور عفت و پاکدامنی کا ذکر بھی کیا ہے۔ سرشار بیگمات کی شوہر پرستی، وفاداری، شرافت اور وضعداری کا اعتراف کرتے ہیں۔ 'سیر کہسار' کی نواب نادر جہاں بیگم اور 'جام سرشار' کے نواب امین الدین حیدر کی بیوی ان تمام شریفانہ صفات کا مجموعہ ہیں جو بیگمات کے کردار کا خاصہ تھیں۔ بیگمات کی یہ نیک نفسی اور انکساری سرشار کو بہت متاثر کرتی ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نازیبا حرکات کے باوجود وقت پڑنے پر سب کچھ ان پر نثار کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی سرشار بیگمات کی اعلی صفات کے بدلے امرا کی عیاشانہ زندگی کی ملامت کرتے ہیں۔ سرشار عورتوں میں تعلیم کے حامی نظر آتے ہیں۔ تعلیم کو عورتوں کے لیے مشعل راہ بتایا ہے۔ وہ تعلیم نسواں پر جگہ جگہ زور دیتے ہیں لیکن ان کا نظریہ تہذیبی قدروں تک ہی محدود رہتا ہے۔ وہ تعلیم کے ذریعہ نوکری حاصل کرنے کی رائے نہیں دیتے بلکہ تعلیم سے گھریلو زندگی اور بچوں کی تربیت میں عمدگی اور ہنر لانے کی بات کرتے ہیں۔

راشدالخیری نے بھی اپنے ناولوں میں عورت پر سماج میں جن مظالم اور ناانصافیوں کو روا رکھا جاتا تھا اس کی دردناک عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ خانگی پیچیدگیاں اور زن وشوہر کے تعلقات کو ناولوں میں نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ ان کا ناول 'شام زندگی' عورتوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سماج کو بہتر تبھی بنایا جاسکتا ہے جب عورتیں تعلیم سے آراستہ ہوں۔ وہ یہ تصور کرتے تھے کہ اس دور میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا اس کے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کے لیے انھوں نے کوشش بھی کی کہ تعلیم یافتہ مسلمان عورتوں کو مدرسہ نسواں قائم کرنا چاہیے۔ تاکہ مسلم بچیاں اپنے مذہب اور تہذیب سے بیگانہ نہ رہیں۔ عورتوں پر مغربی تعلیم کے غلط اثرات مرتب نہ ہو جائیں اس کے لیے وہ خالص مشرقی اور دینی تعلیم کی ترغیب دیتے ہیں۔ ناول 'صبح زندگی' میں نئی نسل کو اپنی اعلی اقدار کی پاسداری کا خیال رکھتے ہوئے ایسی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جو ان کے لیے بہتر ہو۔

مرزا ہادی رسوا کے ناولوں میں بھی متوسط طبقے کی عورتوں کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ اس طبقے کو رسوا شرفا کا طبقہ بھی کہتے ہیں۔ اپنے گردوپیش انھوں نے جو ماحول پایا اس کی پستی اور خصوصاً شریف گھرانوں میں جو انتشار تھا اس کو بیان کیا ہے۔ اس انتشار کی ذمہ داری مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی عائد کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عورتیں جہالت کی وجہ سے اپنے فرائض منصبی سے ناواقف اور اچھے خیالات کے اکتساب سے محروم رہتی ہیں۔ پس پردہ رسوا عورتوں کو تعلیم کی دعوت دے رہے ہیں۔ رسوا اپنی مثالی عورت کے لیے جس چیز کی ضرورت خیال کرتے ہیں وہ ہے تعلیم۔ کیوں کہ جدید دور میں انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہے کہ شرفا کی خانگی زندگی میں انتشار کی بنیادی وجہ عورتوں کی جہالت ہے۔ وہ اس سے اتفاق رکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں عورتوں کو تعلیم سے محروم کر کے گھروں کی چاردیواری میں مقید رکھنا قرین مصلحت نہ ہوگا۔ 'اختری بیگم' میں ہرمزی کے کردار کے ذریعہ اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم سے عورتوں کے تجربات وسیع ہوں گے۔ زمانے کے حالات کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور ضرورت پڑنے پر وہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکیں گے۔ تعلیم نسواں کے ساتھ ہی وہ شرافت کی حدوں میں رہ کر آزادی نسواں کے قائل ہیں۔ انھوں نے ایسی پابندیوں کو جو عورتوں میں بے جا شرم اور جھجک پیدا کرتی ہیں اسے بے ہودہ خیالات سے تعبیر کیا ہے۔

عورتوں کے مسائل کے نقطۂ نظر سے اگر پریم چند کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں عورتوں کا درد زیادہ واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ ان ناولوں میں عورتوں کی قابل رحم اور دردناک زندگی بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عورتوں پر ہونے والے ظلم وزیادتی کے خلاف ہر محاذ پر احتجاج ملتا ہے۔ دراصل پریم چند مساوات، انسانیت، شرافت اور انصاف کے قائل تھے۔ وہ سماج کے ہر طبقے کو زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عورت پہلے خودکفیل بنے۔ کیونکہ جب تک عورت معاشی حیثیت سے مرد ذات کی محتاج رہے گی تب تک وہ دوسرے درجے کی مخلوق سمجھی جاتی رہے گی۔ پریم چند کے ناولوں میں عورت کے تمام ناگفتہ حالات وکوائف کا نقشہ ملتا ہے۔ وہ شادی بیاہ کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کی آزادی رائے کے قائل نظر آتے ہیں بلکہ وہ اس بات کی شدید حمایت کرتے تھے کہ شادی سے قبل عورت اور مرد کو تبادلہ خیال کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ ان کے نزدیک شادی ایک معاہدہ ہے جس کی کامیابی کا انحصار فریقین کی رضامندی پر ہے۔ پریم چند کے ابتدائی ناول زیادہ تر سماج کے مسائل یعنی بیوہ، طوائف، تعلیم اور تعدد ازدواج وغیرہ کے مسئلے پر مبنی ہے اور ان میں اصلاح کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے ناولوں میں انھوں نے عورت کو ایک سیاسی اور سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی فعال دکھایا ہے۔ ان سے قبل کسی میں بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ عورتوں کو پسماندگی سے نکالنے کی کوشش کرے اور انھیں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرے۔ پریم چند کے ناولوں میں 'چوگان ہستی'، 'غبن' اور 'میدان عمل' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جن میں عورتوں کے احساس وجذبات پوری طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی بہتر زندگی کی حمایت کی ہے۔ ان کے دونوں ناول 'زہرہ' اور 'سرگزشت ہاجرہ' میں عورتوں کی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ناول 'زہرہ' میں امور خانہ داری اور سماج کی فلاح و بہبود کے لیے عورتوں کو تعلیم سے آراستہ ہونے کی تائید ملتی ہے۔ اسی طرح 'سرگزشت ہاجرہ' میں امور خانہ داری، بچوں کی تعلیم وتربیت اور شوہر کی مزاج شناسی کے رموز سے عورتوں کو باخبر رہنے کی صلاح ملتی ہے۔ وہ عورتوں کو آگے بڑھنے کے لیے مشرقی تہذیب کے ساتھ مغربی تہذیب کے ہنر سیکھنے کی بات کرتی ہیں۔ اور عورتوں کو ان سے مزین وآراستہ کر کے اپنی زندگی کو سنوارنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ عورت ذات کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے وہ چاہتی ہیں کہ عورت پر زور زبردستی نہ کی جائے اور اسے اپنی مرضی سے جینے کا حق دیا جائے۔

نذر سجاد حیدر کا ناول 'جانباز' میں ہیروئن مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد آزادی میں شامل ہوتی ہے۔ جس سے ان کے اس شعور کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ نہ صرف آزادی نسواں اور مساوات کی خالی خولی باتیں کرتے ہیں بلکہ عملی طور پر اسے برتنا بھی چاہتے ہیں۔

قرۃالعین حیدر اپنے ناولوں میں اعلی مسلم سماج کی

کہانی بیان کرتی ہیں جس میں عورتوں کے مسائل اور ان کا دکھ درد بھی سامنے آتا ہے۔ کیونکہ وہ جب بھی سماج کی داستان بیان کرتی ہیں تو اس میں بسنے والے نسوانی کردار کے مسائل، اس کی لاچاری و مجبوری اور اس پر ہونے والے جبر و استحصال کو بھی پوری طرح سامنے لاتی ہیں۔ ویسے وہ براہ راست عورت کو موضوع بنا کر ناول کی تخلیق نہیں کرتی ہیں لیکن نسوانی کردار کی وجہ سے عورتوں کے مسائل اس میں در آئے ہیں۔ انھوں نے کئی ناول لکھے جن میں نسوانی کردار واضح طور پر مرکزی حیثیت اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'آگ کا دریا' کی چمپا ہو یا 'جلاوطن' کی کنول کنواری، 'چائے کے باغ' کی راحت کاشانی ہو یا 'دلربا' کی گلنار، 'ہاؤسنگ سوسائٹی' کی ثریا حسین ہو یا 'سیتا ہرن' کی سیتا، 'آخری شب کے ہم سفر' کی دیپالی سرکار ہو یا 'میرے بھی صنم خانے' کی رخشندہ جو جاندار کردار ہونے کے باوجود مردوں کے جبر و استحصال سے بچ نہیں پاتی ہیں۔ 'آخری شب کے ہم سفر' کی دیپالی سرکار عورتوں کے احساسات و جذبات کی نمائندہ بن کر ابھرتی ہے۔ وہ سماج کی بندشوں کی مخالفت اور مردانہ بالادستی والے معاشرے کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے جذبات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ بلکہ ان کی تخلیقات کا موضوع اکثر لڑکیوں کے روزمرہ کے حالات ہوتے ہیں جسے وہ بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ عورت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انھوں نے اس کی جبلت، رہن سہن اور شعوری کیفیتوں کا جائزہ لیا ہے۔ ٹیڑھی لکیر، ضدی، معصومہ اور دل کی دنیا وغیرہ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ خصوصاً ان کا ناول 'ٹیڑھی لکیر' کا مرکز اور محور ہی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک حساس لڑکی شمشاد عرف شمن کی زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے تجربات ہیں۔ شمن ہجوم میں رہ کر بھی تنہائی کے کرب سے ہمکنار رہتی ہے اور اپنے وجود کو بے موقع کہہ کر کوستی رہتی ہے۔ انھوں نے ناول میں عمر کے ساتھ بدلتے ہوئے شمن کے کردار میں عورت کی نفسیاتی تبدیلیوں کو پیش کیا ہے۔ ناول کا کردار 'شمن' کے ذریعہ عورتوں کے جذبات پوری طرح اجاگر ہوتے ہیں۔ ایسے سماج جس میں لڑکی اپنے ماں باپ اور بڑوں کی بات کو من و عن قبول کر لیتی ہے خاص طور پر شادی بیاہ کے مسئلے پر جہاں لڑکیوں کو اپنے انتخاب کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے ایسے میں عصمت نے 'شمن' کے ذریعہ زمانے کی روایت کو توڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

جیلانی بانو کا ناول 'ایوان غزل' حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی المناک داستان ہے۔ اس میں جاگیردارانہ سماج میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ساتھ ہی انگریزوں کی آمد کی وجہ سے اس سماج کی عورتوں پر پڑنے والے مغربی اثرات اور اس طبقے کی عورتوں کی دوہری زندگی کے الجھے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ناول میں ایک طرف روایتی جاگیردارانہ معاشرت میں عورت کی حیثیت اور اس کے کرب کی تصویر ملتی ہے تو دوسری طرف انگریز سامراجیت کے طفیل میں مغربی اقدار اور جدید طرز زندگی نے جو اثرات اس طبقے کی عورتوں پر ڈالے تھے اور اس کے پس پردہ ان کے استحصال کی جو نئی بساط پھیلی ہوئی تھی اس کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ناول 'ایوان غزل' میں 'کرانتی' عورت کے جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کردار بے حد جاندار اور توانا ہے۔ وہ حالات سے نہیں گھبراتی ہے بلکہ ان حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور سب کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور اپنا حق لینے میں پیچھے نہیں رہتی ہے بلکہ وہ اپنا حق لینے کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔

آمنہ ابوالحسن کا ناول 'پلس مائنس' میں عورتوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی پوری طرح ہوئی ہے۔ وہ اپنے ناول کے ذریعہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی مختلف شعبوں میں کام کرنے کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔ ناول کا کردار یاسمین کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے لیکن گھر کے سارے لوگ اس کے کالج جانے کو منع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے۔ آمنہ ابوالحسن نے ناول کے ذریعہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے۔

قاضی عبدالغفار کا ناول 'لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری' میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ حالانکہ طوائف کو ناول میں مرکزیت دی گئی ہے لیکن ناول نگار نے طوائف کے ذریعہ عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے مردوں کے غیر منصفانہ رویوں اور دوہرے معیار پر گہرا طنز کیا ہے۔ ان کے نسوانی کردار میں اس قدر جرأت و بے باکی ہے کہ وہ برجستہ سماج پر وار کرتی ہے۔ فرسودہ سماج کے ان ٹھیکے داروں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے جس کے ہاتھوں عورت مستقل ظلم و جبر اور استحصال کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ان کا نسوانی کردار گرچہ طوائف کی زندگی گزارتا ہے لیکن ان کے سینے میں بھی ایک عام عورت کا دل دھڑکتا ہے۔ لیلیٰ نہ صرف اپنی مظلومیت کی داستان سناتی ہے بلکہ مرد اساس سماج پر تیکھا وار بھی کرتی ہے اور کہتی ہے کہ کس طرح گذشتہ پانچ ہزار برس میں خدا کی مخلوق کے نصف حصے کو دوسرے نصف نے اپنا غلام بنایا۔

عزیز احمد کے ناولوں میں بھی عورتوں کے مسائل پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کئی ناول لکھے جس میں کسی نہ کسی طور پر عورت ذات کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناول 'ہوس' میں عورتوں کی فطری آزادی کی حمایت کی ہے۔ اگر عورتوں کو مناسب آزادی نہ دی گئی تو ان کے بھٹکنے کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔ ناول 'مرمر اور خون' میں بھی عزیز احمد نے لڑکیوں پر بے جا پابندی کے مضر اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی مخالفت کی ہے۔ شادی سے قبل دوشیزگی کے خاتمے پر ایک لڑکی کو جس صدمے سے گزرنا پڑتا ہے اس کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس ناول میں عورت کے اسی نفسیاتی ردعمل کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اگر اس کے لیے یہ سب کچھ غیر معمولی اہمیت کا حامل نہ ہوتا تو ناول کا کردار عذرا اس نفسیاتی دھچکے سے بچ سکتی تھی اور اپنے اوپر قابو پا کر وہ اس لمحے کو ٹال سکتی تھی۔ لیکن تجسس اور ناواقفیت نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا اور نتیجے کے طور پر عذرا اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور ایک نفسیاتی مسئلے کا شکار ہوئی۔ عزیز احمد عورتوں کے جذبات کی حمایت کرتے ہوئے مرد اساس سماج کی بے جا پابندیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ عورتوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں عورت اور مرد کو برابر کا حصہ دار مانا گیا ہے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے اکثر ناولوں میں عورت کے جذباتی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کو موضوع بنا کر عورت ذات کے درد اور ان پر ہونے والے ظلم کو ظاہر کیا ہے۔ ان کی تخلیقات میں عورتیں جسم فروش تو ہیں مگر ضمیر فروش نہیں۔ ان کی عورتیں طوائف تو ہیں لیکن ماں کا دل رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں ایسی کئی شریف عورتوں کی کہانی بھی ہے جو مردوں کی شہوت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ منٹو اپنے ناولوں کے ذریعہ عورتوں کی خوب حمایت کرتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کا ناول 'ایک چادر میلی سی' میں 'رانو' کے کردار میں ماں اور بیوی کی صورت میں ہندوستانی عورت کی فطرت اور اس کی نفسیات کے تمام پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ناول کا کردار 'رانو' اپنے شوہر، دیور، سسر، ساس اور بچوں کے درمیان کٹھ پتلی کی مانند ہے۔ رانو اپنے جذبۂ دردمندی، ممتا، نسوانی فطرت اور ایثار و قربانی کے ذریعے ان کے درمیان ایک توازن قائم

رکھتی ہے۔ رانو پنجاب کے دیہات کی معصوم اور تند خو عورت ہے وہ سماج کی باریکیوں کا شعور تو نہیں رکھتی لیکن اپنے ہر معاملے کو بہت جلدی سمجھ لیتی ہے۔ وہ غریب یکہ والے کی بیوی ہے جب اس کا شوہر شراب کی بوتل کے ساتھ گھر آتا ہے تو وہ اس سے لڑتی ہے اسے نوچتی ہے اور دانتوں سے کاٹ بھی لیتی ہے اور پھر خود ہی مار کھا کر خاموش بھی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے مرد کو قابو میں کرنے کے لیے بابا ہری داس سے ٹونا بھی کراتی ہے۔ رانو سسرال کی تلخیوں کو سینے میں چھپا لیتی ہے لیکن محبتوں اور رشتوں کی مٹھاس اس کا انتظار بھی کرتی ہے۔ وہ بہت خوددار بھی ہے مرجانا بہتر سمجھتی ہے لیکن رحم کی بھیک اس کو برداشت نہیں۔ شرابی شوہر جب اس کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے تو اس کو اقتصادی غلامی کا شدید احساس ہوتا ہے لیکن وہ ہار نہیں مانتی ہے بلکہ عزم کرتی ہے۔ تمام طرح کے دکھوں کے باوجود زندگی جینا چاہتی ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد سماجی ریتی رواج کے مطابق اسے اپنے اس دیور سے شادی کرنی پڑتی ہے جس کی خود اس نے پرورش کی ہے۔ ناگواری کے باوجود اس امتحان کا وہ سامنا کرتی ہے۔ لیکن شادی کے بعد اس کو بیوی کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہوتا ہے تو وہ اس توہین کو برداشت نہیں کرتی ہے اور شوہر کو اپنے قابو میں کر کے ہی دم لیتی ہے۔ بیدی کے اس ناول میں عورت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو عورت منوانا چاہتی ہے دیوی نہیں۔

حیات اللہ انصاری کا ناول 'لہو کے پھول' کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں عورتوں کے مسائل پر بھی گہری نظر پڑتی ہے۔ ناول نگار نے ازدواجی اور سماجی مسائل کو اٹھایا ہے۔ اس مرد اساس سماج میں عورت کا مقصد صرف تخلیق ہے اور جب وہ اس مقصد میں ناکامیاب ہوتی نظر آتی ہے تو اس کا وجود بے معنی لگتا ہے۔ خاوند اور دیگر سسرال والے اس کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کے بجائے اسے طعنے دینے لگتے ہیں اور انجام کار وہ خاوند کے ذریعہ ٹھکرا دی جاتی ہے۔ اس کا مستقبل بالکل تاریک ہو جاتا ہے۔ دوسری شادی بھی ممکن نہیں کیونکہ ہر آدمی جو گھر بسائے گا وہ بچوں کی بھی خواہش کرے گا۔ اس لیے ایسی عورت کو اپنی زندگی بالکل ویران اور بے مقصد نظر آنے لگتی ہے۔ اس طرح کے مسائل 'رام وتی' کے کردار میں ملتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عورت کے احساس اور کرب کو بیان کرتی ہے جسے مرد اساس سماج نے صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ وہ نسل کی افزائش نہیں کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک عورت کو اپنی پوری زندگی فضول اور بے مقصد نظر آنے لگتی ہے۔

ناول میں رجنی کا کردار ایسے ہی مسائل سے گھرا ہوا ہے۔ جس کو شوہر نے اسے شک کی بنیاد پر الگ کر دیا اور پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ جبکہ اس وقت وہ حاملہ ہوتی ہے۔ مرد بہت آسانی سے عورت کو بدکردار کہہ کر ہر طرح کی ذمہ داری سے آزاد کر لیتا ہے۔ بچوں کی خاطر عورت کو بے شرم بن کر بازار میں نکلنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک شریف عورت سے ایک بازارو عورت بن جاتی ہے۔

کرشن چندر کا ناول 'شکست' میں بھی عورتوں کے مسائل بخوبی نظر آتے ہیں۔ اس کا کردار 'ونتی' کے ذریعے ہندوستان کی دیہاتی عورت کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے اور ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت بڑی حد تک واضح صورت میں سامنے آتی ہے۔ ہندوستان میں رہنے والی عورت کی بے بسی یہ ہے کہ اسے اپنے خیالات کے اظہار کی بھی اجازت نہیں ہے۔ انھوں نے ونتی کے ذریعے روایتی ہندوستانی عورت کے سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔ جہاں آج بھی سماج کے خود غرض اور بے ایمان لوگ عورت کو صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ 'ایک عورت ہزار دیوانے' میں خانہ بدوش سماج میں عورتوں کی حیثیت پر اظہار ملتا ہے۔ اس قبیلے کی روایت کے مطابق عورت بیچنے کی چیز ہے لیکن ناول کا کردار 'لاچی' کسی بھی قیمت پر بکنا نہیں چاہتی ہے۔ وہ صدیوں سے چلی آ رہی روایت کے خلاف بغاوت کرتی نظر آتی ہے۔ 'لاچی' کو کئی بار اس کے والدین بیچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ پورے سماج سے ٹکر لیتی نظر آتی ہے۔ وہ خانہ بدوشی کی زندگی کے بجائے ایک گھر بسانا چاہتی ہے۔ وہ صرف ایک مرد کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ خانہ بدوش سماج میں عورت کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ ناول نگار نے لاچی کے ذریعے خانہ بدوش عورت کی مجبوری، بے بسی اور اس کی خواہشات کو ظاہر کیا ہے۔ جہاں وہ عام عورتوں کی طرح صرف ایک مرد کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ اسے ایک خیمہ نہیں بلکہ گھر چاہیے جہاں وہ خود کو محفوظ خیال کر سکے۔ لاچی اپنی خانہ بدوشی کی زندگی چھوڑ کر سماجی زندگی گزارنے کی تمنا کرتی ہے۔ لاچی ایک شخص سے پیار کرتی ہے اور زندگی بھر صرف اس کے لیے وفادار رہنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کے آگے سماج کی بیڑیاں ہیں، رسم و رواج ہیں، جنھیں توڑنا آسان نہیں۔ لیکن لاچی اپنے پیار کے لیے سب کچھ کر گزرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ اس کے لیے اس کو بڑی بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتی۔ بلکہ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس سے ایک آدمی کا خون بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس جرم میں اسے جیل بھی جانا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ اپنی عزت و عصمت کی اتنی ہی حفاظت کرتی ہے جتنی کہ پہلے کرتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد لاچی کا مختلف عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ عورت صرف خانہ بدوش قبیلے میں ہی نہیں بک رہی ہے بلکہ اس مہذب دنیا کے ہر حصے میں عورت کی خرید و فروخت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ ہر جگہ عورت کا جنسی استحصال ہو رہا ہے۔ کہیں پیسے کی خاطر اور کہیں نام و نمود کی خاطر عورت اپنے آپ کو بیچ رہی ہے یا زبردستی بیچی جا رہی ہیں۔

شموئل احمد کا ناول 'ندی' تانیثیت سے لبریز ہے۔ اس میں ندی استعارہ ہے فطری آزادی، بہاؤ، روانی اور نغمگی کا۔ شموئل احمد انسانی زندگی کو ندی کے رخ پر دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ ہماری استعماری تہذیب نے آدمی کے فطری بہاؤ پر جو باندھ باندھے ہیں، وہ اسے توڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ندی میں ایک اسکالر لڑکی کے کردار کی تخلیق اسی کے پیش نظر کی گئی ہے۔ ندی کی ہیروئن مخالف رخ پر تیرنے کی ہمت رکھنے اور زندگی کی خوشبوؤں، رنگوں، گیتوں اور کہانیوں کو محسوس کر کے جینے والی لڑکی ہے۔ اس کردار کی تعمیر میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ یہ کردار اخلاقی اقدار کے امتناع کا استعارہ نہ بن جائے۔ اس کردار کا مسلسل کرب میں مبتلا رہنا اور مرد اساس سماج سے گاہے گاہے نفرت کا اظہار، قاری کو تخلیق کار کا ہم نوا بنا دینے میں کامیاب ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اور ندی ایک دوسرے کی علامت ہے۔ ندی آزاد پسند عورت کا استعارہ اور تانیثیت کی آزادہ روی کی علامت بھی ہے۔ لڑکی ندی کی طرح آزادی، بہاؤ اور بے رخنہ زندگی چاہتی ہے۔ مگر اس کا شوہر اصولوں اور ضابطوں کی آڑ میں ندی پر پابندی لگانا چاہتا ہے۔ اس روک سے وہ دھیرے دھیرے نفرت کرنے لگتی ہے۔ مگر یہ نفرت اسے انحراف پر نہیں آمادہ کرتی بلکہ ایک ابدی کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

سید محمد اشرف کا ناول 'نمبردار کا نیلا' میں بھی تانیثی فکر دکھائی دیتی ہے۔ حالاں کہ اس ناول میں سرمایہ دار طبقے کی عیاری کھل کر سامنے آتی ہے۔ جو اپنی انا کو قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ نیلا اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ مذہب کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تانیثیت اس وقت حاوی ہوتی ہے جب کمہار کی بیٹی نے اپنے مجرم کو پہچانتے ہوئے ٹھاکر کی بہو سے کہہ دیا کہ اونکار نے اس کی عزت لوٹی ہے۔

پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' میں مرکزی کردار کے ذریعے مرد اجارہ داری کی مختلف شکلوں کے خلاف ایک

ہمہ جہتی مزاحمت ہے۔ اپنے مکان کو حاصل کرنا دراصل عورت ذات کا اپنے وجود کو حاصل کرنا ہے۔ جس کے لیے مرد اساس سماج کسی بھی صورت میں تیار نہیں ہے۔ عورت اس ناول میں ایک کردار بن کر ابھرتی ہے جو موجودہ زمانے میں زندگی کی باگ ڈور سنبھالنے اور مرد کو مشقتوں کے بعد آرام کرنے کا موقع دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نیرا کو احساس ہوتا ہے کہ یہ سماج تھکا تھکا کر، ناامید کرکے، بے چارگی کا احساس دلا کر، قوت، استقلال اور یقین کو مسمار کردیں گے۔ نیرا اس کے لیے اپنے آس پاس کے لوگوں سے مدد نہیں مانگتی ہے۔ بلکہ یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ عورت ذات بھی خود خالق کائنات کی طرح ہی ایک مخلوق ہے جس کے اندر یہ قوت موجود ہے کہ وہ اپنی لامحدود شخصیت کو بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جو ہر چیز پر حاوی ہوسکتی ہے۔

عبدالصمد کے ناول 'دھمک' میں بھی تانیثیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں سندری کے ذریعہ اس تانیثی فکر کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر عورت بدلے کی آگ میں جلنے لگے تو وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی کارستانی پر لعنت ملامت کرتی ہے کہ وقت آنے پر تم لوگ پولیس کے رحم وکرم پر گاؤں والوں کو چھوڑ آئے۔

الیاس احمد گدی نے اپنے ناول 'فائر ایریا' میں ایسی عورت کی زندگی کو پیش کیا ہے جسے سماج بیوہ کا نام دے کر اس کی ذاتی زندگی کو اس قدر گھریلو اور سماجی پابندیوں میں قید کردیتا ہے کہ ایسی عورت کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ اگرچہ یہ ناول کولری میں کام کرنے والے مزدور طبقے کی زندگی کے مسائل اور صنعتی نظام کے استحصال کو بیان کرتا ہے لیکن اس ناول میں نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت صرف جنسی عدم مساوات اور تعصب پرستی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ وہ سماجی طبقہ بندی کی وجہ سے بھی زندگی کی نعمتوں سے دور ہوجاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ناول فائر ایریا کا کردار سہدیو ایک بیوہ پرتی بالا سے شادی کرلیتا ہے لیکن سماج کے شرفا کی طرح مزدور طبقے کے لوگوں میں بھی اس شادی کو مثبت طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس اس کی تنقید کی جاتی ہے۔

علی امام نقوی کا ناول 'تین بتی کے راما' اگرچہ شہری زندگی کی ہولناکی و ہوس ناکی کو دکھاتا ہے لیکن سکّو کے کردار کے ذریعہ تانیثی فکر کو ظاہر کرنے سے نہیں چونکتا ہے۔ سکّو گرچہ ایک کام کرنے والی بائی ہے جو پڑھی لکھی نہیں ہے۔ لیکن شادی کے لیے جب اس سے کہا جاتا ہے تو وہ کچھ وجوہات کو سامنے رکھ کر صاف انکار کردیتی ہے۔ یہ انکار ہی دراصل تانیثی فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ پہلے اس طرح کے فیصلوں کو عورتیں بغیر کسی چوں چرا کے قبول کرلیتی تھیں۔ لیکن شہری زندگی کا اثر کہا جائے یا حالات کے تقاضے اسے انکار کرنے میں کسی طرح کی بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی ہے بلکہ منع کرنے کی وجہ بھی بتادیتی ہے۔

اقبال مجید نے ناول 'نمک' میں ہندوستانی معاشرے میں طبقۂ نسواں کے قید و بند اور بے جا قوانین کی حد بندیوں کو گرفت میں لے کر سماج میں عورت کی حیثیت اور اس کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔

غضنفر کا ناول 'کینچلی' بھی تانیثیت کی فکری اساس کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ ناول کا کردار مینا عورت اور مرد کو الگ الگ خانوں میں منقسم کرنے اور ان کے دائرۂ عمل کو متوازی طور پر متعین کرنے کے خلاف کھڑی نظر آتی ہے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ پھر مرد کو ہی کفالت کی ذمہ داری کیوں دی گئی ہے۔ کیا عورت اس کی ذمہ داری اٹھا نہیں سکتی ہے۔ جب کہ گھریلو کاموں کو عورت بآسانی کرسکتی ہے تو باہر کے کام کیوں نہیں کرسکتی ہے۔

ترنم ریاض نے ناول 'مورتی' تانیثیت کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے۔ پورا ناول تانیثیت کی فکری اساس کے اردگرد ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ مرد اساس سماج کا عورتوں کے ساتھ برتاؤ کو بڑی خوبصورتی سے دکھایا ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات میں بیوی کی خواہشات کا نہ خیال کرنا اور ان کے ذریعے کیے گئے کاموں کو حقیر نظر سے دیکھنا مرد اساس سماج کے لیے ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ ناول کی ہیروئن ملیحہ عورت کی اسٹیریو ٹائپ امیج سے انحراف کی خبر دیتی ہے۔ ملیحہ فن کی ناقدری کے باوجود اپنی حالت پر قانع رہتی ہے اور گھٹ گھٹ کر ذہنی مرض میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ فیصل کی رفاقت بھی تبدیلی کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوتی۔ ملیحہ کے کردار سے واضح ہوتا ہے کہ روایتی شادی کے حدود میں آزادی اور تخلیقیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور اس بندھن میں بندھ کر عورت اپنی ذات کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے۔ اس میں ملیحہ کی اس خواہش کو دکھایا ہے جو دنیا کی ہر عورت چاہتی ہے۔ شادی کے بعد عورت کی سب سے عظیم خواہش ماں بننے کی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی عورت مکمل ہوتی ہے۔ لیکن ملیحہ اس سے محروم رہتی ہے۔ جو اسے مایوس کن مراحل سے گزارتی ہے۔

ثروت خان کا ناول 'اندھیرا پگ' میں بیوہ کی المناک داستان راجستھانی ثقافت کے تناظر میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی دردناک داستان کو ثروت خان نے بیان کیا ہے۔ ناول میں روپی جو بچپن سے ہی تیز طرار اور ذہین لڑکی ہوتی ہے۔ اس کی شادی اس وقت کردی جاتی ہے جب اس کے لڑکپن کے ایام ہوتے ہیں۔ پڑھائی کرنے کی اس کی خواہش ادھوری رہ جاتی ہے۔ ابھی وہ شادی کی خوشیوں کو پوری طرح گزار بھی نہیں پاتی ہے کہ اس کا شوہر اس دنیا سے داغ مفارقت دے جاتا ہے۔ بھری جوانی میں اسے بیوگی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ سماجی رسوم کے مطابق اسے مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے۔ جسے وہ برداشت کرتی ہے اور تھوڑی دھیمی آواز میں کبھی کبھی مخالفت بھی کرتی ہے۔ لیکن جب سسرال کی طرح میکے والے بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں تو ان کا دل پوری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ اور پھر جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بچپن کی سہیلی کو ان کے پتاجی نے زنا بالجبر کے بعد بدنامی کے خوف سے مار ڈالا ہے تو ان کے اندر کا تانیثی احساس بیدار ہوجاتا ہے اور پھر اپنے باپ کو سلاخوں کے پیچھے بھیجوا کر دم لیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں ناول میں بیوہ کا درد تانیثی بغاوت میں بدل جاتا ہے۔ اس ناول میں تانیثی فکر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اردو ناولوں میں ابتدا سے ہی سماج میں پنپنے والے مسائل کو جگہ دی گئی ہے۔ سماج کے ذریعے جب بھی عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس میں عورت کی مظلومیت کا اظہار بھرپور طریقے سے کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ عورت کی آواز کو پوری طرح سے اٹھایا جائے تاکہ ان پر کیے گئے ظلم کی داستان کسی گوشے میں دب کر نہ رہ جائے۔ عورتوں کے ذریعے مرد اساس سماج کے خلاف آواز بلند کرنے کی صورت میں ناول نگاروں نے بھی اس تحریک کی بھرپور حمایت کی۔ جس کی جھلک ہمیں اردو کے ناولوں میں ملتی ہے۔ نصف بیسویں صدی کے بعد عورتوں کی حمایت میں تحریروں میں قوت آئی جو صدی کے اختتام تک باقی رہی اکیسویں صدی میں بھی جو ناول لکھے جارہے ہیں اس میں بھی عورتوں کے ساتھ آنے والے مسائل کو بخوبی اٹھایا گیا ہے۔

■

Dr. Wasiqul Khair
Flate No. 302, Plot No. R 213/1,
Sir Syed Road, Jogabai Extn.,
Jamia Nagar, South East Delhi
98101383617
wasujnu@gmail.com

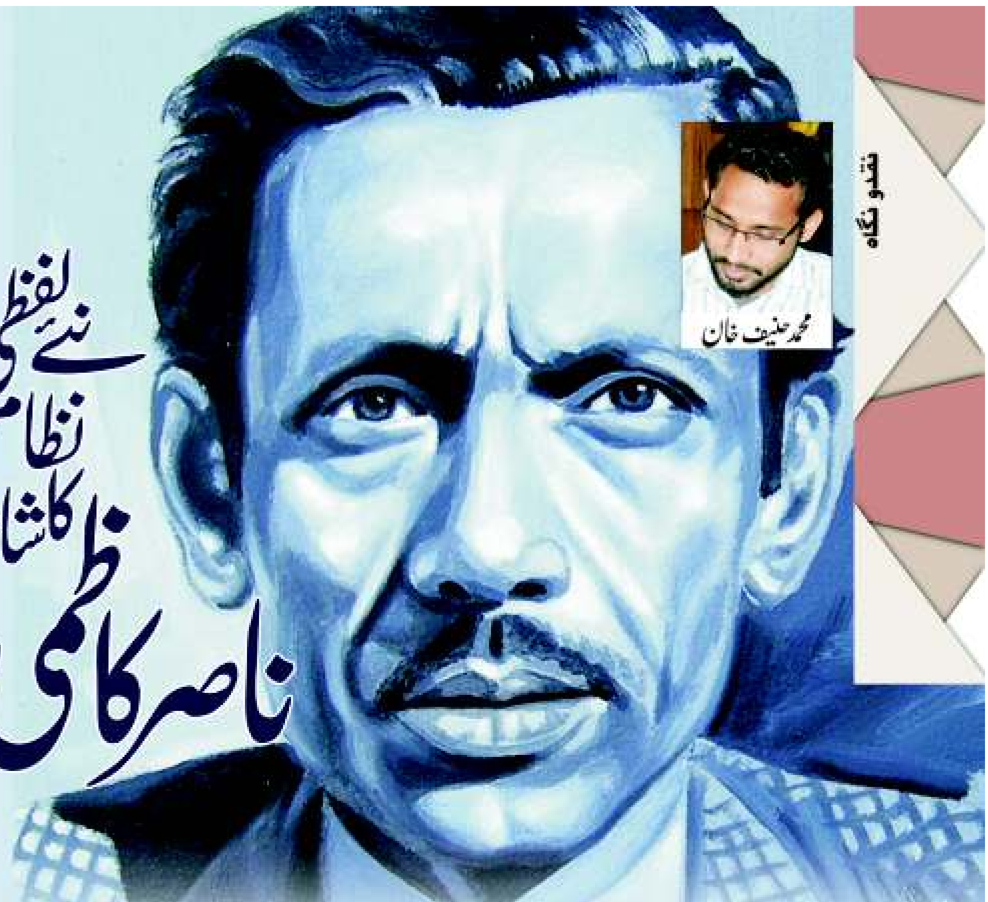

محمد حنیف خان

ناصر کاظمی
نئے لفظی نظام کا شاعر

ادب کی بنیاد لفظی نظام پر ہے، یہ لفظی نظام جتنا چست اور درست ہوگا اسی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا ادب وجود میں آئے گا۔ جب رعایت لفظی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے تو ادبی زبان وجود میں آتی ہے لیکن اگر ان کا محل استعمال، نشست و برخاست مناسب نہ ہو تو وہ ادب نہیں ہوگا اس کے علاوہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لفظی نظام بھی مرور زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، جس کو ادب کی اصطلاح میں 'اسلوب' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر قائم چاند پوری، میر تقی میر، غالب، ذوق، سودا، ناسخ، اقبال اور فراق تک کی شاعری پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو گذران وقت کے ساتھ لفظی نظام میں ہوئی تبدیلی کو بحسن وخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی شاعر کا لفظی نظام اسی وقت نیا تصور کیا جائے گا جب اس نے زمانے سے الگ روش اختیار کرتے ہوئے لفظوں کا استعمال کیا ہو، ناصر کاظمی اس باب میں بالکل منفرد ہیں کیونکہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ترقی پسندی جیسے پر شور دور میں ایک نیا انداز تکلم اختیار کیا۔ ناصر کاظمی کا اپنا لفظی نظام ہے جو دوسرے ہمعصر شعرا سے مختلف ہے، انھوں نے ترقی پسند دور میں غزلیہ شاعری کو ایک نیا لفظی نظام دیا جس نے حال کے رشتے کو ماضی سے جوڑ دیا، انھوں نے اپنے محسوسات کو بڑے سیدھے سادے انداز میں پیش کیا مگر اس میں جدت تھی جو دوسروں سے بالکل مختلف تھی پروفیسر ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

''ناصر کاظمی کے زیر اثر پروان چڑھنے والی فضا کو جدیدیت کے میلان سے وابستہ سمجھا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ اس فضا کا رشتہ ماضی قریب میں فراق سے ہوتا ہوا ماضی بعید میں میر تقی میر سے ملتا تھا''

(کثرت تعبیر ص 99 پروفیسر ابوالکلام قاسمی)

پروفیسر انیس اشفاق نے بھی یہی بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''ناصر کاظمی نے فراق کو وسیلہ بنا کر اس لہجے کے ذریعہ میر کی روایت کی تجدید کی اور غزل کو نیا مزاج عطا کیا''

(غزل کا نیا علامتی نظام ص 127 انیس اشفاق)

ناصر کاظمی کی غزل میں نہ صرف خدائے سخن میر تقی میر کے لہجے اور لفظیات کی بازگشت ہے بلکہ ان کی غزلیہ شاعری کا دھیما لہجہ پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جس طرح میر نے دھیرے دھیرے دلوں کو گرمایا اور دل کو لہو بنا کر آنکھوں سے ٹپکایا۔ اسی طرح ناصر نے خود کو تپایا اور دوسروں کو محسوس کرایا۔ مولانا حسرت موہانی کی شاعری بلاشبہ غزل کی نشاۃ ثانیہ ہے اور ناصر کاظمی اسی نئی غزل کے معمار ہیں حالانکہ نئی غزل کے معماروں میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ کئی اور شعرا ہیں جن میں خلیل الرحمن اعظمی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا میں خلیل الرحمن اعظمی پر بھی میر کا بہت اثر تھا مگر بعد میں انھوں نے خود کو میر کے سحر سے آزاد کر لیا لیکن ناصر کاظمی میر کے زیر اثر لہجے میں غزل کو توانائی بخشتے رہے۔ ناصر کاظمی نے لفظوں کو نئے انداز میں برتا جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے مختلف ہوگئے وہ کہتے ہیں۔

گھر میں اس شعلہ رو کے آتے ہی
روشنی شمعدان سے اتری

اڑ گئے شاخوں سے طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

سفر شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قید مکاں تھا پہلے

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

پھر سلگنے لگا صحرائے خیال
ابر گھر کر کہیں برسا ہو گا

اے گلستان شب کے چشم و چراغ
کبھی اجڑے دلوں کے بن میں آ

دل ٹپکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے رازداں کرے کوئی

ان تمام اشعار میں کوئی نہ کوئی ندرت ہے جس نے ناصر کو دوسروں سے مختلف کیا، جن کی حقیقت ان کے تجزیے سے کھل کر سامنے آئے گی۔ پہلے شعر میں روشنی کا اترنا لفظی اعتبار سے سب سے اہم ہے۔ گھر میں روشنی ہو جانا، کہیں کسی روزن سے روشنی آنا تو کوئی نئی بات نہیں لیکن روشنی کے اترنے میں ضرور نئی بات ہے، اس شعر کی فضا بندی اور روشنی کی پیکر تراشی بالکل نئی ہے ناصر کاظمی نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ شعلہ رو کے آتے ہی روشنی کو شمعدان سے اتاری ہے دراصل جب گھر روشن ہوتا ہے تو وہ ایک دم سے ہو جاتا ہے مگر جب کوئی چیز اترتی ہے تو تدریج پائی جاتی ہے اور وہ دھیرے دھیرے اپنے وجود کو منکشف کرتی ہے۔ یہاں اترنے والی روشنی میں قدوم پایا جاتا ہے اور تدریج اس کی نشانی ہے جو دھیرے دھیرے آئی اور گھر روشن ہو گیا۔ جہاں تک بات شمعدان کی ہے تو ظاہری بات ہے کہ جب گھر میں روشنی کی کرن نظر آئی تو شاعر کی نگاہ سب سے پہلے وہاں رکھی شمعدان کی طرف ہی گئی ہو اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر یہاں شمعدان سے شعلہ رو کو مراد لے رہا ہو۔ دوسرے شعر کی فضا بندی بالکل مختلف ہے انھوں نے ان علامات اور تلازمات کو ایک دوسرے سے دور کر دیا جو ایک دوسرے کے بغیر نامکمل تصور کی جاتی ہیں جن کے بغیر کسی ایک کا بھی وجود کامل نہیں مانا جا سکتا۔ اس شعر میں گلستاں علامت ہے شاخ، طیور، اور ہوا اس کے تلازمات ہیں جن میں قرب پایا جاتا ہے اور ناصر نے لفظ ''زہر'' جو نفرت اور ناپسندیدگی کی علامت ہے کا استعمال کر کے ان میں بعد پیدا کر دیا ہے۔ علامت اور

تلازمات کے قرب میں جو بعد اور تنافر پیدا ہوا ہے وہ زمانے کی دین ہے اور اس کو ناصر نے محسوس کیا ہے۔ تیسرے شعر میں انھوں نے وقت لامحدود کو محدود بتایا ہے 'بے قید مکاں' کہہ کر انھوں نے واضح کر دیا کہ اب اس میں بھی چہار دیواری کا وجود ہو گیا ہے۔ چوتھے شعر میں تو انھوں نے اور عجیب بات کہی ہے، خوشی نہیں وہ وحشت میں چومنے کا عمل انجام دے رہے ہیں، چاند خوشی کی علامت ہے مگر ناصر نے 'چاند' اور 'وحشت' کو یکجا کر کے اس کو بھی ڈر اور خوف کی علامت بنا دیا، دراصل یہاں احساس کی کارفرمائی ہے اور یہ وحشت حقیقت میں گھبراہٹ ہے۔ چاند کو جو نئے معانی ملے وہ ناصر کے نئے لفظی نظام کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ پانچویں شعر میں ناصر نے 'صحرائے خیال' کے سلگنے اور ابر برسنے کی بات کہی ہے۔ دراصل جب کہیں ابر برستا ہے تو اس سے مس ہو کر آنے والی ہواؤں میں خنکی پائی جاتی ہے جس کا اثر محسوس کیا جاتا ہے مگر شاعر کے صحرائے خیال کو جب محسوس ہوتا ہے کہ اس کا محبوب کہیں برس کر رقیبوں کو خوشی پہنچا رہا ہے تو وہ سلگنے لگتے ہیں، اور ان کا سلگنا بھی اس بات کی علامت ہے کہ محبوب خوش باشیوں میں مصروف ہے۔ ناصر نے عاشق اور معشوق کے لیے ابر اور صحرا کی علامت استعمال کی ہے۔ چھٹے شعر میں ناصر نے کئی علامتیں یکجا کی ہیں 'گلستان'، 'شب'، 'دل'، 'بن' وغیرہ مگر انھوں نے گلستان اور شب کو مرکب استعمال کر کے ان دو علامتوں کو اکائی میں بدل کر نئے معانی دے دیے۔ 'گلستان شب' گلزار ابراہیم کے مترادف ہے جو تھی تو آگ مگر ان کے لیے وہ آگ بھی گلزار تھی بعینہٖ یہی حال یہاں شاعر کا ہے۔ ایسی تاریک زندگی کا وہ ذکر کر رہا ہے جو بے نور ہے جس میں صرف مایوسی اور تاریکی ہے، امید کی کوئی کرن نہیں ہے مگر چشم و چراغ کی یاد کی وجہ سے کالی رات اس کے لیے گلستان کے مانند ہے مگر کسی کی کمی کا احساس ہے جس کو چشم و چراغ سے تعبیر کر رہا ہے یہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کا اپنا محبوب ہے جس کو وہ بڑے درد و کرب کے ساتھ بلا رہا ہے اور یہ کہہ کر بلا رہا ہے کہ یہ زندگی اجڑے دلوں کا جنگل ہے، آ جاؤ تو اجڑا بن گلستاں میں تبدیل ہو جائے۔ شاعر اپنی تاریک رات میں محبوب کی آمد سے حقیقی روشنی کا خواہاں ہے۔ ساتویں شعر میں ناصر نے دل کو آنسوؤں کا استعارہ بنا دیا ہے، دل تو نہیں ٹپکتا مگر جب وہ کڑھتا ہے تو آنسو ضرور ٹپکنے لگتے ہیں۔ ان آنسوؤں کا تعلق دل سے ہی ہے اگر دل میں ٹیس اور کسک نہ ہوتی تو یہ آنسو بھی نہ آتے اس لیے انھوں نے دل جو سبب ہے اس کو آنسو جو مسبب ہے کی جگہ استعمال کر دیا۔ اس طرح انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ آنسو کی جگہ دل ٹپکا دیا۔ مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ بھی ناصر کے یہاں بہت سے اشعار ہیں جو نئے محسوسات پر دلالت کرنے کے ساتھ ہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انھوں نے قدیم لفظیات سے نئی فضا سازی کی کوشش کی ہے مثلاً

ذرا گھر سے نکل کر دیکھ ناصر
چمن میں کس قدر پتے پڑے ہیں

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ترے شہر کا اسٹیشن بھی
میرے دل کی طرح سونا تھا

ناصر کے محولہ بالا تمام اشعار جدید محسوسات سے لبریز ہیں۔ چمن میں پتے پڑے ہونے کی بات کہہ کر شاعر نے واضح کر دیا ہے کہ گھر میں جانے سے قبل خزاں نے دستک نہیں دی تھی مگر اس قلیل وقفے میں اس نے اپنا منحوس ڈیرا ڈال دیا اہم بات یہ کہ شاعر نے بہت ہی سبک انداز میں اپنی بات کہہ دی ہے۔ اسی طرح جس طرح انھوں نے اداسی کی پیکر سازی کی ہے وہ بھی بہت اہم ہے، کیونکہ اداسی کا بال کھول کر گھر کی دیواروں پر سونا بڑی گہری بات ہے جو اس بات کی بھی علامت ہے کہ یہاں ہر طرف اداسی ہی اداسی ہے کہیں بھی خوشی کا نام و نشان تک نہیں ہے ناصر نے ''اداسی'' جو غیر مرئی ہے جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اس کو مرئی شکل دے دی ہے اور شعر کی قرأت کے ساتھ ہی ہماری نظروں کے سامنے ایک ہیولی آ جاتا ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور دیواروں سے لپٹی ہے چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ اس شعر سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ انھوں نے خواتین کی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بال کھلنا اور کھولنا دونوں کے الگ الگ معنی ہیں اور ناصر نے جو یہاں کہا ''اداسی بال کھولے سو رہی ہے'' اس بات کی غمازی ہے کہ اداسی خود کسی کا غم منا رہی ہے جس طرح جب گھر میں موت ہوتی ہے تو خواتین غم مناتی ہیں جس میں وہ اپنے بال کھول کر بکھرا دیتی ہیں کیونکہ بال کھول کر سوگ اور غم منانا خواتین کی نفسیات میں شامل ہے۔ اس طرح انھوں نے واضح کر دیا کہ وہ اور ان کا گھر اداسیوں کا مسکن ہیں۔ یہ وہ پیکر ہے جس کو پیش کرنے سے قدیم شعراء قاصر رہے ہیں جس کی مثال شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی طرح انھوں نے اگلے شعر میں انھوں نے اپنے دل کی اداسی پر سارے شہر کو اداس محسوس کیا جس کا اظہار عامی لفظ 'سائیں سائیں' سے کیا ہے یہ لفظ عام بول چال میں تو استعمال ہوتا رہا ہے مگر شاعری میں اس خوبصورتی کے ساتھ پہلی بار انھوں نے استعمال کیا، جس میں ایک جہان معانی ہے۔ یہ ان کے لفظوں کے نئے استعمال سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ ناصر نے آخری شعر میں لفظ ''اسٹیشن'' کا بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور اس استعمال میں اہم بات یہ رہی کہ انھوں نے اسٹیشن کی تشبیہ دل سے دی ہے دونوں میں بہت اچھی مماثلت یہ پائی جاتی ہے کہ جب دل محبوب کے قریب ہو تو بڑی تیزی سے دھڑکتا ہے اور ایک ہنگامہ سا مچا رہتا ہے مگر جب محبوب دور ہو اور اس سے ملنے کی کوئی امید نہ ہو تو بالکل بجھا بجھا سا رہتا ہے اسی طرح اسٹیشن بھی کہ جب ٹرین کی آمد کا وقت ہوتا ہے تو افراتفری کا ماحول رہتا ہے مگر جیسے ہی مسافر گئے اس کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ ایک بات اور اگر شاعر نے رات میں محبوب کے شہر کا اسٹیشن دیکھا ہو جو دل کی طرح سونا تھا تو ایک اچھی مماثلت اور پائی جاتی ہے جس طرح اسٹیشن پر سگنل کے لیے ایک روشنی ٹمٹماتی رہتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ٹرین آئے گی اور مسافر آئیں گے جس سے ایک بار پھر یہاں ہنگامہ برپا ہوگا اسی طرح شاعر کا دل ہے کہ ابھی تو سونا ہے مگر امید کی ایک کرن ہے جس کی وجہ سے زندگی میں ایک وقت ضرور آئے گا جب دل کو خوشی ہوگی وہ محبوب کے پہلو پہنچ کر خوب اچھلے گا اور عاشق تو ہمیشہ رجائی ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح ناصر نے غیر زبان کے لفظ کو شاعری میں خوبصورتی سے برت کر اپنی مہارت اور فنی دسترس کا مظاہرہ کیا۔

ناصر کی شاعری میں ایسے بھی مضامین ہیں جو نہ صرف دوسروں کے یہاں مفقود ہیں بلکہ غزلیہ شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ غزل تو محبوب سے باتیں کرنے کا نام ہے مگر ناصر کے یہاں کہیں کہیں اس سے برگشتگی بھی پائی جاتی ہے میرے خیال سے ناصر نے علم بیان کی ایک اصطلاح 'تشبیہ مقلوب' کو غزل کا جامہ پہنا دیا ہے جس میں مشبہ بہ تشبیہ سے بالکل برعکس ہوتی ہے حالانکہ ناصر نے ان اشعار میں تشبیہ اور مشبہ بہ کا استعمال نہیں کیا ہے مگر مضمون کی حد تک انھوں نے ایسا ضرور کیا ہے کیونکہ غزل کے مضمون اور ان کے اشعار کے مضمون میں تضاد پایا جاتا ہے مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

رشتہ جاں تھا جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل تو تجھے بھی بھلائے جاتا ہے

ترے شہر طرب کی رونقوں میں
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے

اوّلیں چاند نے کیا بات سجھا
یاد آئی تری انگشتِ حنا

یہ کیا کہ ایک طور سے گذرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

مذکورہ بالا اشعار میں نہ تو محبوب کے تئیں فدائیت ہے اور نہ ہی گذرے ہوئے اوقات کی کسک اور جو ساتھ میں وقت بیت رہا ہے اس کی خوشی جو غزل کا اصل مضمون ہے اس کے باوجود ان اشعار میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو شعر کو اعلیٰ درجے کا بناتی ہے اگر ان اشعار کا ہم گہرائی سے تجزیہ کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ شاعر پس لفظ کچھ کہنا چاہتا ہے اور وہ ہے زمانے کی روش جس کا اظہار وہ کر رہا ہے جہاں شوق کسی کو بھلا رہا ہے اور وقت کی تیز وتند آندھی نے محبوب کی صورت کو کھرچ کر اس کے ذہن سے محو کر دیا ہے اور شہر طرب کی رونقیں بھی اب اس کو اچھی نہیں لگتی۔ ناصر کا آخری شعر تو بہت اہم ہے کیونکہ جو بات ابھی تک شاعر بالواسطہ کہہ رہا تھا جس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں وہی بات شاعر نے یہاں بلا واسطہ کہہ دی جو تلون مزاجی پر دلالت کرتا ہے لیکن اس میں اچھی بات یہ ہے کہ شاعر وقت کے اعتبار سے جس طرح دیگر باتوں میں جمود کا قائل نہیں ہے اسی طرح وہ محبوب کے معاملے میں یک رنگی نہیں پسند کرتا بلکہ وہ تغیر اور جدت کا نہ صرف قائل ہے بلکہ وہ اس کا دلدادہ ہے۔ جو ہر شے کی خوبصورتی تبدیلی میں تصور کرتا ہے۔ دراصل ناصر نے اس شعر میں اس خیال کو نظم بند کیا ہے جو پورے سماج میں عام ہے۔

ناصر کی ایک اہم اور بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے چھوٹی بحروں میں بڑی چابک دستی کے ساتھ شاعری کی ہے۔ جس طرح میر نے چھوٹی بحروں کو استعمال کر کے سہل ممتنع کی ایسی مثالیں قائم کی جس کا کوئی جواب نہیں، میر نے کہا تھا

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

ناصر کے چند اشعار سے ان کی سہل نگاری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی
تیرا قصور نہیں، میرا تھا
میں نے تجھ کو اپنا سمجھا تھا
شوق کیا کیا دکھائے جاتا ہے
دل تجھے بھی بھلائے جاتا ہے
وہ کوئی اپنے سواء ہو تو شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

ان تمام اشعار میں شعری لوازمات یعنی تشبیہ واستعارات اور ان کے تلازمات کو بروئے کار نہیں لایا گیا جن سے شعر میں قوت اور جان پیدا ہوتی ہے اس کے باوجود یہ اعلیٰ درجے کے اشعار ہیں دراصل مندرجہ بالا تمام اشعار کا ایسا لفظی نظام ہے جس نے ان کو اعلیٰ درجے کا شعر بنایا ہے۔ لفظی آہنگ، ان کی تراش وخراش اور لفظوں کی بنت ایسی ہے جس سے ہم شاعر کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اسی بنت کا نام لفظی نظام ہے۔ ناصر کاظمی نے پرانی علامتوں کو نئے معانی اور مفاہیم بھی دیے ہیں اور شاعری کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے وہ دل، چراغ، زلف، جنگل وغیرہ کو نئے نئے انداز میں استعمال کیا ہے۔

ایک سے تیرا پھول سا نازک ہاتھ تھا میرے شانے پر
ایک وقت کہ میں تنہا اور دکھ کے کانٹوں کا جنگل
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہوگئے ہیں
جنگل میں ہوئی شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں
پرانی صحبت یاد آرہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سلگتے ہیں دل کے ویرانے
ترے جلوے میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

ان تمام اشعار میں ناصر نے جنگل، بستی، چراغ، دھواں، گھر اور دل جیسی علامتوں کو نئے نئے انداز میں برتا ہے۔

ناصر کاظمی کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے حامیوں کے شور وغل میں جو صنف اپنا وجود کھو چکی تھی اور ہیئت بدل چکی تھی اس کو ایک امتیازی صنف کا درجہ دلایا، ترقی پسند شعرا خطابیہ لہجے کے نہ صرف قائل تھے بلکہ جا بجا اس کے نمونے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ پروفیسر انیس اشفاق نے درست لکھا ہے کہ:

''ناصر کاظمی کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل کو ایک نئے لہجے سے متعارف کرایا یہ نیا لہجہ ترقی پسندی کے پرشور لہجے کے ردعمل کے طور پر سامنے آیا تھا چونکہ ترقی پسندوں کو دھیما اور انفعالی لہجہ مطلوب نہیں تھا اس لیے یہ لہجہ ہماری غزل سے غائب ہوگیا تھا''

وہ آگے لکھتے ہیں:

''ناصر کا دوسرا بڑا اہم کارنامہ یہ ہے کہ وہ غزل کو پس منظر سے پیش منظر میں لے آئے ان سے قبل غزل دوسرے درجے کی اور منسوخ صنف سخن سمجھی جانے لگی تھی، ناصر نے پھر سے ایک سربرآوردہ صنف سخن بنادیا''۔

(غزل کا نیا علامتی نظام ص 27)

ناصر اس پرشور دور میں چلے تو تنہا تھے مگر لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا، حالانکہ جو لوگ ناصر کے کارواں میں شامل ہوئے ایسا نہیں کہ اس میں ناصر کا خون جگر شامل نہیں بلکہ یہ ناصر کا لہجہ اور اسلوب ہی تھا کہ دوسروں نے ان کے تتبع کو اپنی شاعری کی معراج تصور کیا۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''ناصر کاظمی کی غزل نے گویا اپنا ایک دبستان سا بنالیا چنانچہ احمد مشتاق ہوں یا شہر یار، منیر نیازی ہوں یا شہزاد احمد، بلیم احمد ہوں یا حسن نعیم اور محمد علوی ان سب کے یہاں ناصر کاظمی کی طرح کائنات کے مظاہر سے امیجری تخلیق کرنے صورت حال کے بجائے تاثرات کی تجسیم کاری کرنے اور معنی آفرینی کے متوازی شعری فضا سازی جیسے رجحانات امتداد وقت کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔'' (کثرت تعبیر ص 99 پروفیسر ابوالکلام قاسمی)

اس طرح لفظی نظام کا جو پودا ناصر کاظمی نے لگایا وہ وقت گزرنے اور مرور زمانہ کے ساتھ قوی تر ہوتا گیا جس کی گونج ان کے ہمعصر اور بعد کے شعرا کے کلام میں جابجا نہ صرف دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ ان کی روایت کو انھوں نے مزید آگے بڑھایا اگرچہ انھوں نے بہت زیادہ علامتوں کو نئے معانی ومفاہیم نہیں عطا کیے مگر انھوں نے ایک ایسی بناء ڈالی جس پر مضبوط عمارت بنتی دکھائی دے رہی ہے ان کی روش اور نئے لفظی نظام نے ہی غزل کو ایسے دور میں داخل کردیا ہے جس میں قدیم لفظیات اور ان کے تلازمات کے نئے معانی اور مفاہیم سامنے آرہے ہیں جس کا اندازہ زیب غوری کے شعر،

تہہ بہ تہہ لے گیا گرداب نگہ عکس تمام
دیر تک ڈوبتے منظر پس منظر بولے

اور شہریار کے اشعار

اک خواب دیکھنے کی آرزو رہی
اسی لیے تمام عمر سونہ پائے ہم
راتوں کو جاگنے کے سواء اور کیا کیا
آنکھیں اگر ملی تھیں کوئی خواب دیکھتے

زیب غوری کے شعر میں جس طرح لفظوں اور گرداب کا استعمال، اور ڈوبتے منظر و پس منظر کا بیان کیا گیا ہے وہ نئی روش کا پتہ دیتے ہیں۔ اسی طرح شہریار کے دونوں اشعار میں خواب کو آرزو اور تمنا کی علامت بنا کر جس طرح کربناکی کا بیان کیا گیا ہے وہ دعوت فکر دیتے ہیں۔

■

Mohd Haneef Khan
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh - 201001 (UP)
Mob.: 9359989581
Email: haneef5758@gmail.com

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

انشائیہ کی روایت
مشرق و مغرب کے تناظر میں

بلال احمد ڈار

جب ہم انشائیہ کے ابتدائی نقوش تلاش کرتے ہیں تو ہماری تلاش فرانس کے ادیب مشیل دی مونتین پر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ انھیں مغرب میں اس صنف کا موجد و بانی قرار دیا گیا ہے۔ان کی انشائیہ نگاری کا سورج ہر دور میں چمکتا ہی رہا ہے اور ہر زمانے میں اسے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ میسر آتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں مونتین کی اولیت کے باوجود اسے حتمی،مثالی یا حرف آخر قرار نہیں دیا گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں دنیا کے ہنگاموں سے بالاتر ہوکر مونتین نے اپنے آپ کو پڑھنے لکھنے کے لیے وقف کردیا۔ فرصت کے ان ایام میں اس نے اپنی فہم و فراست اور قابلِ داد صلاحیتوں کی آزمائش کے لیے مختلف عنوانات پر غیر رسمی انداز میں قلم برداشتہ لکھنا شروع کیا۔ مونتین نے اس ذہنی آزمائش اور غیر مربوط خیالات کو Essai کا نام دیا۔

مونتین کے ایسیز میں ادیب کی شخصیت اور ادیب کے جذبات و احساسات جلوہ گر ہیں جب کہ بیکن کے ایسیز معروضی نوعیت کے ہیں اور علمی ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔دونوں ادیب ایسے نگاری میں الگ الگ اسلوب کے خالق ہیں۔متاخرین میں ایسے نگاروں کی ایک بڑی تعداد ان ہی دو نمایاں اور نمائندہ اسالیب کا تتبع کرتی نظر آتی ہیں۔بیکن کے بعد انگریزی ایسے نگاروں میں ابراہم کاولے کو بہت ہی نمایاں مقام حاصل ہے۔انگریزی ایسے کے ابتدائی دور کے ایسے نگاروں میں سر تھامس اوور بری اور جان ارل وہ ایسے نگار ہیں جنھوں نے تھیو فراسٹس کے طرز پر کردار نگاری کی ہے۔انگریزی اخبارات و جرائد نے بھی انگریزی ایسے نگاری میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔

اردو ادب میں لفظ انشائیہ انگریزی لفظ Essay کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔انگریزی میں رسمی یا غیر رسمی، شخصی، سماجی، تنقیدی، سیاسی یا مذہبی وغیرہ ہر طرح کے مضامین کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔انگریزی ادب میں لائٹ ایسے یا پرسنل ایسے یا آرٹیکل کو مجموعی طور پر ایسے ہی کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔اردو میں پہلے پہل ایسے کے لیے اردو زبان کا لفظ مضمون استعمال کیا جاتا تھا بعد میں اس لفظ کو اردو والوں نے متعدد معنوں میں استعمال کیا اور ہر قسم کے ادب پاروں مثلاً علمی، تنقیدی، سوانحی، رسمی یا غیر رسمی وغیرہ کے لیے لفظ 'مضمون' کا استعمال کیا جانے لگا۔انگریزی لفظ ایسے کی طرح اردو لفظ 'مضمون' بھی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے لگا۔مضمون میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب پارے بھی جگہ پاگئے۔علمی مقالوں، مذہبی اور سوانحی مقالوں، شخصیات کے خاکوں، مراسلوں، جلسوں اور جلوسوں کی رپورتاژ، روزناموں اور اداریوں کو مجموعی طور پر مضمون ہی کہا جاتا تھا۔لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔جوں ہی اردو زبان میں وسعت آئی اور اس میں مختلف ناموں کے تحت نئی اصناف نے جنم لینا شروع کیا اور بعض اصناف مغربی ادب کے زیر اثر اس میں پنپنے لگیں۔وقت گزرنے کے ساتھ اردو ادب میں بعض ایسے ادب پارے تخلیق کیے جانے لگے جو غیر رسمی انداز بیان اور ایک منفرد اسلوب کی بنا پر مراسلوں، مقالوں، کیفیہ، سوانحی مضامین، اداریہ، خاکہ، روزنامچہ وغیرہ سے بالکل مختلف نوعیت کے حامل تھے۔اس نوعیت کے مضامین کو لائٹ ایسے، انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف، طیفیہ، مراقبہ، افکار پریشاں وغیرہ کا نام دیا جانے لگا۔بعد میں لائٹ ایسے یا انشائے لطیف جیسے مضامین کو ہی انشائیہ کا نام ملا اور اردو ادب میں انشائیہ ایک تناور درخت کی صورت میں ابھر کر پروان چڑھنے لگا۔دیگر اصناف کی طرح انشائیہ کو بھی ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔اردو میں آکر ایسے نے پہلے مضمون کا چولا اختیار کیا اور مضمون کے ہی بطن سے انشائیہ نے جنم لیا۔انشائیہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے کرتے اپنی تکنیک، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے نثری ادب میں ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔سید محمد حسنین 'انشائیہ کی صنفی حیثیت کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

''انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے، بظاہر یہ خیال درست ہے۔پر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خیر و خیریت ملتی ہے یا مقالہ کی معلوماتی اور فکر انگیز روشنی، جس میں کیفیہ کی رقت خیزی ہو یا سوانح حیات کے تاریخ وار کارنامے، جس کی روئداد کی خشک کارروائیوں کا ذکر ہو یا روزنامچہ کے لخت لخت غیر متعلق بیانات، جس میں خاکہ کے رخِ روشن کی تابانی نظر آئے یا رپورتاژ کی تاثراتی تفصیلات ...مراسلہ، مقالہ، کیفیہ، سوانح حیات، روئداد، خاکہ اور رپورتاژ مضمون کی مختلف شکلیں ہیں، ایسی مخصوص شکلیں جنھیں ہم 'اصناف' (Genres) کا مرتبہ دیتے ہیں۔

ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک منفرد صورت ہے اور نثری ادب میں اس کا اپنا ایک صنفی مقام ہے۔'' (انشائیہ اور انشائیے: سید محمد حسنین، ص: 21)

لائٹ ایسّے، انشائے لطیف، مضمون پریشاں، کیفیہ وغیرہ کس طرح اور کب اردو ادب میں انشائیہ کے نام سے موسوم ہوئے اور انشائیہ کی اصطلاح کو اردو ادب میں سب سے پہلے کس نے رائج کیا اس بارے میں حتمی فیصلہ بہت ہی مشکل ہے۔ سید محمد حسنین کا کہنا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے 'انشائیہ' کو صنفی لحاظ سے متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر اختر اورینوی کے سر جاتا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 1944 میں 'ترنگ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں سید اختر نے 'تعارف' کے زیر عنوان مقدمہ لکھا۔ فاضل مقدمہ نگار نے اس طرح کی تحریروں کو انشائیہ کا نام دیا۔ پروفیسر یوسف بٹنی اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں کہ اردو میں انشائیہ کو صنفی لحاظ سے سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اورینوی نے ادب میں روشناس کرایا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں انشائیہ کے متعدد نمونے شائع ہوتے رہے جن میں خواجہ حسن نظامی کی سیپارۂ دل، نیاز فتحپوری کی 'نگارستان' کے انشائیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نثری نمونوں کی چھان بین سے ان سے پیشتر بھی انشائیوں کے نمونے ملتے ہیں۔''

(اردو زبان: انشائیہ نمبر، جلد 8 مارچ اپریل 198 سرگودھا پاکستان، ص: 8)

سید سجاد نقوی کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے 'انشائیہ' کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا نے تجویز کی۔ پروفیسر جمیل آزر ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب 'خیال پارے' کو انشائیوں کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انشائیوں کے اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو ادب میں اس صنف کی باقاعدہ تحریک کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اردو انشائیہ کے سلسلۂ نسب کے بارے میں خود کیا رائے رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''اختر اورینوی وہ پہلا ادیب تھا جس نے لوگوں کو شعوری طور پر لائٹ ایسّے کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعے کا جو دیباچہ تحریر کیا اس میں پہلی بار نہ صرف لائٹ ایسّے کے متقضیات کے بارے میں کھل کر لکھا بلکہ لائٹ ایسّے کے لیے انشائیہ کا لفظ بھی استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی اکبر قاصد کے مضامین) پر اس نے لفظ 'انشائیہ' چسپاں کرنے کی کوشش کی وہ عام سے طنزیہ مزاحیہ مضامین تھے، جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیہ کے متقضیات کو پیش کرنے پر قادر تھا لیکن انشائیہ کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہوا، اسی لیے اس کا تجویز کردہ لفظ 'انشائیہ' بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہوسکا۔''

(ماہنامہ 'شاعر' ممبئی، جلد 44 شمارہ 2، 1995 ص: 10)

وزیر آغا کا کہنا ہے کہ 1950 سے 1960 تک کے عرصے میں انھوں نے رسالہ 'ادب لطیف' کے لیے بہت سارے پرسنل ایسّے تحریر کیے جنھیں ادب لطیف میں انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ پھر انھوں نے 'ادب لطیف' کے مدیر مرزا ادیب سے اس نوع کی تحریروں کے لیے 'انشائیہ' کا لفظ مختص کرنے کی تجویز پیش کی جس کو مرزا ادیب نے قبول کیا۔ وزیر آغا نے 'انشائیہ' کا لفظ بھارت کے کسی رسالے سے لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''انھیں دنوں ہندوستان میں فکاہی مضامین کے لیے بعض ادبانے 'انشائیہ' کا لفظ استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ راقم الحروف نے ادب لطیف کی معاونت سے اس لفظ کو لائٹ ایسّے کے لیے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ میں لفظ انشائیہ بھی مقبول ہوگیا۔''

(18 ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی، جلد 44 شمارہ 2، 1995 ص: 11)

ڈاکٹر سلیم اختر، وزیر آغا کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ اردو ادب میں لفظ 'انشائیہ' کو پہلی بار رائج کرنے کا سہرا وزیر آغا کے سر جاتا ہے۔ بقول ان کے کہ اردو ادب میں 'انشائیہ' کا لفظ بذات خود خاصا پرانا ہے۔ ان کے خیال میں محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے لفظ انشائیہ وضع کیا اور سب سے پہلا انشائیہ آزاد نے ہی لکھا ہے۔ سلیم اختر کا یہ بھی کہنا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے بہت سارے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں انشائیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' میں بلاغت کی بحث کے سلسلہ میں انشائیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی صنف ادب کو وجود میں آنے سے پہلے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ انشائیہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ انگریزی کے ایسّے نے اردو میں آکر 'مضمون' کی صورت اختیار کی۔ مضمون نگاری کی کوکھ سے انشائیہ نے جنم لیا اور اب اردو ادب میں انشائیہ ایک تنومند درخت کی حیثیت سے اپنے قد و قامت اور منفرد خصوصیات کی بنا پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

اردو انشائیہ کی اصطلاح ایک مخصوص صنف ادب کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کا ایک خاص داخلی مزاج ہے۔ اردو میں بلاشبہ انشائیہ انگریزی سے آیا لیکن کچھ محققین کے مطابق اردو انشائیہ بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انگریزی انشائیہ۔ جس دور میں Essay کو رواج دیا گیا، اردو میں بھی اسی طرح کے مضامین لکھے جارہے تھے۔ اس لیے کسی نے انشائیہ نگاری کی روایت کو ملا وجہی سے جوڑ دیا اور کسی نے سرسید سے اور کسی نے سجاد حیدر یلدرم سے۔ ڈاکٹر انور سدید 'انشائیہ اردو ادب میں' لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کے کچھ نقوش بکھری ہوئی حالت میں قدیم اردو نثر میں بھی مل جاتے ہیں۔ جاوید وششٹ نے اپنی کتاب 'انشائیہ اور انشائیہ پچیسی' میں ملا وجہی کی کتاب 'سب رس' کو انشائیہ کا نقش اول قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وجہی نے سب سے زیادہ انشائیے فطرت انسانی سے متعلق ہی لکھے ہیں:

جاوید وششٹ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اردو انشائیہ کوئی نئی کوشش نہیں بلکہ بہت قدیم ہے اور ملا وجہی پہلے انشائیہ نگار ہیں، بہت زور صرف کیا لیکن ان کی بات کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ملا وجہی کی یہ تحریریں جداگانہ حیثیت میں نہیں لہٰذا ملا وجہی کی تحریروں کو انشائیہ نہیں بلکہ انشائیہ نما کہنا چاہیے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری بھی ان پر اعتراض کرتے ہیں اور ملا وجہی کی تحریروں کو صرف انشائیہ کے اولین نقوش قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ملا وجہی کو اردو کا پہلا باقاعدہ انشائیہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ سب رس میں موضوعات کا تنوع سہی مگر یہ سب تحریریں انشائیہ کے چند عناصر کی حامل تو ہوسکتی ہے، مکمل انشائیہ نہیں کہلائے جاسکتے۔ ملا وجہی کا دور وہی ہے جو عالمی ادب کے پہلے انشائیہ نگار مونتین اور انگریزی Essay کے موجد بیکن کا ہے۔

اردو میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وجہی کے ہاں ابتدائی نقوش ملتے ہیں لیکن درحقیقت تحقیق کے بعد اس بات کا پتہ چلا ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی نقوش سرسید کے دور سے ملنا شروع ہوئے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس دور میں مغربی انشائیہ عروج پر تھا اور انگریزوں کے ساتھ ہی انشائیہ بھی مشرق میں آیا۔ خصوصاً جب سرسید نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا تو مغربی علوم سے واقفیت کی بنا پر اردو میں اس صنف کا آغاز ہوا لیکن درحقیقت ان کو انشائیہ

سے زیادہ مضمون کہا جا سکتا ہے۔لیکن کچھ مضامین ایسے بھی لکھے گئے جن میں انشائی عناصر ضرور پائے جاتے تھے۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ابتدائی مضامین نہ ہوتے تو انشائیہ کے وجود میں آنے میں کافی تاخیر ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کے دور کو انشائیہ کے حوالے سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ سرسید پہلے انشائیہ نگار تھے یا نہیں البتہ مضمون نگار ضرور تھے۔اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مضامین میں انشائیہ کے عناصر پہلی مرتبہ ضرور ملے لیکن بہت سے محققین نے سرسید کو ہی پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے جن میں سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد زکریا، پروفیسر جمیل آزر، پروفیسر نظیر صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ شامل ہیں۔سرسید کے مضامین طبع زاد نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا اس لیے انہیں پہلا انشائیہ نگار ماننے میں قباحت نہیں۔سرسید کے دور میں مضامین کو ہی انشائیہ سمجھا جاتا تھا پھر بھی ان کے کچھ مضامین انشائیے کے زمرے میں آتے ہیں مثلاً 'گزرا ہوا زمانہ'، 'امید کی خوشی'، 'سراب حیات' اور بحث و تکرار میں انشائی عناصر ملتے ہیں۔ان کے مضامین میں کہیں سنجیدگی پائی جاتی ہے تو کہیں طنز و مزاح۔

جاوید وشسشٹ کی طرح دوسرے محققین بھی انشائیہ کو نوخیز نہیں مانتے۔خواجہ احمد فاروقی ماسٹر رام چندر کی تقدیمی حیثیت کو لائق احترام قرار دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ ماسٹر رام چندر نے اردو مضمون یعنی ایسے سے متعارف کروایا۔ماسٹر رام چندر قدیم دلی کالج کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔خواجہ احمد فاروقی ان کو مضمون نگاری، ترجمہ، تاریخ اور سیرت نگاری میں چراغ راہ تسلیم کرتے ہیں۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار خواجہ احمد فاروقی کی بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ماسٹر رام چندر ایک علمی مضمون نگار تھے لیکن ادبی مضمون نگار نہیں تھے۔ان کی نثر علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے تجربے کر رہی تھی، اس لیے اس میں ادبی نوعیت کی تلاش عبث ہے۔''

(مضامین رشید (مرتبہ) غلام حسین ذوالفقار، لاہور 1976)

اس قول سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ماسٹر رام چندر کے مضامین کی نوعیت تخلیقی نہیں تھی بلکہ وہ سائنسی عنوانات پر معلوماتی قسم کے مضامین تھے۔ان کے مضامین میں خود ان کی شخصیت کے خدوخال نہیں اُبھرتے جو انشائیہ کا خاص وصف ہے اس لیے وہ انشائیہ کے فطری مزاج کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے۔بعض ناقدین مرزا غالب کے خطوط پر انشائیہ نگاری کا گمان کرتے ہیں جن میں وہ اپنے دوستوں سے محو کلام ہے اور تکلف کا کوئی پردہ ان کے درمیاں نہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''بے تکلفانہ گفتگو کا پیرایہ مجلسی زندگی کی یہ جزیات اور ماحول کے دلکش مرقع غالب کے بعض خطوط کو افسانے اور انشائیے کے قریب لے آتے ہیں۔''

(مضامین رشید (مرتبہ) غلام حسین ذوالفقار، لاہور 1976)

ایک انشائیہ نگار سے جس اسلوب کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ یقیناً غالب کے ہاں موجود ہے۔اس کی نثر میں انشائی مزاج سے مطابقت ملتی ہے لیکن موضوع کی عدم موجودگی اور ذات کے صرف نجی اور غیر ادبی گوشوں کی نقاب کشائی کی بنا پر انھیں انشائیہ نگار ثابت کرنے کے لیے تاریخی اسناد ہی کافی نہیں تخلیقی شواہد بھی ضروری ہیں۔

انشائیہ نگاری کا جو عمل انگریزی سے اردو میں آیا اس میں اگرچہ مضمون کی ہیئت تو موجود تھی لیکن طرز بیان میں زمین و آسمان کا فرق تھا کیونکہ انشائیہ لکھنے کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیں ایک لمحے سے روک کر زندگی کے عام پہلوؤں کو پیش کرے جو ہماری نظروں کے گرفت میں آنے سے رہ گئے تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہی نہیں تھے۔اس مقام پر ایک انشائیہ لکھنے والا ایک سیاح کو درحقیقت وہ دکھانا چاہتا ہے جو کچھ اس کے سامنے ہونے کے باوجود موجود نہیں ہوتا۔اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام نظاروں کو ان تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے سبب ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔بلاشبہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زندگی کی ان انوکھی اور تازہ کیفیات کا احساس دلانے کے لیے انشائیہ کا خالق کئی ایک طریقے اختیار کرنا جانتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جیسے نثر نگار ایڈیسن اور اسٹیل کے تتبع میں انشائیہ نگاری کے قریب آجاتے ہیں مگر ایک سانس میں شرر سے امجد حسین تک سب کو وزیر آغا جیسا انشائیہ نگار بنا دینا انصاف نہیں اسی لیے ڈاکٹر انور سدید جیسے نقاد اس طرح کے غیر محتاط انداز میں گرفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''جن محققین نے انشائیہ کا سراغ قدیم نثر میں لگایا ہے انھوں نے جزو کو کل پر فوقیت دینے کی کاوش کی ہے اور اپنے فیصلے کی اساس انشائیہ کی نثری اور غیر مرتب صورتوں پر رکھی ہے۔مثال کے طور پر اسلوب کی روح پرور شگفتگی، میر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور فسانہ عجائب میں بھی موجود ہے اور یہ انشائیہ کے مزاج کے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔غیر رسمی انداز اور عدم تکمیل کی خوبی مرزا غالب کے خطوط میں بدرجہ اتم ملتی ہے۔چنانچہ اگر انشائیہ کے کچھ عناصر لاشعوری طور پر ان کی نثر میں در آئے ہیں تو یہ اس صنف کی منضبط اور باقاعدہ ابتدا کی نشاندہی نہیں کرتے بلکہ محض اتفاقی ہے۔''

(23 انشائیہ اردو ادب میں: انور سدید، ص: 80)

ملا وجہی سے لے کر مرزا غالب تک اردو نثر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ انشائیہ کے کچھ عناصر محض اتفاقی ہیں مگر سرسید کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔سرسید اپنے مضامین میں انشائیے کے مزاج سے واقف کار نظر آتے ہیں۔انھوں نے ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید میں مضمون نگاری کی ہے۔ان کے بعض مضامین جدید انشائیہ کی تعریف سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، سراب حیات، بحث و تکرار، خوشامد وغیرہ اسی نوعیت کی تحریریں ہیں۔انھوں نے ٹیٹلر اور سپکٹیٹر کی طرز پر تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اصلاحی کردار کا آغاز کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی ایسے میں فعال کردار ادا کرنے والے دیگر رسائل و جرائد سے بھی استفادہ کیا ہے۔سرسید کے ہاں مقصدیت پر زیادہ زور صرف ہوا ہے اور چونکہ وہ انشائیہ برائے ادب کی غرض سے نہیں بلکہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے لکھ رہے تھے لہٰذا وہ اس کی تمام شعریات کو ملحوظ بھی رکھتے لیکن بحث و تکرار جیسے مضامین میں وہ ایک باقاعدہ انشائیہ نگار نظر آتے ہیں اور اسی وجہ سے سید ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر وحید قریشی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد زکریا، پروفیسر جمیل آزر، پروفیسر نظیر صدیقی اور ڈاکٹر سلیم اختر جیسے نقاد انہیں اردو انشائیہ کے بانی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔انگریزی سے اردو انشائیہ نگاری کا جو سفر شروع ہوا اس میں سرسید کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔انگریزی ایسے کی طرز پر جدید انشائیے کے نقوش سرسید کے ہاں پوری طرح اجاگر ہوئے۔سرسید اردو کے پہلے ادیب تھے جنھوں نے انگریزی ایسے کے بھرپور مطالعے کے بعد اردو میں اس صنف کو متعارف کرایا۔ ڈاکٹر سلیم اختر سرسید کے انشائی اسلوب کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسید پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی ایسے کی بدیسی صنف کی قلم کو گلشنِ اردو میں لگایا۔انہوں نے

انگریزی ایسّے کا مطالعہ کر رکھا تھا وہ اس کے مزاج داں بھی تھے۔انھوں نے طبع زاد لکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ایسّے کے تراجم بھی کیے۔الغرض!اس نئی صنف سے وابستہ فنی اور اسلوبیاتی امکانات دریافت کرنے کی سعی کی۔" (انشائیہ کی بنیاد:ڈاکٹر سلیم اختر،ص:71)

سرسید انشائیہ برائے تفنن کے مقصد کے لیے نہیں لکھتے تھے، انھیں انشائیہ میں شخصیت کے اظہار، اسلوب کی لطافت اور اس نوع کے دیگر فنی مباحث سے دلچسپی نہ تھی۔انھوں نے انگلستان کے قیام کے دوران ایسے پڑھے تو اس پہلو سے متاثر ہوئے۔ان کی انشائیہ نگاری خدمت قوم کا ہی ایک انداز تھی۔ان کے انشائیے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انشائیہ کے مزاج سے پوری طرح واقف کار تھے اور اگر انھوں نے انشائیہ لکھنا پسند کیا ہوتا تو وہ یقیناً صاحب طرز انشائیہ نگار ہوتے۔

سرسید کے معاصرین میں ایک اہم نام محمد حسین آزاد کا ہے جو سرسید کے رفقا میں تو شامل نہیں تھے بلکہ ان کے دور سے ہی تعلق رکھتے تھے۔محمد حسین آزاد اس دور کے وہ نثر نگار تھے جو اپنے منفرد اسلوب کی بنا پر اردو ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔وہ نہ تو سرسید کی روکھی پھیکی نثر کو موزوں سمجھتے تھے اور نہ قدیم مقفّی نثر کے حق میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے قدیم وجدید کے امتزاج سے ایک ایسا دلکش اسلوب اختیار کیا جو صرف انھی سے مخصوص ہے۔

اردو کے کچھ انشاپرداز جن کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں انشائیہ مل جاتا ہے ان میں مولوی ذکاء اللہ، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، خلیق دہلوی، خواجہ حسن نظامی قابل ذکر ہیں۔ان میں مولوی ذکاء اللہ سرسید کے ساتھیوں میں سے تھے جب کہ بقیہ حضرات اس صدی کے ہیں جن کی مجموعی کاوشوں سے انشائیہ نگاری کے جس انداز نے فروغ پایا، اس پر پرسنل یا اس نوع کا کوئی لیبل نہیں لگایا جاسکتا لیکن نثر کے فروغ میں ان کی مساعی کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی۔

1975 سے لے کر اب تک کے دور کو بجا طور پر اردو انشائیے کی مسلسل کامرانیوں کا دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک امتزاجی صنف نثر ہے جس میں شعر جیسا حسن موجود ہے۔آزادی کے بعد ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان میں انشائیہ نے ترقی کے منازل طے کیں۔جس وقت پاکستان میں انشائیہ کی تحریک اپنے شباب پر تھی اس وقت ہندوستان کے صرف تین انشائیہ نگار اس صنف کے تحت اپنی تحریریں سپرد قلم کر رہے تھے جس کا اعتراف ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"پاکستان میں انشائیہ نگاری ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے جب کہ بھارت میں تا حال صرف تین انشائیہ نگاروں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے ان میں دو منجھے ہوئے ادیب ہیں یعنی احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی لیکن تیسرا ایک نوجوان انشائیہ نگار محمد اسداللہ ہے۔" (پیش لفظ، بوڑھے کے رول میں: محمد اسداللہ)

احمد جمال پاشا کا نام اردو میں غیر افسانوی نثر کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں۔احمد جمال پاشا نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو لوگ انگشت بدنداں ہوگئے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں 'کپور ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' جیسا کامیاب مضمون لکھ کر لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔مگر 'ادب میں مارشل لا' اور 'ستم امتحان کے میدان میں' لکھنے کے بعد ان کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی۔بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں احمد جمال پاشا کی تخلیقی صلاحیت اپنے شباب پر تھی۔ان کی کافی تعداد میں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔ پاشا کے جو انشائیے ہندوستان و پاکستان کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے ان میں 'چٹخنا'، 'کچھ تنقید کے بارے میں'، 'بور'، 'ہجرت'، 'بے ترتیبی'، 'شور'، 'اصولوں کی مخالفت میں'، 'چغلی کھانا'، 'تنہائی کی حمایت میں' اور 'کچھ بلیوں کے سلسلے میں' وغیرہ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو مضمون کے زمرے میں شامل ہیں لیکن وہ انشائیے سے قریب ہیں ان میں انشائیہ کی خصوصیات غالب ہیں۔انھیں بھی انشائیہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ان میں مونچھیں، نیا پیسہ، ٹائم ٹیبل، آنی جانی قیامت، ناپسندیدہ لوگ وغیرہ مضمون شامل ہیں۔احمد جمال پاشا کو انشائیہ کے فن میں مہارت حاصل تھی۔پاشا جب انشائیہ تخلیق کرتے تھے تو وہ کسی عام موضوع کو لے کر موضوع کا زاویہ بدل کر اس کے اندر چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر کرتے۔

رام لعل نابھوی کا نام بھی انشائیہ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے انشائیوں کا مجموعہ 'آم کے آم' منظر عام پر آیا جس میں اٹھارہ انشائیے شامل ہیں۔رام لعل موضوعات کے انتخاب میں کافی غور و فکر اور سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔انھوں نے مجرد کو جسم بنا کر پیش کیا ہے بالخصوص 'انتظار' فیشن، مسئلہ، تنہائی وغیرہ کو انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں مجسم کیا ہے۔اس کے بعد جو انشائیہ نگار نمودار ہوئے ان میں سید آوارہ، اندرجیت لال، حسنین عظیم آبادی، مجتبیٰ حسین، پروفیسر خورشید جہاں، یوسف ناظم وغیرہ شامل ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے انشائیہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔موجودہ دور میں اس صنف کی آبیاری میں ادیبوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہیں جن میں کچھ ادیب دو چار انشائیے لکھ کر نام کما چکے ہیں اور کچھ انشائی مجموعے شائع کرکے اس صنف میں ہندوپاک میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسداللہ موجودہ دور کے وہ انشائیہ نگار ہیں جس کے انشائیے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں شہرت کی دہلیز پار کر چکے ہیں۔محمد اسداللہ انشائیے کے فن سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں۔محمد اسد اللہ کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ 'بوڑھے کے رول میں' 1991 میں شائع ہوا جس میں ان کے مشہور ومعروف انشائیے 'انڈا'، 'نیچر کی گود میں'، 'ڈائری'، نافرمانی'، 'بوڑھے کے رول میں'، 'ٹائم پاس کرنا' عینک، دستخط وغیرہ شامل ہیں جو ان کے بیدار ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔ 2015 میں ان کے انشائیوں اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ 'ڈبل رول' شائع ہوا جس میں ان کے گیارہ انشائیے شامل ہیں۔اسی سال ان کی انشائیہ پر اور ایک کتاب 'انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں' منظر عام پر آئی جس میں انھوں نے انشائیہ کو ایک منفرد صنف ادب کے طور پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ مضمون اور انشائیے کے فرق کو بحسن وخوبی واضح کیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سارے ادیب ہیں جو اس صنف کی آبیاری، ترقی اور فروغ کے لیے تحریریں تخلیق کر رہے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں موجودہ دور میں اس صنف کے تحت لکھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور یہاں کے ادیب اس صنف کو پاکستان کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی کوشش میں دل وجان سے محنت کر رہے ہیں۔آج انشائیہ موضوعاتی، فکری اور معنوی لحاظ سے وسعت پذیر ہے اور اس کی اب تک کی رفتار سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مستقبل شاندار اور تابناک ہے۔نوجوان قلمکاروں کی رغبت اور دلچسپی اس صنف کے حوالے سے بڑھتی جارہی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ موجودہ صدی انشائیہ کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

■

Bilal Ahmad Dar
Research Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
(MANUU)
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob: 7006566968

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

- editor@ncpul.in
- urduduniyancpul@yahoo.co.in

رضاء الرحمن عاکف

اردو کی خوشبوؤں سے معطر جہان ہے

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگھی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

رضاء الرحمن عاکف سنبھلی اردو کے معروف قلمکار ہیں۔ انھوں نے روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ادب اطفال کے حوالے سے ان کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ دو جلدوں پر مشتمل سوانحی انسائیکلوپیڈیا ان کا وقیع کارنامہ ہے۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے مجھے 'اردو دنیا' کے قارئین سے مخاطب ہونے کا موقع عطا کیا۔ اب رہا آپ کے سوال کا جواب تو اس کے لیے ہمیں السنۂ عالم پر نظر ڈالنی ہوگی۔ جس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آغاز تمدن یعنی تہذیب و ثقافت کے وجود میں آنے کے بعد ہی یہ حقیقت واضح ہونا شروع ہوگئی کہ جو قوم جتنی زیادہ بیدار، متحرک اور فعال و ترقی یافتہ ہوئی، اس کی زبان نے بھی اتنی ترقی و مقبولیت حاصل کی۔ اس تناظر میں اس وقت انگریزی زبان کو خصوصی طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ اس نوزائیدہ زبان نے کتنی تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کی اور اپنے سے پہلی زبانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اس زبان کے بولنے والے ترقی یافتہ اور حکمراں رہے۔ اس طرح ہمیں یہ بھی سیکھ لینا چاہیے کہ جو قوم محکوم اور زوال کی طرف گامزن ہوگی اس کی زبان بھی پستی سے دوچار ہوتی رہے گی۔ اور جیسے جیسے وہ قوم خاتمے کی طرف جاتی رہے گی، اس کی زبان بھی دم توڑتی رہے گی۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے؟

جواب: زبان کا وجود اور اس کی ترقی و مقبولیت دراصل اس کے بولنے والوں پر منحصر ہے۔ یعنی کسی زبان کے بولنے والے جتنے ترقی یافتہ، متحرک و فعال ہوں گے وہ زبان اتنی ہی ترقی کرے گی۔ دراصل زبان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوا کرتی۔ اس کا مستقبل اس زبان کے بولنے والوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ یعنی زبان اور اس کے بولنے والوں کا رشتہ جسم و روح کی مانند ہے۔ کہ بغیر روح کے جسم زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس طرح بغیر قوم کے زبان زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔ اس لیے زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کے بولنے والوں کو اپنا وجود پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم رکھنا پڑے گا۔ اس لیے آج اردو جس مرحلے سے گزر رہی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اردو بولنے والے خود بھی اپنے گھروں، ماحول اور دوست و احباب کے درمیان اس کو رائج کریں اور دوسروں کو بھی اس کار خیر کے لیے آمادہ کریں۔ اس کے لیے مادی منفعت اور

دنیاوی جاہ و وقار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اردو کی ترقی وترویج کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہو جائیں۔

سوال: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

جواب: زبان کا تہذیب وثقافت سے صرف رشتہ ہی نہیں، بلکہ اس کا دار و مدار ہی اس پر ہوا کرتا ہے۔ یعنی جس قوم کی تہذیب وثقافت جتنی زیادہ مضبوط ہوگی اس کی زبان بھی اتنی ہی مقبول ہوگی۔ کیوں کہ تہذیب کا انحصار زبان پر ہی ہوا کرتا ہے۔ زبان کے معیار پر ہی تو اس کا لٹریچر عالم وجود میں آیا کرتا ہے۔ جس سے قوموں کے معیار حیات، انداز گفتگو، طرز بود و باش، رہن سہن اور حیات انسانی کے جملہ گوشوں کی نشو ونما پر اثر پڑتا ہے اور معاشرہ استوار ہوتا ہے۔ جو تہذیب وثقافت کی اساس ہوا کرتی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا تہذیب وثقافت سے گہرا تعلق ہے۔ اور زبان ہی سے تہذیب و ثقافت جلا پاتی ہے۔

سوال: کیا زبان کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: تاریخ کا مطالعہ کرنے پر ہمیں کتنی ہی ایسی قوموں کا ذکر ملتا ہے۔ جو زبانوں کے ختم ہو جانے سے خود بھی اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ اس لیے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ قوموں کی بقا اور زبانوں کے وجود کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور دونوں کا دار و مدار ایک دوسرے پر منحصر ہے۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: جی ہاں! بالکل پڑتے ہیں۔ اس لیے زبان کے بولنے والوں کو اس کی ضرور فکر کرنی چاہیے اور اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کے تئیں مخلص و سنجیدہ نہیں اور اس کی بقا و ترقی کے خواہش مند ہیں تو انھیں زبان کے پرانے سرمائے کے ساتھ ہی اس کو جدید تکنالوجی اور عہد حاضر کے جملہ تقاضوں کے مطابق اپنی زبان کو تیار کرنا چاہیے۔ عصر رواں کے مطابق لٹریچر اور مواد فراہم کرنا چاہیے۔ دوسری زبانوں سے تال میل رکھنا چاہیے اور ان کے عمدہ مواد کو اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔

سوال: موجودہ زمانے میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: جہاں تک اردو زبان کو کسی طرح کے خطرات کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں تو راقم الحروف پوری طرح مطمئن ہے اور سمجھتا ہے کہ اردو کو آج بھی کوئی ایسا خطرہ لاحق نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کے وجود کو کسی طرح کا کوئی خدشہ لاحق ہو۔ اردو زبان کی شیرینی، لطافت اور اس کی دیگر خصوصیات کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے اندر خود کو قائم و دائم رکھنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ اور وہ ان کمالات و محاسن سے اچھی طرح مالا مال ہے۔ جو کسی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔

سوال: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: نہ اردو کا چہرہ ہی مسخ ہو رہا ہے اور نہ اس کی شکل ہی بگڑ رہی ہے۔ کیوں کہ کسی بھی زبان کا چہرہ اس کے رسم الخط کو کہا جا سکتا ہے۔ اور الحمد للہ اردو کا رسم الخط پوری طرح محفوظ ہے۔ ہاں کچھ ناعاقبت اندیش اس کے تعلق سے کبھی کبھی کوئی ناسمجھی والی بات کہہ دیا کرتے ہیں۔ مگر محبین اردو اور اس کے سچے ہمدرد و بہی خواہ فوراً اس کا تدارک کر دیتے ہیں اور جب تک اردو کے چاہنے والے اور اس کے سچے پرستار موجود رہیں گے۔ ان شاء اللہ یہ زبان کسی بھی طرح کی دست برد سے پاک وصاف رہے گی۔ اور اس کا حسین و تابناک چہرہ عروس ناز کی طرح تابندہ و روشن رہے گا۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو کا مستقبل وہی ہے جو زندہ و باشعور قوموں کی زبانوں کا ہوا کرتا ہے۔ اردو کے مستقبل کے حوالے سے ہمیں کسی طرح کی تشویش وفکر لاحق نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اردو کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے کسی زبان کا مستقبل روشن و تابناک ہوا کرتا ہے۔ اس کے خوبصورت الفاظ، حسین رسم الخط، موتی جیسے حروف، عمدہ و معیاری لٹریچر، دلکش شاعری سبھی تو اس لائق ہیں جس کی وجہ سے یہ زبان پوری طرح محفوظ رہے گی اور دن رات ترقی بھی کرتی رہے گی۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب: بگاڑ سے اگر آپ کی مراد وہ کارستانیاں ہیں جو اصلاح زبان کے نام پر اردو میں کی جاتی رہی ہیں۔ تو ان سے بھی ہمیں کسی طرح ہراساں و خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ایسا تو پہلے بھی متعدد مرتبہ ہوتا رہا ہے کہ کچھ غیر ذمے دار اور ناسمجھ لوگ اردو میں اصلاح کے نام پر ایسی حرکتیں کرتے رہے ہیں، جن سے اس کی صورت مسخ ہو سکتی تھی۔ مثال کے طور پر۔ اردو کے رسم الخط کی تبدیلی، اس کے تلفظ میں ترمیم، املا میں سدھار کے نام پر اس کی ہیئت کو بدلنا۔ یعنی حسین کو ھسین اور علم کو الم لکھنا۔ اس طرح ان کا کہنا تھا۔ کہ جیسا تلفظ ہو اسی کے مطابق املا بھی ہونا چاہیے۔ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو اردو کے دوست نما دشمنوں نے انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر اردو کے سچے دوستوں اور اس کے حقیقی محبین نے اس وقت بھی اس کی محافظت کی اور آج بھی اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ بھی اپنی ذمے داری کو نبا ہیں گے۔

سوال: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں۔ اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت رک سی گئی ہے؟

جواب: ادب بھی زبان کا ہی ایک حصہ ہے۔ اگر اس پر توجہ دی جائے تو میرے خیال میں یہ کسی طرح بھی معیوب نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس سے کسی طرح کی کوئی تشویش ہی ہونا چاہیے۔ اردو کے ساتھ تو یہ اعزازی امتیاز ہے کہ اس کی مقبولیت ہی اس کے ادب کی بنیاد پر ہے۔ اس کے پھولوں جیسے خوشبو دار الفاظ، مشک و عنبر جیسے مہکتے ہوئے اشعار، شہد سے زیادہ شیریں غزلیں، پڑھنے، سننے والوں کے دل میں اتر جانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ مگر جدید تناظر اور تکنالوجی کے اس دور میں ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہمیں اب ادب کے ساتھ ہی تکنالوجی کا

زبان کا تہذیب و ثقافت سے صرف رشتہ ہی نہیں، بلکہ اس کا دار و مدار ہی اس پر ہوا کرتا ہے۔ یعنی جس قوم کی تہذیب و ثقافت جتنی زیادہ مضبوط ہوگی اس کی زبان بھی اتنی ہی مقبول ہوگی۔ کیوں کہ تہذیب کا انحصار زبان پر ہی ہوا کرتا ہے۔ زبان کے معیار پر ہی تو اس کا لٹریچر عالم وجود میں آیا کرتا ہے۔ جس سے قوموں کے معیار حیات، انداز گفتگو، طرز بود و باش، رہن سہن اور حیات انسانی کے جملہ گوشوں کی نشو و نما پر اثر پڑتا ہے اور معاشرہ استوار ہوتا ہے۔ جو تہذیب و ثقافت کی اساس ہوا کرتی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا تہذیب و ثقافت سے گہرا تعلق ہے۔ اور زبان ہی سے تہذیب و ثقافت جلا پاتی ہے۔

فائدہ اٹھاتے ہوئے زبان کی طرف بھی توجہ دینا چاہیے۔ اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی محبوب زبان اردو کی ترقی و توسیع کے حوالے سے مزید وسائل و ذرائع کا بھی استعمال کریں۔ اور اس کی بقاء و استحکام کی فکر کریں۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: دراصل کلاسیکیت ہی کسی چیز کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ اس کی مثال ہم موسیقی سے بھی لے سکتے ہیں کہ اس میں جدید ترقی کر لینے کے باوجود اس کے کلاسیکل وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم زبان، بالخصوص اردو کو بھی دیکھ سکتے ہیں کہ کچھ تغیرات تو اس میں کیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کی اساسی ہیئت کو ضرور محفوظ رکھا جائے۔ اس پر گفتگو کرنے کے ساتھ ہی اس سلسلے میں عملی اقدامات کرنا بھی ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں کانفرنسیں، سمینار، سمپوزیم اور مباحثے منعقد کرنے کے ساتھ ہی جدید علوم وتکنالوجی اور سائنس و دیگر موضوعات پر کتابیں تیار و شائع کرنا بھی ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں؟ اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: ہمارا علاقہ اردو کا علاقہ ہے۔ ماضی بعید اور ماضی قریب میں یہاں اردو کے بہت سے علما و ادبا اور مورخ و مصنف حضرات نے علم و ادب کے گوہر لٹائے ہیں۔ مضامین و مقالات تحریر کیے۔ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ اردو میڈیم اسکول و مدارس قائم کیے۔ اردو کے اچھے اساتذہ کی معتد بہ تعداد ہمیشہ ہی یہاں پر رہی ہے۔ اس وقت بھی ہمارے یہاں اردو کی تعلیم اطمینان بخش ہے۔ بالخصوص مدارس و اسکول و کالج سے خوب علمی آبیاری ہو رہی ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں؟ اور وہاں کون کون سے اخبارات و رسائل آتے ہیں؟

جواب: ہمارے علاقے میں لائبریریوں کی تعداد خاطر خواہ ہے۔ ایک عوامی لائبریری 'عاشق پبلک لائبریری' کے نام سے ہے۔ یہ ہمارے یہاں کی بڑی قدیم وعظیم لائبریری ہے۔ جس کا وجود یہاں کے لوگوں کے لیے تحفۂ خداوندی ہے کہ اس کے استفادے سے یہاں کے اہل علم نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔ پھر یہاں پر کچھ حضرات کی ذاتی اور اداروں یعنی مدارس و اسکول و کالج کی لائبریریاں ہیں۔ جن سے متعلقہ طلبہ وطالبات کے ساتھ ہی دیگر شائقین ادب بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی راقم الحروف

اگر ہم حقیقی معنوں میں اردو کا فروغ چاہتے ہیں۔ اس کی ترقی کے لیے کوشاں اور اس کی بقاء و سلامتی کے خواہشمند ہیں تو پورے ایثار و اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت کرنی ہوگی۔ اپنے گھروں میں اردو کا ماحول بنانا ہوگا۔ دوست احباب کو اردو کی جانب راغب کرنا ہوگا۔ بچوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اردو کی کتابیں، اخبار و رسائل خرید کر پڑھیں۔ جہاں جہاں اردو کی آسامیاں خالی ہیں۔ وہاں اردو اساتذہ کا تقرر کرنا ہوگا۔ جن اداروں میں اردو سبجیکٹ نہیں ہے۔ وہاں اس کا انتظام کرانا ہوگا۔ اردو تعلیم میں معاش و ملازمت کے مواقع تلاش کرنے ہوں گے۔ تاکہ اردو کے لوگ آگے بڑھیں اور معاشی اعتبار سے خود کفیل ہوں۔

کی لائبریری 'علامہ شبلی لائبریری' بھی ہے۔ اس میں نادر و اہم کتابوں کے ساتھ اچھے و معیاری رسائل و اخبارات بھی آتے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں۔ اور وہ کس نہج پر اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں متعدد اردو تنظیمیں ہیں۔ ادارے تو تعلیمی ہی ہیں۔ وہی اپنے طور پر اردو کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ تنظیمیں زیادہ تر شعر و شاعری سے متعلق ہیں۔ اور وہ اپنے انداز پر شعر و شاعری کی آبیاری کرتی ہیں۔ ایسی کوئی تنظیم جس سے خالص زبان کی آبیاری ہو۔ اور جو اردو کی تکنیکی و معیاری ترقی کے سلسلے میں کام کرتی ہو۔ نہیں ہے۔ لوگ اپنے اپنے طور پر اس سلسلے میں کام کرتے ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف بھی اس سلسلے میں کوشاں ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں۔ جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا؟

جواب: خاصی شخصیات ہیں۔ جن کو ملک کی مختلف اکادمیوں کی جانب سے نوازا جاتا رہا ہے۔ ان کی کتابیں کونسل بلک پرچیز اسکیم کے تحت خریدتی ہے۔ خود راقم الحروف بھی اس زمرے میں شامل ہے۔ اگرچہ کتابوں پر مختلف علاقائی وصوبائی انعام تو ملتے رہے ہیں۔ مگر ناچیز ابھی تک قومی سطح (ساہتیہ اکادمی) کے ایوارڈ سے محروم ہے۔ مختلف موضوعات پر مشتمل تقریباً پچیس (25) کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ انتظار ہے شاید ساہتیہ اکادمی کے ارباب حل وعقد کی نظر عنایت ادھر ہو اور راقم کو اعزاز سے نواز کر اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: یہ اردو کی محبت اور اس کے فروغ کا درد ہی تو ہے جس کے تحت ایک اردو اسکول، ایک اردو لائبریری، ایک سوسائٹی برائے فروغ اردو زبان اور اردو کی مضمون و مقالہ نگاری وتصنیف و تالیف میں دن رات منہمک رہنا۔ اس کے ساتھ قومی کونسل کے اردو ڈپلومہ کورس کے توسط سے بھی اردو کی ترقی و ترویج کی سعی کی جاتی رہی ہے۔ الحمد للہ اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ اور علاقے کے لوگ اس کو خادم اردو کی حیثیت سے پہچانتے ہیں اور اس کی اردو خدمات سے پوری طرح مطمئن بھی ہیں۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز ہیں اور کیا مشورے ہیں؟

جواب: اگر ہم حقیقی معنوں میں اردو کا فروغ چاہتے ہیں۔ اس کی ترقی کے لیے کوشاں اور اس کی بقاء و سلامتی کے خواہشمند ہیں تو پورے ایثار و اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت کرنی ہوگی۔ اپنے گھروں میں اردو کا ماحول بنانا ہوگا۔ دوست احباب کو اردو کی جانب راغب کرنا ہوگا۔ بچوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اردو کی کتابیں، اخبار و رسائل خرید کر پڑھیں۔ جہاں جہاں اردو کی آسامیاں خالی ہیں۔ وہاں اردو اساتذہ کا تقرر کرنا ہوگا۔ جن اداروں میں اردو سبجیکٹ نہیں ہے۔ وہاں اس کا انتظام کرانا ہوگا۔ اردو تعلیم میں معاش و ملازمت کے مواقع تلاش کرنے ہوں گے۔ تاکہ اردو کے لوگ آگے بڑھیں اور معاشی اعتبار سے خود کفیل ہوں۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

جواب: اردو رسم الخط کی بقا کی فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کو کسی طرح کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ اور شومیٔ قسمت سے اگر اس سلسلے میں کبھی کوئی خطرہ نظر آتا بھی ہے تو اردو کے محبین فوراً ہی اس کا سد باب کر دیتے ہیں۔ تاریخ سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہ جب جب منافقین نے ایسی کوششیں کیں تو ان کو منھ کی کھانی پڑی ہے۔ اور اردو اپنے اصل رسم الخط (جو اس کا حقیقی حسن ہے) کے ساتھ بخیر و

سلامت رہی ہے۔

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو میں ایسا لٹریچر فراہم کریں جن کو پڑھنے کے لیے دیگر زبانوں سے وابستہ افراد بھی اردو پڑھنے پر مجبور ہوں۔ دراصل دوسروں میں مقبولیت حاصل کرانا۔ اور ان کے درمیان مقام پیدا کرنا کوئی ہنسی کھیل تو نہیں۔ اس کے لیے سخت محنت اور جانفشانی کے ساتھ ہی سچے اخلاص و ایثار کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ قابل اطمینان ہے کہ اردو کے اندر وہ صلاحیت وخوبی تو موجود ہے ہی جس کے ذریعہ وہ دلوں میں مقام حاصل کر لیتی ہے۔ فلمی نغمے اور اس کی شاعری اس بات کی زندہ مثال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم کوشش کریں تو اردو ہر جگہ مقبول ومحبوب ہوسکتی ہے۔

سوال: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: صرف لکھنا، پڑھنا جیسی ابتدائی باتیں ہی نہیں بلکہ وہ اردو کی اعلیٰ ڈگریوں اور اعزازی اسانید کی مالک ہیں۔ میری ایک بیٹی اردو میں بی ایڈ کرنے کے بعد دہلی میں اردو ٹیچر ہے۔ یہی حال میرے دوسرے بچوں کا بھی ہے۔ ایک بچی اردو میں گریجویشن کررہی ہے۔ دو اور بچے بھی اردو کی ہی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اردو کمپوزنگ، اردو تصنیف وتالیف صرف ہمارا شوق ہی نہیں ہمارا ذریعۂ معاش بھی ہے۔ اس لیے گھر کا پورا ماحول ہی اردو ہے۔ اردو ہمارا شوق، اردو ہماری پہچان اور اردو ہماری زندگی ہے۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: مذکورہ بالا تفصیلات کے تناظر میں یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے گھر میں اردو صرف زندہ ہی

مذکورہ بالا تفصیلات کے تناظر میں یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے گھر میں اردو صرف زندہ ہی نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری طرح ترقی کرتی رہے گی. ایسا میرا دعوہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذرائع بھی فراہم کر دیے ہیں. اردو کا ماحول بنا دیا ہے. کتابیں مہیا کرا دی ہیں. اردو کمپیوٹر دستیاب کرادیا ہے. سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کی محبت ان کے دل میں پیدا کر دی ہے. اردو کا ذوق ان کے ذہنوں میں سما دیا ہے. اس لیے بلا خوف و خطر کہہ سکتا ہوں کہ میرا گھر اردو سے ہمیشہ ہی معمور و معطر رہے گا.

نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری طرح ترقی کرتی رہے گی۔ ایسا میرا دعوہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذرائع بھی فراہم کردیے ہیں۔ اردو کا ماحول بنادیا ہے۔ کتابیں مہیا کرادی ہیں۔ اردو کمپیوٹر دستیاب کرادیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کی محبت ان کے دل میں پیدا کردی ہے۔ اردو کا ذوق ان کے ذہنوں میں سمادیا ہے۔ اس لیے بلا خوف وخطر کہہ سکتا ہوں کہ میرا گھر اردو سے ہمیشہ ہی معمور ومعطر رہے گا۔

سوال: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جاسکتی ہے؟

جواب: غیر اردو داں حلقوں میں فروغ اردو کے لیے بنیادی طور پر یہ ضروری ہے کہ اردو والے ان حضرات سے ربط وضبط بڑھائیں۔ ان کو اردو کی محفلوں میں آنے کی دعوت دیں۔ اردو کی کتابیں انھیں تحفے کے طور پر دیں۔ ان کو اردو ماحول فراہم کرایا جائے۔ اردو کی خوبیاں ان پر ظاہر کی جائیں۔ اردو کی مراعات ان کو دستیاب کرائی جائیں۔ اس طرح اگر ہم ان کے دلوں میں اردو کا مقام اور اس کی محبت پیدا کرانے میں کامیاب ہوگئے تو یقیناً وہ اردو کی طرف خود بہ خود کھنچے چلے آئیں گے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

جواب: ہمارے یہاں اسکول، کالجز تو کافی ہیں اور ان میں اردو تعلیم کا بھی بندوبست ہے۔ یونی ورسٹیز ہمارے علاقے میں کوئی ایسی نہیں ہے جس کو اردو کے تعلق سے کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ اسکول، کالجز اور مدارس میں تو اردو کا بہتر انتظام ہے۔ یہاں سے اردو کے اسکالر، مصنف، شاعر اور ادیب بھی نکلتے ہیں اور قرب وجوار اور اطراف واکناف میں اردو خدمات انجام دیتے ہیں۔ انھی کالجز سے بی ایڈ، پی ایچ ڈی کرنے کے بعد کچھ طلبہ وطالبات علی گڑھ یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، دہلی یونی ورسٹی، جے این یو، مولانا آزاد یونی ورسٹی اور ملک کی دیگر اعلیٰ سطح کی جامعات میں پہنچ کر اردو کی مزید تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ پھر اردو کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

سوال: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب: آپ نے اس سوال میں 'غیر سرکاری' کی شرط لگا کر اس کو محدود کردیا۔ اگر مکمل ذرائع سے بات کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی پریشانی تو فنڈ کی ہی ہے۔ کہ اردو سے اس وقت ایسے ہی افراد

ہمارے یہاں اسکول، کالجز تو کافی ہیں اور ان میں اردو تعلیم کا بھی بند و بست ہے. یونی ورسٹیز ہمارے علاقے میں کوئی ایسی نہیں ہے جس کو اردو کے تعلق سے کوئی خاص اہمیت حاصل ہو. اسکول، کالجز اور مدارس میں تو اردو کا بہتر انتظام ہے. یہاں سے اردو کے اسکالر، مصنف، شاعر اور ادیب بھی نکلتے ہیں اور قرب و جوار اور اطراف و اکناف میں اردو خدمات انجام دیتے ہیں.

جڑے ہوئے ہیں جو سماجی، معاشی اور اقتصادی طور پر کمزور وپس ماندہ ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ کوئی بھی کام کرنے کے لیے فنڈ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اور کوئی ذریعہ ایسا ہونا ہی چاہیے جس کے ذریعہ فنڈ کی فراہمی ممکن ہوسکے۔ تو یہ کام بہ آسانی اور بہ احسن طریقے پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

سوال: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالوں میں اردو تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

جواب: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالوں میں اردو کا انتظام تو ہے مگر زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ کہیں اساتذہ ہیں تو بچے نہیں ہیں۔ کہیں بچے ہیں تو اساتذہ کی آسامیاں خالی ہیں۔ کچھ اسکول ایسے بھی ہیں جہاں اردو مضمون ہی نہیں ہے۔ کہیں اردو کا ماحول ہی نہیں ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور سب سے بڑی پریشانی اردو تعلیم میں رکاوٹ کی یہ بھی ہے کہ اردو طالب علم آگے چل کر معاشی طور پر اردو سے کیا فیض حاصل کریں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کو روزی، روٹی سے جوڑا جائے۔ اس کا معقول ومؤثر طریقہ یہ ہے کہ اردو میں سائنسی وتکنیکی کتابیں تیار کرائی جائیں۔ جدید تکنالوجی سے اس کو جوڑا جائے۔ کاروبار سے مربوط کیا جائے۔ اردو طلبہ کو معاشی بحران سے نکالا جائے۔ اردو کی خالی اسامیوں کو پر کرایا جائے۔ اردو کے لیے سرکاری ملازمتوں میں جگہ مختص کرائی جائے۔ اردو والوں کو ان کی کارکردگی کی بنیاد پر اعزاز واکرام اور انعام وایوارڈ سے نوازا جائے۔ اس طرح ایسے لوگ بھی اردو سے وابستہ ہوں گے جو اب تک اس سے علیحدہ رہے ہیں۔ میری دانست میں یہ اردو کی سچی خدمت اور اس کی حقیقی معاونت ہوگی۔

■

Dr. Razaur Rahman Akif
Allama Iqbal Street
Mean Sarai
Sambhal - 244302 (UP)

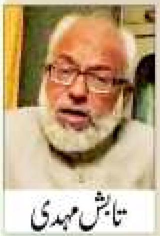

تابش مہدی

بیکل اتساہی
ایک درویش صفت سخن ور

3 دسمبر 2016 کو صبح چار بج کر چالیس منٹ پر دلی کے رام منوہر لوہیا ہسپتال میں ہم سب کے شفیق و محبوب اور ہندی و اردو کے ہر دل عزیز شاعر بھائی بیکل اتساہی (1928-2016) محبت و اخوت اور انسانیت و وطن دوستی کا گیت گا کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اِنا للّٰہ وَاِنّا الیہ رَاجِعُوْن۔ اس سانحے کو کئی برس ہوگئے۔ لیکن ہمیں ایسا لگتا ہے کہ وہ اب بھی ہم سب کے درمیان موجود ہیں۔ ان کی محبت و شفقت میں ڈوبی ہوئی آواز اب بھی ہمارے کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔ اُن کے ہندی اردو آمیز لفظوں سے ہمارے کان اب بھی لذت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مخصوص وضع قطع اور حلیہ و لباس میں ان کی شخصیت اب بھی ہم سب کی نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ حضرت بیکل اتساہی تھے بھی ایسے کہ انھیں برسوں نہ بھلایا جاسکے۔ اِن شاء اللہ وہ تا دیر اردو زبان و ادب اور ہندستان کی مشرقی تہذیب و ثقافت کو روشن کرتے رہیں گے۔

جناب بیکل اتساہی کا اصل نام محمد شفیع خاں لودی تھا۔ لیکن پوری اردو دنیا میں وہ صرف بیکل اتساہی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ ان کا اصل نام محمد شفیع خاں لودی تھا۔ وہ کچھ عرصے رہبر بلرام پوری کے نام سے جانے جاتے رہے، پھر بیکل بلرام پوری لکھنے لگے، کچھ دنوں بیکل وارثی بھی رہے لیکن پنڈت جواہر لعل نہرو نے اُنھیں بیکل اتساہی کر دیا۔ وہ 1928 میں ضلع گونڈہ کی تحصیل اُترولہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں رموا پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ضلع گونڈہ کا یہ حصہ اب ضلع بلرام پور میں شامل ہوگیا ہے۔ ان کے والد محترم جناب محمد جعفر خاں اپنے علاقے کے بڑے زمین داروں میں تھے۔ اپنے زمانے میں پورے علاقے میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

بیکل صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے قریبی شہر بلرام پور کے ایم پی پی انٹر کالج سے اُنھوں نے انٹر میڈیٹ کیا۔ چونکہ انھیں شعر گوئی کا ذوق فطری طور پر حاصل تھا اور اللہ نے طبیعت کو موزونی بھی عطا کی تھی، اس لیے بہت کم عمری میں انھوں نے وادیِ سخن میں قدم رکھ دیا تھا۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ الفاظ و تراکیب کے استعمال پر انھیں کامل دست رس حاصل تھی۔ سلاست و سادگی سے ان کو خصوصی مناسبت تھی۔ تکلف و تصنع سے وہ اجتناب کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں ہندی و اردو کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ سماج اور زندگی سے اٹوٹ رشتہ اور محبت، خیر خواہی اور قومی و ملی یک جہتی ان کی شاعری کی پہچان ہے۔

بیکل اتساہی شاعری میں کلاسیکی قدروں کے پاسدار تھے۔ ان کا شعری خمیر کلاسیکی ادب سے اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری سے تلسی، کبیر، ملک محمد جائسی اور نظیر اکبر آبادی کی شعری روایت کو ارتقا بخشا ہے۔ ہم ان کی غزلیں پڑھیں یا نظمیں یا گیت ہر جگہ ہمیں مذکورہ بالا چاروں بزرگ شعرا کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

بیکل اتساہی ایک انسان دوست شاعر تھے۔ انھوں نے جس دھرتی پر جنم لیا تھا، اس سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ گاؤں کی صبح و شام کو وہ دل سے عزیز رکھتے تھے۔ وہ خالص ہندستانی شاعر تھے۔ بعض لوگوں نے انھیں شاعری کا سنت اور درویش بھی کہا ہے۔

بیکل اتساہی نے ترقی پسند ادبی تحریک کا عروج بھی دیکھا تھا اور اس کا زوال بھی ان کی نگاہوں میں تھا، انھوں نے جدیدیت کے چمک دار نعروں کو بھی سنا اور اُس کی ذلت و رسوائی بھی ان کے سامنے تھی۔ ان سب کے علاوہ بھی انھوں نے بہت کچھ دیکھا، لیکن وہ کبھی کسی مصنوعی چمک یا نعرے سے متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی روایت کو سامنے رکھا اور اسی کو اپنی شاعری کا محور قرار دیا۔ شگفتہ و شائستہ اور سادہ و دل کش انداز میں اپنی غزلوں، نظموں اور گیتوں کے وسیلے سے عصری رجحانات و تغیرات کو پیش کرنا ان کا خاص ہنر تھا۔ ان کے کلام کا قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے عظمتِ رفتہ کا سراغ لگانے کی بھی کوشش کی ہے اور حالات حاضرہ پر مہذب و باوقار تبصرے بھی کیے ہیں۔ انھوں

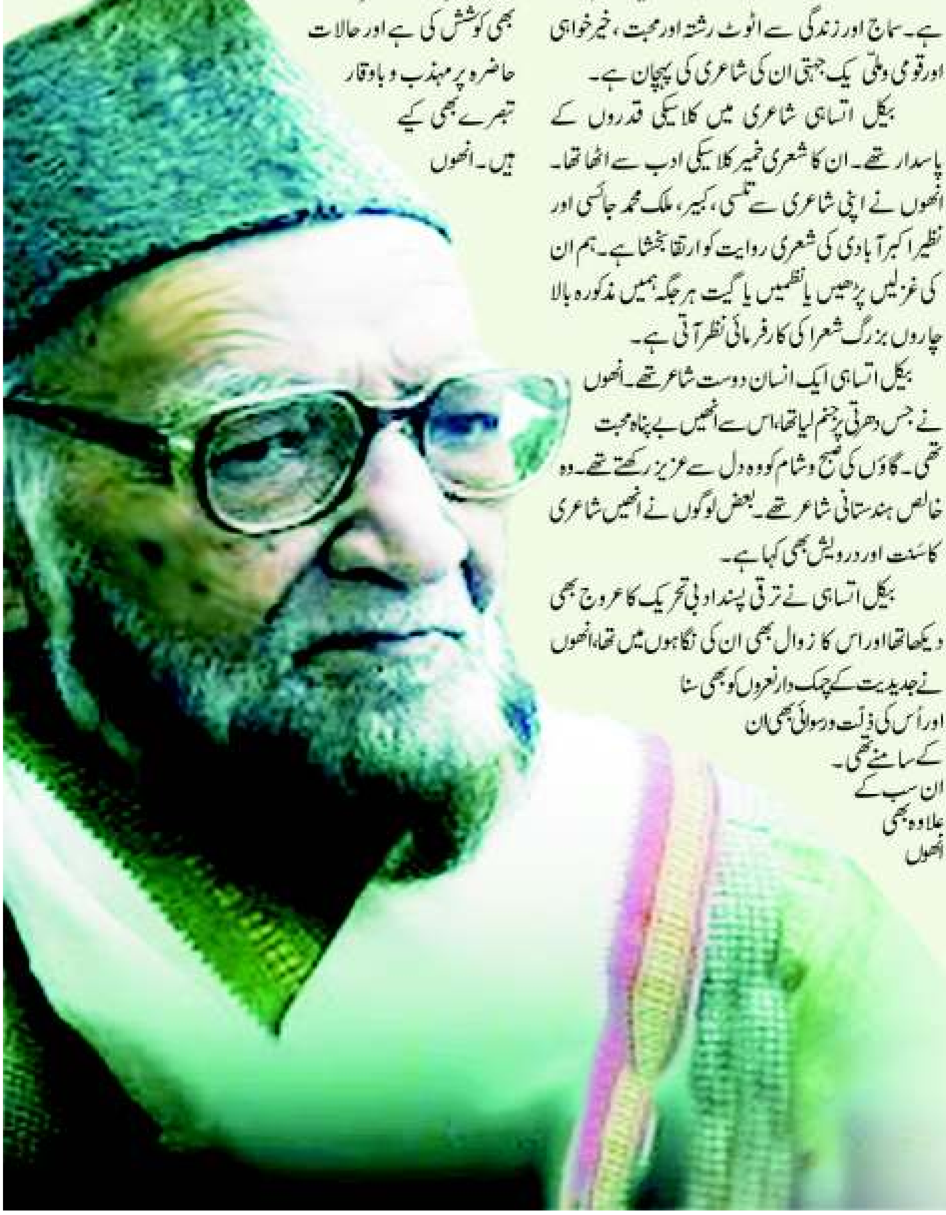

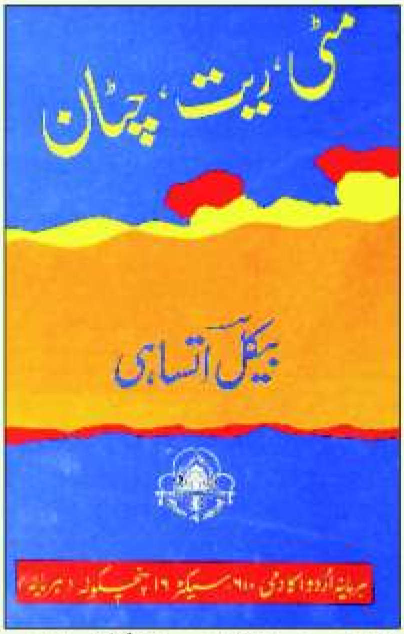

نے انسانیت اور باہمی میل ملاپ کے نغمے بھی سنائے ہیں اور فرقہ واریت اور باہمی تنگ دلی و منافرت پر کھل کر تنقید بھی کی ہے۔

1975 میں بیکل صاحب کا ایک شعری مجموعہ 'پروائیاں' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا:

میں بنیادی طور پر نظموں اور گیتوں کا شاعر ہوں۔ نظمیں تفصیل و توضیح کی متقاضی رہتی ہیں۔ مگر میرے گیتوں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے سبک، شیریں اور نرم لہجے میں گفتگو کرنے کا انداز حاصل ہوا۔ یہی شیرینی اور شگفتگی میری غزلوں کے تخلیقی عمل کے لیے مشعلِ راہ بنی۔ میری تشکیلِ فکر اس ہندستان میں ہوئی، جو غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ چکا تھا، مگر غلامی کی لعنتوں سے مکمل طور سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ میرے سامنے حسن و عشق کے بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ وہ مسائل تھے، جن سے ہماری انسانیت مجموعی طور پر اس دور میں دو چار رہی ہے۔"

درج ذیل اشعار سے بیکل اتساہی کے شعری رویے کی تصویب ہوتی ہے:

بیچ سڑک پر لاش پڑی تھی اور یہ لکھا تھا
بھوک میں زہریلی روٹی بھی میٹھی لگتی ہے

لباس قیمتی رکھ کر بھی شہر ننگا ہے
ہمارے گاؤں میں موٹا، مہین کچھ تو ہے

لیے کائنات کی وسعتیں، ہے دیارِ دل میں بسی ہوئی
ہے عجیب رنگ کی یہ غزل، نہ لکھی ہوئی، نہ پڑھی ہوئی

قلم سے نور تو کاغذ سے نکہتیں پھوٹیں
یہ حرف و لفظ یہ حسن کلام آپ کے نام

جناب بیکل اتساہی طویل مدت تک شاعری کے افق پر ستاروں کے مانند رخشندہ و تابندہ رہے۔ وہ شاعری کی اُس روایت کے بانی و موجد تھے، جواُن سے پہلے اچھوتی تھی۔ کسی نے نہ اس کی ہمت کی اور نہ کسی کو سوجھی۔

جناب بیکل اتساہی نعت کے راستے سے وادیِ شاعری میں داخل ہوئے تھے۔ محافلِ میلاد اور سیرت النبیؐ کے جلسوں میں انھیں بڑے اہتمام سے مدعو کیا جاتا تھا اور جہاں اور جس جلسے میں وہ شریک ہوتے تھے، عوام کی بڑی تعداد محض ان کی وجہ سے شریک جلسہ ہوتی تھی۔ یہ عجیب اتفاق بلکہ حسن اتفاق کہیے کہ وہ نعت گوئی کے ذریعے سے شاعری میں آئے اور ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ بھی نعت ہی کا تھا۔ انھوں نے اجمیر کے ایک نعتیہ مشاعرے میں شرکت کی۔ اس کے بعد کسی مشاعرے یا محفل میں شرکت کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ کی طرف سے طلبی آگئی۔ گویا ان کا خاتمہ بالخیر نعت ہی پہ ہوا۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بھائی بیکل اتساہی نے ایک بار بتایا تھا کہ جب وہ شاعری کی دنیا میں آئے، ہر طرف ان کے چرچے ہونے لگے اور جلسوں اور مشاعروں میں ان کی مانگ ہونے لگی تو یہ بات ان کے والد محترم جعفر خاں لودی مرحوم کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ انھیں یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ ان کا بیٹا ایک شاعر کی حیثیت سے شہرت و ناموری حاصل کرے۔ شاعری کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے سے اس قدر ناراض تھے کہ بیکل صاحب کے قول کے مطابق وہ وقت قریب تھا کہ وہ انھیں عاق کرکے اُنھیں زمین جائداد سے بے دخل کر دیتے۔ اسی دوران میں خوش قسمتی سے جعفر خان کو سفرِ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں انھوں نے مکہ و مدینہ کی مختلف جگہوں پر زائرین حرمین کی زبانی نعت رسول سنی۔ انھیں وہاں کی نورانی فضا میں حمد و نعت کے نغمے بہت اچھے لگے۔ اسی دوران میں کسی نے انھیں بتایا کہ یہ نعتیں ہندستان کے ایک شاعر بیکل بلرام پوری کی ہیں۔ یہ سنتے ہی ان کا دل فخر و مسرت سے لبریز ہوگیا۔ انھوں نے وہیں سے اپنے لائق بیٹے کو خط لکھ کر مبارک باد دی۔ اس کے بعد ان کی محبتوں اور شفقتوں کے سب سے زیادہ مستحق، ان کی اولاد میں محمد شفیع خاں لودی عرف بیکل اتساہی بلرام پوری ٹھہرے۔

اللہ تعالیٰ نے جناب بیکل اتساہی کو بے پناہ مقبولیت و محبوبیت سے سرفراز کیا تھا۔ میرے علم کی حد تک بیکل اتساہی وہ پہلے شاعر تھے، جنھیں ہندستان سے باہر شہرت و ناموری حاصل تھی اور متعدد ممالک میں انھیں اعزاز کے ساتھ بلایا گیا۔ دوسرے شعرا نے ان کے بعد ہی سرحد کے پار قدم رکھا۔ انھیں ہندستان کے پدم شری، پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ راجیہ سبھا کے ممبر بھی نام زد ہوئے تھے۔ حکومت اُترپردیش اور ملک کی دوسری اردو اکادمیوں کی طرف سے بھی انھیں اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ ہندستان کے بے شمار علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کے وہ سرپرست و سربراہ بھی تھے۔

بیکل صاحب مقبولیت کی حدوں کو پار کر چکے تھے۔ بڑے بڑے مشاعروں میں ان کی شرکت ناگزیر تصور کی جاتی تھی۔ اللہ نے کلام کے ساتھ آواز کچھ ایسی دی تھی کہ جو سنتا تھا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ سنا ہے کہ کسی نعتیہ مشاعرے میں بیکل صاحب شریک تھے۔ کچھ خواتین چھتوں پر بیٹھ کر ان کا کلام سن رہی تھیں۔ ان میں ایک عورت ان کے نغمہ و ترنم سے اس قدر متاثر ہوئی کہ وہ چھت سے کود پڑی۔ ان کی آواز اور ترنم کی دل کشی کی یہ کیفیت ان کی زندگی کے آخری دم تک رہی۔ ان تمام مقبولیتوں اور ہر دل عزیزیوں کے باوجود میں نے کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ بڑے سے بڑے مہنگے مشاعروں پر وہ چھوٹے اور نہایت کم معاوضے والے نعتیہ مشاعروں کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ محض ان کی محبت رسول کی بات تھی۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔

بیکل اتساہی وہ پہلے شاعر تھے، جنھیں ہندستان سے باہر شہرت و ناموری حاصل تھی اور متعدد ممالک میں انھیں اعزاز کے ساتھ بلایا گیا۔ دوسرے شعرا نے ان کے بعد ہی سرحد کے پار قدم رکھا۔انھیں ہندستان کے پدم شری، پدم بھوشن جیسے اعزازات سے نوازا گیاتھا۔ راجیہ سبھا کے ممبر بھی نام زد ہوئے تھے۔ حکومت اُترپردیش اور ملک کی دوسری اردو اکادمیوں کی طرف سے بھی انھیں اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا گیا۔ ہندستان کے بے شمار علمی ، ادبی اور تعلیمی اداروں کے وہ سرپرست و سربراہ بھی تھے۔

جناب بیکل اتساہی کے نام اور کلام سے میرے کان کب آشنا ہوئے، قطعیت کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ نوشت و خواند کی معمولی صلاحیت پیدا ہو جانے کے بعد ہی سے میں نے مختلف حوالوں سے ان کے چرچے سن لیے تھے۔ ان کی نعتیں اکثر وقفے وقفے سے سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ میں خود بھی لحن و ترنم کے

ساتھ ان کا مشہور نعتیہ گیت:

ڈولے سنن سنن، پروائی پون ہائے کتنی سہانی ہے رات
کملی والے پیا، تمرے لاگوں چرن آمنہ کے للن، شاہِ دیں سرورِ کائنات

گا گا کر جلسوں اور نجی محفلوں میں سنایا کرتا تھا۔ وہ نعت بھی میری زبان پہ رہتی تھی، جس کا مطلع غالباً اس طرح تھا:

ہر نظر کانپ اٹھے گی محشر کے دن خوف سے ہر کلیجا دہل جائے گا
کملی والے کا ہوگا عجب مرتبہ حشر کا سارا نقشہ بدل جائے گا

اُس وقت میں کم سنی کی وجہ سے اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ یہ بیکل کون صاحب ہیں؟ یا کس مذہب و مسلک سے ان کا تعلق ہے؟ بس مجھے ان کے اشعار اچھے لگتے تھے، ان کی دھن بھی مست کردینے والی ہوتی تھیں، اس لیے میں بھی مست اور مگن ہوکر اُنھیں چھوٹی بڑی محفلوں میں سنایا کرتا تھا۔ بریلوی دیوبندی کے جھگڑوں سے مجھے بہت بعد میں واقفیت ہوئی۔ اس وقت ہوئی جب میں نے تعلیم کے سلسلے میں اپنے وطن پرتاپ گڑھ سے باہر قدم رکھا اور الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں داخلہ لیا۔ لیکن اپنی خواہش بسیار کے باوجود بیکل اتساہی کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اُنھیں میں نے سب سے پہلے 1972 کے اوائل میں اس وقت دیکھا، جب وہ 'جشن نازش پرتاپ گڑھی' کے مشاعرے میں پرتاپ گڑھ تشریف لائے ہوے تھے۔ یہ جشن بھی بڑی حد تک بیکل صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس مشاعرے کی نظامت بھی بیکل صاحب نے کی تھی۔ جب کہ صدارت بیگم حامدہ حبیب اللہ نے فرمائی تھی۔ اسی مشاعرے میں میں نے سب سے پہلے حضرت شمیم کرہانی، انور مرزا پوری اور خمار بارہ بنکوی کو قریب سے دیکھا تھا۔ مشاعرے کے آغاز میں بیکل صاحب نے حضرت نازش پرتاپ گڑھی کے سلسلے میں جو جامع تقریر کی اور اُن کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس سے ان کی ادبی و تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوا اور نازش پرتاپ گڑھی سے ان کی بے غرض گہری محبت و تعلقِ خاطر کا بھی۔ اس ملاقات کے بعد ان سے میری کتنی ملاقاتیں رہیں، کہاں کہاں کی ہم سفری و معیت کا شرف حاصل رہا اور مجھ پر ان کی کیا کیا عنایتیں رہیں، ان سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اُن کی فکری بصیرت، شعری ندرت اور خرد نوازی کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ میرے والدِ محترم کے ہم عمر تھے، لیکن وہ مجھے ہمیشہ تابش بھائی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

میری کتاب شفیق جون پوری: ایک مطالعہ چھپ کر آئی تو میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ پھر جب استاذ محترم علامہ شہباز صدیقی امروہوی سے متعلق میری کتاب 'عرفانِ شہباز' شائع ہوئی تو میں نے ایک عزیز کے ذریعے سے اُسے بھی ان تک پہنچایا۔ ممبئی کی ایک ملاقات میں تپاک سے ملے۔ بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ فرمایا: تابش بھائی! آپ نے شفیق جون پوری۔ ایک مطالعہ لکھ کر میرے استاذ کو دوبارہ زندہ کردیا تھا اور عرفانِ شہباز لکھ کر اپنے محترم استاذ کو حیات دوام بخش دیا۔ آپ کتنے اچھے ہیں پیارے بھائی! اپنا کام بھی کرتے ہیں اور دوسروں کا بھی۔

گرچہ بیکل اتساہی خالص عوامی شاعر تھے۔ ان کی مقبولیت و محبوبیت زیادہ تر عوام میں تھی۔ لیکن خواص میں بھی ان کی قدر و منزلت کچھ کم نہیں تھی۔

فراق گورکھ پوری نے کسی موقعے پر کہا تھا:

'بیکل اتساہی کے ہاں جن الفاظ کا تصرف ہے، ان میں علامات کی بہتات کم اور خیالات کا بہاؤ زیادہ ہے۔ ان کے فکر و فن میں کچھ اس طرح کی وابستگی ہے کہ کلام میں ہندی اور اردو کے حسین سنگم سے یک جہتی کا رنگ پھوٹ نکلا ہے اور ان کی غزلوں میں بھی زندگی اور کائنات کے تمام محرکات موجود ہیں اور گیتوں میں بھی۔ ان کے ہاں زندگی اور سماج کے افادی پہلو کی بڑی حسین و دل کش تفسیر ملتی ہے۔''

فراق گورکھ پوری شاعر یا ناقد جیسے بھی رہے ہوں، لیکن ان کے مزاج میں کچھ ایسی تنگی تھی کہ وہ کسی معاصر کو بہت کم گردانتے تھے۔ بیکل صاحب کی شاعری کے سلسلے میں ان کے منقول بالا تاثرات غیر معمولی اہمیت کے حامل

ہیں۔ بیکل صاحب کے اس قسم کے اشعار سے ان کی بلندیٔ فکر، گہرائی خیال اور ندرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں جب بھی کوئی اچھوتا کلام لکھتا ہوں
تو پہلے ایک غزل تیرے نام لکھتا ہوں
بدن کی آنچ سے سنولا گئے ہیں پیراہن
میں پھر بھی صبح کے چہرے پہ شام لکھتا ہوں
زمین پیاسی ہے، بوڑھا گگن بھی بھوکا ہے
میں اپنے عہد کے قصے تمام لکھتا ہوں
چمن کو اوروں نے لکھا ہے مے کدہ بردوش
میں پھول پھول کو آتش بہ جام لکھتا ہوں
دماغ عرش پہ ہے خود زمیں پہ چلتے ہیں
سفر گمان پہ ہے اور یقیں پہ چلتے ہیں
نہ جانے کون سا نشہ ہے ان پہ چھایا ہوا
قدم کہیں پہ ہیں پڑتے کہیں پہ چلتے ہیں

مری تباہی کا باعث جو ہے زمانے میں
اُسی کو اب مرا کاہے خیال ہونے لگا
ہوائے عشق نے بھی گل کھلائے ہیں کیا کیا
جو میرا حال تھا وہ تیرا حال ہونے لگا
تمھارے قد سے اگر بڑھ رہی ہو پرچھائیں
سمجھ لو دھوپ کا وقتِ زوال آنے لگا

فرش تا عرش کوئی نام و نشاں مل نہ سکا
میں جسے ڈھونڈ رہا تھا، مرے اندر نکلا

بیکل اتساہی کی شاعری ایک سمندر ہے۔ اس میں غوطہ زنی کرنے والے کو طرح طرح کے قیمتی ہیرے جواہر ملیں گے۔ ان کی شاعری کا احاطہ کسی ایک مضمون یا مقالے میں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ 3/دسمبر 2016 کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ اب وہ ہم سے اتنے دور ہوچکے ہیں کہ ان سے ملاقات مشکل نہیں ناممکن ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے فکر و فن کا جو سمندر دنیا کے حوالے کیا ہے۔ اس کی غوطہ زنی تا دیر ہوتی رہے گی اور ناقدینِ فن اُس میں حسبِ توفیق و بصیرت لعل و جواہر دریافت کرکے علم و ادب کے شائقین کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

مرنے والے مر کے بھی مرتے نہیں
اور جیتے جی بھی مرجاتے ہیں لوگ

■

Dr. Tabish Mehdi
G5/A - Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025 (INDIA)
Ph:26970736 Cell: 9818327947
E-mail: drtabishmehdi@gmail.com

ملکہ نسیم

انور جلال پوری

مرے نقشِ قدم آگے کی منزل کا پتہ دیں گے

ایودھیا کے سنسکاروں کی حفاظت کرتے ہوئے، فیض آباد کی وراثت کو دامن میں سمیٹے ہوئے جلالپور سے ایک نام ابھر کر سامنے آیا جس میں اکبری جاہ و جلال کے ساتھ میر انیس کا وقار، بزرگانِ دین سے قلبی لگاؤ، اسلامیات پر گہری نگاہ، خطابت کا بھرپور انداز، پیار و خلوص کا پیکر، سماجوادی نظریات کا حامی، اسلاف کی دستار سمیٹنے کا فن، سیرتِ خلفائے راشدین، خیام کی رباعیات کو فارسی سے ہندی میں آنے کا سلیقہ' گیتا انجلی' کو اردو شاعری میں لکھنے کا ہنر، کھارے پانی کو میٹھا بنانے کا طریقہ، خوشبو کی رشتے داری سے جاگتی آنکھیں، روشنائی کے سفیر پر ضرب لا الہ، بعد از خدا جمال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے حرفِ ابجد تک کا سفر طے کرنے والا کوئی اور نہیں یہ ایک البیلا شاعر ہے انور جلالپوری۔

یہ جو علم ہوتا ہے کتابوں میں نہیں ہوتا۔ یہ آدمی کے اندر ہوتا ہے، ابھی تک اُن کے ہم عصروں میں ایک بھی ادیب ایسا نہیں دکھائی دیا جس کی آواز کانوں سے ٹکراتے ہی راہی کے قدم تھام لیتی ہو یہ اعزاز بس انور جلالپوری کے حصے میں ہی آیا کہ ان کی بات اور شخصیت مخاطب کی ساری کی ساری توجہ ایک ہی آن میں جذب کر لیتی ہے۔ انور صاحب صرف گفت و شنید کے میدان کے ہی شہسوار نہیں ہیں بلکہ تحریر پر بھی انھیں حیران کن قدرت حاصل ہے۔ انور صاحب کی عزت و احترام کا سبب ان کے الفاظ ہی بنے جو کاغذ پر منتقل ہوئے۔ انور جلالپوری ایک انجمن کا نام ہے۔

انور صاحب کی شاعری پڑھ کر پتہ لگتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہیں اور یہ چیزیں کبھی استعارے، کبھی علامتوں اور کبھی تلمیحات کی صورت میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا ثبوت مذکورہ مجموعات سے فراہم ہو جاتا ہے، جہاں حمد، نعت، منقبت اور سلام جیسی تقدیسی شاعری اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ نما نظر آتی ہے اس کے علاوہ دیگر نظموں، حتیٰ کہ غزلوں میں بھی ان کی پاکیزگی فکر یعنی مذہب اسلام سے والہانہ عشق جھلکتا ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ اگر کوئی صاحبِ سخن کسی مخصوص صنفِ سخن میں کمال حاصل کر چکا ہوتا ہے تو کسی دوسری صنف کے اصول و قواعد کو نبھانے سے قاصر رہتا ہے، کیونکہ ہر صنف کے اپنے الگ الگ تقاضے ہوتے ہیں اور بہ یک وقت ان کو نبھانا سہل نہیں لیکن ان کا خاصہ یہ ہے کہ انھیں ادب کی مختلف اصناف پر دسترس حاصل ہے چاہے وہ نظم ہو یا غزل وہ سب کا حق ادا کرتے ہیں۔ کسی شاعر کی کامیابی کا دارومدار بہت حد تک اس کے موضوعات کے انتخاب، لفظوں کے حسن استعمال، فنکارانہ اظہار اور لہجے کی انفرادیت، پر ہوتا ہے انور صاحب کو اظہار پر کامل قدرت حاصل ہے اور وہ اپنی بات اتنے سلیقے سے کہتے ہیں کہ قاری کو وہ اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اجتماعی احساسات و انفرادیت تجربات اور نجی جذبات کو اس قدر خوش اسلوبی سے شعر میں ڈھالا ہے کہ بات دل سے نکل کر دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کا ہنر میر کی شاعری میں ملتا ہے اور ہزار غم کے باوجود مسکرانے کا حوصلہ اور جینے کی آرزو جو غالب کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے یہ دونوں خوبیاں انور جلالپوری کی شاعری میں بہ یک وقت موجود ہیں۔ خواہ موجودہ دور کی افراتفری، دہشت گردی اور فرقہ واریت پر قلم اٹھائیں یا اپنے نجی غموں کو موضوع بنائیں ہر جگہ ان کا قلم ذاتی غم کو غم دوراں بنا دیتا ہے اور وہ ہر جگہ قاری کو اپنے ساتھ شریک رکھتے ہیں۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرتے ہیں اس لیے کہتے ہیں،

بغض اور نفرت کی کس جانب سے آئی ہے ہوا
اے خدا اس شہر میں پہلے یہ بیماری نہ تھی

یا

ہم کعبہ کاشی کے راہی ہم کیا جانیں جھگڑا بابا
اپنے دل میں سب کی الفت اپنا سب سے رشتا بابا

انور جلالپوری کے تخلیقی رویوں کے اس پس منظر میں ان کے بدلے ہوئے طرز احساس نے بھی اپنے معاصرین کے درمیان ان کی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے۔

ادب کی ایک سمت ذات اور وجود کے تجربے کے ساتھ ہمیشہ سے مخصوص رہی ہے تاہم تنقید کے ساعت شکن شور نے ہمارے فن کاروں کو ان چند نمایاں مفاہیم و مضامین کی تکرار تک محدود کر دیا جن کا تعلق داخل کی دنیا سے تھا اور جو وجود اور ذات کے تجربے کے نام پر ادا کیے جاتے تھے۔ انور صاحب اپنی شاعری میں اپنی مٹی کی بو باس، موسموں کی رنگارنگی یہ رشتوں کی تقدیس اور فطرت کی پرستاری کے جن تجربوں سے گزرتے ہیں اسے ہندوستانی روایت سے ربط دے کر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف قدیم شاعری اور اس کی جمالیات نے انور جلالپوری کے شعری کردار کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا، دوسری طرف انھوں نے جدیدیت سے بھی بہت کچھ اخذ کیا ہے جس نے ان کے اشعار کو ایک نئی وضع فراہم کی جو اردو شاعری کے مانوس اسالیب سے کافی حد تک مختلف تھی۔ انور صاحب کی تخلیقات محض فن کی تخلیق نہیں ہیں بلکہ اس کی ترجمان بھی ہوتی ہیں۔ فن اور زبان کسی ادیب کے لیے ایک اہم موضوع ہو سکتا ہے لیکن کسی سرگرم تخلیق کار اور قاری کا قطعی نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنی تخلیق کے متوازی ایک سماجی کارکن بھی ہوتا ہے اس طرح ان کی ساری تخلیقات کو جوڑتے ہوئے اگر قاری ان کے دل کے نہاں خانے میں داخل ہو تو ان کی شاعرانہ عظمت کا راز بھی افشا ہوتا ہے۔ جہاں بالکل بھیٹر کی آتما کی طرح انور جلالپوری کا مضطرب دل کرب محسوس کرتا نظر آتا ہے۔ انور بھائی کی نظمیں جینے کی نئی راہ بناتی ہیں ان کی نظموں میں یادوں کے وہ خزانے دفن ہیں۔ یہ نظمیں اپنے پڑھنے والوں کو اس دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں نیکی اور بدی کی عظیم الشان جنگ روز ازل ہی سے جاری ہے۔ ان کی نظموں کے طرز بیان میں ایجاز و اختصار کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ دراصل اپنے خیال یا تاثر کو حد درجہ مکمل طریقے پر بیان کرنے کی جستجو ہے۔ انور جلالپوری کے یہاں کثرت سے تاریخ کا استعمال نظر آتا ہے جسے وہ بڑے سلیقے سے برتتے ہیں ان کی شاعری میں خارجی حقیقت الفاظ کے ذریعے اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ شاعر کے ذہن کی تصویر قاری کے سامنے ابھر کر آجاتی ہے۔ انور صاحب اپنے طرز بیان سے داخلی اور خارجی مظاہر کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں جذبہ رنگ تاثر بھی کچھ شامل ہوتا ہے وہ ہر بات کو احساس کے ذریعے بیان کرتے ہیں، خارجی حقیقتیں ان کی شاعری میں جوں کی توں نہیں آتیں بلکہ اس کا احساس بیان ہوتا ہے طرز بیان کے اس انوکھے انداز میں احساس کو مربوط طریقے پر مخصوص آہنگ کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ایک دبا ہوا حزنیہ لہجہ پیدا ہو جاتا ہے جس میں مستقبل کی بے یقینی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس حزنیہ لہجے میں قنوطیت بالکل نہیں ہے بلکہ وہ دکھ اور کرب کے ملے جلے جذبوں کا احساس ہوتا ہے۔ نظمیہ شاعری کا اظہار بیان اگر لچک دار اور تخلیقی حربوں سے آراستہ نہ ہو تو شاعری کے سپاٹ نثری بیانات بن جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں انھوں نے اپنی نظموں میں تشبیہ استعارہ علامت تضاد کا نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ گو ان کی شاعری سماجی، سیاسی اخلاقی مسائل کا ذکر کرتی ہے لیکن انھوں نے نہ تو انقلابی مکھوٹا پہنا نہ ہی سر منبر دانائے راز کا وعظ پڑھا۔ یہ صفات ان کو آسانی سے حاصل نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا ناقدانہ ذہن ان کے تخلیقی ذہن کی برابر نگہداشت کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سادہ لوحی اور سادہ گفتاری کی جگہ احساسِ بیان کی پیچیدگی نے لے لی ہے۔ لاحاصلی اور مایوسی کے آخری نقطے پر پہنچ کر زندہ رہنے کے لیے زندگی سے مفاہمت شکست خوردگی کے زرد چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ثبت کرنے کا تاثر پیدا کرتی ہے۔

جن لوگوں نے انور صاحب کے کلام کا سلسلہ وار مطالعہ کیا ہے وہ اس سے ضرور متفق ہوں گے کہ وہ ایک ہمہ جہتی شاعر ہیں ان کے کلام میں سادہ بیانی خوش رنگینی فکر اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ ایک جاں گداز کیفیت بھی موجود ہے۔ جس میں تصنع یا بناوٹ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا ان کی شاعری میں ایک خاص رکھ رکھاؤ متانت اور سنجیدگی ابھر کر سامنے آتی ہے، زمانہ فہمی اور خود شناسی کی جھلکیاں بہ تدریج وقت اور ماحول کی مناسبت سے واضح ہو کر شعری پیکر تراشتی ہیں، رشتوں کی بے ثباتی، اُن کا ادھورا پن ان کا بنتا ٹوٹنا اور اس عمل یا ردعمل سے پیدا شدہ کرب کا احساس انور جلالپوری کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔

عشق کے روایتی موضوع عاشق اور معشوق کے متعین کردار اور تہذیب عاشقی کے تسلسل میں اگر کوئی چیز غزل کے شاعر کے لیے امتیاز کا باعث ہو سکتی ہے تو وہ نئے عہد میں عاشق کا تبدیل شدہ طرز احساس ہے۔ شاعر کے محسوساتی دائرے میں یوں تو ہر وہ شعری تجربہ شامل ہو سکتا ہے جو کسی نہ کسی لحاظ سے جمالیاتی شعور کو بیدار اور متحرک کر سکتا ہو۔ انور بھائی کے یہاں عشق کا تجربہ شعری اہتمام کے ساتھ طرز احساس کی تبدیلی سے ہم آمیز ہو کر غزل کے رائج تصور عشق سے بالکل مختلف دکھائی دینے لگتا ہے شاید یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں کچھ الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ غور کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں اقسام کے الفاظ کے مابین غیر معمولی صفاتی ربط موجود ہے۔ 'راہرو سے رہنما تک' سیرت خلفائے راشدین ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو کسی مخصوص مکتب خیال کے افراد تک محدود کر دینے کے بجائے اسے آفاقیت کے تناظر میں پیش کیا انھیں اس بات کا احساس ہے کہ وسعتِ فکر دائمی صداقتوں اور سدابہار عظمتوں کی اَن مٹ داستان ہے۔ رویندر ناتھ ٹیگور کی 'گیتانجلی' کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی بھرپور کوشش نئے تلازمات، نئی امیجری اور پیرایۂ اظہار کے جدید پیکروں کو نیا لب و لہجہ عطا کیا ہے۔

اس مضمون کی روشنی میں انور جلالپوری کی شاعری کی نوعیت اور خصوصیت کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے زندگی، معاشرہ، کائنات، تاریخ اور تہذیب کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور موضوعیت سے مملو ان تجربوں کو شعری پیراہن عطا کیا ہے۔ اگرچہ ان کا غم ذاتی ہے لیکن انھوں نے اسے اتنی وسعت دے دی ہے کہ اس میں پورا عہد سمٹ آیا ہے اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عظیم شاعری تبھی وجود میں آسکتی ہے جب اس میں آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی کا عنصر شامل ہو۔

ان کی شاعری کا اپنا انداز بیان ہے جس میں ایک توانا فکری نظام نظر آتا ہے ان کا منفرد رنگ و آہنگ اور لہجہ اس کی شیرینی و نغمگی قاری کی نظر کو روک لینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ انور جلالپوری نے غزل اور نظم دونوں میں اپنی انفرادیت کے ثبوت دیے ہیں۔ اس شعر کے ساتھ یہ مضمون ختم کرتی ہوں۔

بتائیں آؤ ہم روداد صحرا
ہمارے پاؤں میں چھالے بہت ہیں

■

Maleka Naseem
3543, Barion ki Gali
Moti Katla Bazar
Jaipur - 302002 (Rajasthan)

حادثاتی ناموں سے مشہور عربی کے چند شعرا

شمس کمال انجم

مشاہیر علم وادب میں بے شمار شخصیات ہیں جنھیں اپنے اصل نام سے شہرت کے ہفت آسماں پر پہنچنے کا شرف حاصل ہوا لیکن بے شمار ایسے بھی ہیں جو اپنے اصل نام کے بجائے کسی لقب یا کنیت سے مشہور ہوئے۔ یا پھر ان کی زندگی میں رونما ہونے والا کوئی حادثہ، کوئی واقعہ ان کی زندگی کا شناخت نامہ بن گیا اور اسی سے انھیں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے اصل نام تاریخ کے پردے میں کہیں روپوش ہوگئے۔ آپ ذرا کسی عربی اسکالر سے پوچھیے کہ کیا آپ ثابت بن جابر، زیاد بن معاویہ، غیاث بن غوث تمیمی، احمد بن حسین جعفی، غیلان بن عقبہ وغیرہ عرب شعراء کو جانتے ہیں تو شاید جواب نفی میں ہوگا۔ لیکن اگر آپ پوچھیں کہ کیا آپ تابط شرًا، نابغہ ذبیانی، اخطل، متنبی، ذوالرمہ جیسے شعرا سے واقف ہیں تو بیشتر کا جواب اثبات میں ہوگا۔ ایسے شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اپنے اصل نام کے بجائے اپنے لقب، کنیت، شعر میں وارد کسی لفظ یا کسی حادثے سے شہرت کے حامل بنے اور وہ ان کے اصل نام پر اس طرح غالب آگئے کہ ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئے۔ ذیل میں ہم ایسے ہی کچھ مشاہیر شعراء کے بارے میں گفتگو کریں گے جنھیں ان کے اصل نام کے بجائے کسی حادثاتی نام، لقب یا ان کے شعر میں وارد کسی لفظ سے شہرت حاصل ہوئی۔

تابط شرًا

زمانۂ جاہلیت میں شاعروں کا ایک گروہ ایسا تھا جنہیں صعالیک یعنی خانماں برباد شعراء کہا جاتا تھا۔ یہ شعراء صحرا میں رہتے، فاقہ مستی کرتے یا لوٹ پاٹ کرکے گزراوقات کرتے تھے۔ انہی شاعروں میں ایک 'تابّطَ شرًا' بھی تھا۔ اس کا اصل نام ثابت بن جابر تھا۔ تابط شرا اس کا لقب تھا۔ تابّطَ کا لغوی معنی ہے بغل میں کوئی چیز دبانا۔ شرًا کا معنی ہے بری چیز۔ یہ لقب اس کے ساتھ اس طرح پیوست ہوا کہ اس کے نام پر غالب آگیا اور اسی نام سے اسے شہرت حاصل ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ صحرا میں جارہا تھا۔ اسے ایک مینڈھا نظر آیا۔ اس مینڈھے کو اس نے اپنے بغل میں دبایا اور اپنے قبیلے میں لے کر واپس آنے لگا۔ وہ مینڈھا راستے بھر پیشاب کرتا رہا جس سے اس کے سارے کپڑے خراب ہوگئے لیکن اس نے اس کو نہیں اتارا۔ جب گاؤں کے قریب پہنچا تو مینڈھا اتنا بھاری لگنے لگا کہ اس کو لادنا اور اٹھانا دشوار ہوگیا۔ لہٰذا اس نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ زمین پر پھینکنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مینڈھا نہیں 'غول' یعنی بھوت تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے پوچھا کہ تم یہ کیا بغل میں دبا کر لائے تھے تو بولا بھوت۔ اس پر لوگوں نے کہا' لقد تابّطَ شرًا' یعنی ثابت بری چیز بغل میں اٹھا کر لایا۔ اس کے بعد اس کا 'تابّطَ شرًا' نام پڑ گیا۔

' تابّطَ شرًا' نام رکھے جانے کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی ماں نے ایک مرتبہ اس سے کہا کہ تو بڑا نکھٹو ہے۔ تیرے سارے بھائی باہر جا کر کچھ نہ کچھ کما کر لاتے ہیں مگر تو بیٹھا روٹیاں توڑتا ہے۔ اس پر ثابت نے کہا اچھا آج میں شام کو کچھ کما کر لاؤں گا۔ تو مجھے اپنا تھیلا دیدے۔ ثابت تھیلا لے کر جنگل گیا۔ وہاں بہت سے سانپ پکڑے اور انھیں جھولے میں بھر کر بغل میں دبا کر شام کو گھر پہنچا اور جھولا ماں کے سامنے ڈال دیا۔ ماں نے جب شوق سے جھولا کھولا تو سارے سانپ نکل کر گھر میں رینگنے لگے۔ بیچاری ماں مارے ڈر کے چیخنے لگی اور گھر چھوڑ کر بھاگی۔ پڑوسیوں نے پوچھا کہ ثابت آج کیا لایا ہے۔ اس نے کہا تھیلے میں سانپ بھر کر لایا تھا۔ اس پر عورتوں نے کہا آخر سانپ بھرے تھیلے کو کیسے لایا۔ ماں نے کہا ''بغل میں دبا کر'' عورتوں نے کہا تو یوں کہو نا 'تابّطَ شرًا' یعنی بغل میں بڑی چیز دبا کر لایا۔ (تاریخ ادب عربی عبدالحلیم ندوی) 530ء میں اسے قتل کرکے غار میں پھینک دیا گیا تھا۔

(تاریخ الادب العربی حنافاخوری ص 1، 170)

نابغہ ذبیانی

نابغہ کے نام سے کئی شعراء نے شہرت حاصل کی۔ جیسے کہ نابغہ عدوانی، نابغہ تغلبی، نابغہ غنوی، نابغہ حارثی، نابغہ جعدی اور نابغہ شیبانی وغیرہ۔ لیکن نابغہ ذبیانی ان تمام نوابغ میں سے زیادہ شہرت کا حامل ہے۔ 604 عیسوی یعنی ہجرت سے کوئی اٹھارہ سال قبل اس کا انتقال ہوا۔ اس کا اصل نام زیاد بن معاویہ تھا۔ جاہلیت کے بڑے

شعرا میں سے ایک ہے بلکہ امرؤ القیس کے ساتھ اسے پہلے درجے کے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔اس کا کلام دیباچے کے حسن وجمال، لفظیات کی شان وشوکت اور تکلف وآورد کی قلت سے ممتاز ہوتا ہے۔ ابو الفرج اصفہانی کے بقول زمانہ جاہلیت میں بازار عکاظ میں اس کے لیے چمڑے کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا۔شعرا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، اسے اپنا کلام سناتے اور وہ ان کے کلام کی حسن وخوبی پر رائے زنی کرتا۔

اسے نابغہ کے لقب سے ملقب کیے جانے کے بارے میں سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ''بحیثیت شاعر اس کی نشو ونما نہیں ہوئی نہ ہی اس نے کسی استاد سے شعر وسخن کی تربیت حاصل کی۔ بلکہ بیک جنبش قلم یہ شاعر بن گیا اور اس کی زبان سے شاعری کے چشمے پھوٹنے لگے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تجربات وحوادث نے اسے پختہ انسان بنادیا تھا''

(تاریخ ادب عربی، احمد امین احمد اسکندری ص 154، القاب الشعراء ص 79)

اعشی قیس

ابو بصیر میمون بن قیس کا تعلق قبیلۂ بکر سے تھا۔ 530 عیسوی میں یمامہ میں پیدا ہوا۔شراب نوشی اور جوابازی نے اسے فقر وفاقہ کی چوکھٹ پر لا کھڑا کردیا۔ لیکن جاہلیت کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اتنا قادرالکلام اور بڑا مدح گو اور ہجو باز تھا کہ جس کی تعریف کردیتا تھا وہ راتوں رات شہرت کی ثریا پر مکین ہوجاتا تھا اور جس کی ہجو کردیتا تھا وہ کہیں کا نہ رہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محلق کلابی کی کئی لڑکیاں تھیں جن کی شادی نہیں ہورہی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک دن اعشی کو دعوت دی۔ اپنی اونٹنی کو اس کی ضیافت کے لیے ذبح کردیا اور اس کی خوب خوب خاطر تواضع کی۔ چنانچہ اس نے اس کی لڑکیوں کی تعریف میں ایسا قصیدہ کہا کہ سب کی شادیاں ہوگئیں۔ اس کا لامیہ قصیدہ بڑی شہرت کا حامل ہے۔ مشہور نقاد ابو عبیدہ کا خیال ہے کہ اس قصیدے کی ردیف میں اعشیٰ جیسا کوئی اور قصیدہ کسی نے نہیں کہا۔ تبریزی نے اسے معلقات عشرہ میں شمار کیا ہے۔

اعشیٰ کا نام میمون تھا لیکن اسے اعشیٰ کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی۔ اعشیٰ کا لغوی معنی ہے رات میں نظر نہ آنا۔ کہا جاتا ہے اسے رات میں نظر نہیں آتا تھا اس لیے اسے اعشیٰ کے لقب اور ابو بصیر کی کنیت سے ملقب کیا گیا۔ بعض لوگ اسے اعشیٰ اکبر بھی کہتے ہیں۔ اس نے لمبی عمر جی۔ اسلام کا زمانہ بھی پایا لیکن اسلام کی توفیق میسر نہ ہوئی۔ آخری عمر میں اس کی بینائی بالکل چلی گئی تھی۔ 620 میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔

(دیکھیے الجامع فی تاریخ الادب العربی 1 / 244)

علقمه الفحل

علقمہ بن عبدہ النعمانی کا تعلق قبیلۂ بنی تمیم سے تھا۔ جاہلیت کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ نقاد لکھتے ہیں کہ امرؤ القیس سے اس کا ایک بار مقابلہ ہوگیا کہ ان میں کون بڑا شاعر ہے۔ دونوں امرؤ القیس کی بیوی ام جندب طائیہ کے پاس گئے۔ اس نے دونوں سے کہا دونوں ایک ہی قافیے اور ایک ہی ردیف میں اپنے ایسے شعر سناؤ جس میں تم دونوں گھوڑے کی تصویر کشی کرو۔ دونوں نے سنایا تو ام جندب نے علقمہ فحل کے حق میں فیصلہ دیا۔ (عربی تنقید کا سفر از طہٰ ابراہیم) اس کے بعد علقمہ بن عبدہ کو علقمہ الفحل کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ فحل کا لغوی معنی ہے طاقتور نرحیوان۔ اصطلاحی معنی ہے قادرالکلام شاعر۔ کہا جاتا ہے کہ ام جندب کے اس فیصلے کے بعد امرؤ القیس اس پر غضبناک ہوگیا اور کہا کہ تم نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ وہ مجھ سے بڑا شاعر نہیں ہے۔ تم اس سے محبت کرتی ہو اسی لیے تم نے اسے مجھ پر فوقیت دی ہے۔ کہا جاتا ہے اس کے بعد امرؤ القیس نے اسے طلاق دے دیا۔ (ایضاً) تقریبا 603 میں اس کا انتقال ہوا۔

(الجامع فی تاریخ الادب العربی 1 / 272)

متنبی

متنبی عالم عرب کا سب سے مشہور شاعر ہے۔ عربی شاعری کی تاریخ متنبی جیسے کسی اور شاعر کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ اپنے دور کا شاعر اعظم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نو دس سال کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اس کا اصل نام محمد بن حسین بن عبدالجبار جعفی تھا۔ 303ھ میں کوفہ کے کندہ محلے میں پیدا ہوا۔ مگر اسے اس کے اصل نام محمد سے کوئی نہیں جانتا بلکہ اسے متنبی کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی۔ متنبی کا معنی ہے نبوت کا دعوی کرنے والا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بادیۃ السماوہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ بہت سارے لوگ اس کے ہاتھ پر ایمان بھی لے آئے تھے۔ مگر حمص کا گورنر جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے دعوے سے توبہ کرلیا۔ لیکن اس کا لقب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔

حطیئه

اسلامی دور کا مخضرم شاعر حطیئہ (وفات 59ھ) بھی انھیں شاعروں میں سے ایک ہے جسے اس کے نام کے بجائے اس کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کا اصل نام جرول بن اوس تھا۔ بنی مضر سے اس کا تعلق تھا۔ جاہلیت میں پیدا ہوا۔ لونڈی زادہ تھا۔ اس کی ماں کا نام الضراء تھا۔ اس نے اسلامی زمانے کو پایا اور اسلام قبول کرلیا لیکن اسلام اس کے دل میں داخل نہیں ہوا۔ بہت ہی خطرناک قسم کی ہجو کرتا تھا۔ بلکہ ہجو گوئی میں طاق تھا۔ اس نے اپنی ماں، باپ اور خود اپنے آپ کی بھی ہجو کرڈالی تھی۔ اس کی بدزبانی سے تنگ آکر حضرت عمر نے اسے جیل کی ہوا کھلائی۔ رہا کرنے کے بعد تین ہزار درہم میں خرید کر اسے مسلمانوں کی ہجو گوئی پر پابندی لگادی۔ 59ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ (الجامع فی تاریخ الادب العربی 1 / 275)

حطیہ حطأ ہ کی تصغیر ہے۔ اس کا لغوی معنی ہے پست قد۔ کہا جاتا ہے کہ مختصر جسامت کا ہونے اور بدشکل ہونے کی وجہ سے اسے حطیہ کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ الحطی من الناس کا معنی ہوتا ہے ذلیل آدمی۔ (دیکھیے المعجم الوسیط لفظ حطأ) چونکہ یہ بہت زیادہ بدزبان اور ہجو گو تھا اس لیے اسے اس نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

اخطل

اخطل عصر بنی امیہ کا مشہور ترین شاعر ہے۔ اس کا اصل نام غیاث بن غوث تغلبی تھا۔ عصر بنی امیہ کا بڑا شاعر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ناقدین کے سامنے اپنا کلام پیش کرتا تو وہ اس کے خراب اشعار کو ساقط کردیتے تھے۔ اسی لیے اس کا کلام حشو وزوائد، بھرتی کے اشعار اور فنی عیوب سے خالی اور پاک صاف ہے۔

(تاریخ ادب عربی، احمد امین ص 267)

اخطل کے لقب سے ملقب کیے جانے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی کا کچھ لوگوں کے پاس سے گذر ہوا جہاں اخطل بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے لوگوں سے کچھ سوالات کیے تو ان لوگوں کے بجائے اخطل اسے جواب دینے لگا۔ اس نے کہا من هذا الغلام الأخطل یعنی یہ بدزبان بچہ کون ہے؟ چنانچہ اس کے بعد اسے اخطل کے لقب سے ملقب کیا جانے لگا اور اسی سے اسے شہرت حاصل ہوئی۔ 92ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ (الجامع فی تاریخ الادب عربی حنا فاخوری 1 / 464-65)

ذو الرمه

ذو الرمہ کا معنی ہوتا ہے رسیوں والا۔ اس کا اصل نام غیلان بن عقبہ العدوی تھا۔ یمامہ کے صحراء میں 77ھ میں پیدا ہوا۔ پست قد، بداخلاق اور کالا کلوٹا تھا۔ اسے ایک خاتون سے عشق تھا جس کا نام میّہ بنت طلبہ تھا۔ زندگی بھر اس کے عشق میں گرفتار رہا اور اسی کے شوق وجستجو میں اس کی شاعری کے چشمے ابلتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے میّہ سے پانی پلانے کو کہا۔ میّہ پانی لے

کر آئی تو غیلان کے کاندھے پر رسی (رمہ) کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا چنانچہ اس نے اس سے کہا اے ذوالرمہ یعنی رسیوں والے لو پانی اور پیو۔ اس واقعے کے بعد اسے ذوالرمہ کہا جانے لگا اور اسی لقب سے اسے شہرت حاصل ہوئی۔ 117ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

(الجامع فی تاریخ الادب عربی حنا فاخوری 1 / 437)

دیک الجن

دیک الجن کا معنی ہے جن کا مرغ۔ اس کا پورا نام عبدالسلام بن رغبان الکلبی الحمصی تھا۔ حمص میں 161ھ میں اس کی ولادت ہوئی۔ عباسی دور کے مشہور شاعر ابوتمام کا معاصر تھا۔ لیکن ابوتمام کے برعکس یہ اپنے شہر سے کبھی باہر نہیں گیا۔ نہ ہی کبھی ملوک وسلاطین کی خدمت میں حاضری دی۔

ثعالبی کا خیال ہے کہ اس کے ایک شعر میں 'دیک الجن' کا ذکر آنے کی وجہ سے اسے دیک الجن کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ (ثمار القلوب ص 69) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عجیب وغریب اطوار کا انسان تھا اس لیے اسے دیک الجن کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ (القاب الشعراء ص 87) زبیدی اور ابن عساکر کا خیال ہے کہ اس کی آنکھیں مرغ کی طرح سبز تھیں۔ اس لیے اسے دیک الجن کے لقب سے ملقب کیا گیا (المعرفۃ ڈاٹ کام) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ابوعمرو عمیر بن جعفر کے ایک مرغ کا مرثیہ کہہ دیا تھا جسے اس نے ذبح کر کے دعوت کی تھی (ایضاً)

الوأواء الدمشقی

وأواء دمشقی کا اصل نام محمد بن احمد غسانی تھا۔ دمشق میں پیدا ہوا اور وہیں نشو ونما پائی۔ 390ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ امام ذہبی کا خیال ہے کہ یہ دمشق کے اچھے لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس وقت شامیوں میں اس کے جیسا کوئی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عام لوگوں میں سے تھا۔ بچپن سے ہی اسے شعر وادب کا شوق تھا۔ خالی اوقات میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اچھے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ سیف الدولہ کے دربار سے بھی اس کی وابستگی کی روایتیں ہیں۔ ثعالبی نے اپنی کتاب یتیمۃ الدہر میں ابوبکر خوارزمی سے روایت کیا ہے کہ یہ دمشق کے دار البطیخ میں گا گا کر پھل فروخت کیا کرتا تھا۔ اس لیے اسے وأواء کہا جانے لگا۔ وأواء کا لغوی معنی ہے کتے کا بھونکنا یا گیدڑ کی آواز۔ (دیکھیے مقدمہ دیوان الوأواء، الجامع فی تاریخ الادب العربی 1 / 872 اور المعجم الوسیط)

حَیصَ بَیصَ

شہاب الدین ابو الفوارس اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ لیکن بحیثیت شاعر انھیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ صاحب دیوان بھی تھے۔ 574ھ میں بغداد میں ان کا انتقال ہوا۔ حَیص بَیص کا لغوی معنی ہے پریشانی اور مصیبت۔ عربی میں کہتے ہیں وقع الناس فی حیص وبیص (بفتح الحاء وبکسرہا ایضا) یعنی لوگ مصیبت اور پریشانی میں واقع ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ جا رہے تھے۔ دیکھا کہ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ پریشانی کے عالم میں ہیں تو انھوں نے کہا 'ما للناس فی حیص بیص' کیا ہوا لوگوں کو، کیوں پریشان ہیں؟ اس کے بعد لوگوں نے ان کا نام حیص بیص رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی لقب سے مشہور ہوگئے۔ (وکی پیڈیا)

الشاعر القروی

لبنان میں ایک شاعر تھا جس کا نام رشید سلیم خوری تھا۔ بڑا معتبر شاعر تھا۔ اس کے دو دیوان شائع ہوئے۔ ایک دیوان 'الرشیدیات' کے نام سے اور دوسرا 'القرویات' کے نام سے۔ اسے اس کے نام رشید کے بجائے 'الشاعر القروی' یعنی 'دیہاتی شاعر' کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے پہلے دیوان میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے 'لعینیک یا لبنان' یعنی لبنان! تیرے لیے۔ اس قصیدے کے حاشیے میں اس نے خود کو 'الشاعر القروی' نام سے موسوم کیے جانے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نجیب الحداد مجلّہ المودب میں تنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اس مجلّے میں اس کی شاعری پر تنقید کی تھی اور اسے مختلف 'اوصاف جمیلہ' سے یاد کیا تھا۔'' رشید سلیم خوری کی ملاقات مجلّہ 'القلم الحدیدی' کے مالک جارج الحداد سے ہوئی تو انھوں نے اسے مودب کا وہ شمارہ پیش کیا اور کہا لو پڑھو! اس بار نجیب نے تمہاری خبر لی ہے۔ رشید نے ہنستے ہوئے وہ مجلّہ ان سے لیا اور پڑھنا شروع کیا۔ نجیب الحداد نے اس میں رشید کی شاعری پر تنقید کی تھی اور اسے الشاعر القروی یعنی دیہاتی شاعر کہہ کر خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ کون سا شاعر ہے؟ وہی دیہاتی شاعر یعنی الشاعر القروی۔ اس کو پڑھنے کے بعد رشید سلیم خوری نے کہا لو آج سے میں دیہاتی شاعر یعنی الشاعر القروی کے نام سے ہی لکھوں گا اور اس نے اپنے آپ کو 'الشاعر القروی' نام سے لکھنا شروع کر دیا اور اسی نام سے اسے اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ بعض لوگ تو اس کے اصل نام سے بھی واقفیت نہیں رکھتے اور بعض رشید ایوب اور رشید سلیم خوری میں مغالطہ کرتے ہیں کہ ان میں سے کون سا الشاعر القروی ہے۔ 1984 میں اس کا انتقال ہوا۔

(جدید عربی شاعری از شمس کمال انجم ص 237،240)

نازک الملائکہ

نازک الملائکہ معاصر نسائی شاعری کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔ انھوں نے 23 اگست 1923 کو عراق میں آنکھیں کھولیں اور 20 مئی 2007 کو ان کا انتقال ہوا۔ نازک کو عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فرانسیسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ نیوجرسی کی پرنسٹن یونیورسٹی میں پڑھنے والی واحد خاتون تھیں۔ بیشتر علماء کا خیال ہے کہ نازک نے اپنے قصیدے 'الکولیرا' کے ذریعے عربی میں آزاد شاعری کی بناء رکھی۔ نازک کو نازک الملائکہ (فرشتے) کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی۔ عراق کے مشہور ماہر لسانیات اور لغوی صبحی البسام کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے کہ جب انھیں اپنے بچپن میں معلوم ہوا کہ صادق کے خاندان کے لوگوں کو 'الملائکہ' کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے تو انھوں نے لوگوں سے اس کی وجہ دریافت کی تو انھیں بتایا گیا کہ اس خاندان کے سبھی لوگ پڑھے لکھے، علم وفضل اور شرافت ونجابت کے حامل ہیں، محلے کے دیگر اہل خانہ کی بہ نسبت ان کے گھر میں شور شرابہ نہیں ہوتا اور یہ لوگ بالکل فرشتوں کی مانند رہتے ہیں اس لیے ان کو الملائکہ کا خطاب دیا گیا۔

(جدید عربی شاعری از شمس کمال انجم)

اور بھی بہت سے عرب شاعر ہیں جنھیں ان کے اصلی نام کے بجائے کسی اور نام، لقب، کنیت یا کسی حادثاتی نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ جیسے کہ قیس الرقیات نامی شاعر کو رقیات سے اس لیے شہرت حاصل ہوئی کہ اس نے تین عورتوں سے عشق کیا تھا اور تینوں کا نام رقیہ تھا۔ مشہور جاہلی شاعر مہلہل کو مہلہل اس لیے کہا گیا کیونکہ اس نے شعر کو آسان بنایا۔ یزید بن ضرار کو الشرید کے لقب سے اس لیے شہرت حاصل ہوئی کہ اس کے ایک شعر میں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ اسی طرح عمر بن شُیَیم کو قطامی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی کیونکہ یہ لفظ اس کے ایک شعر میں وارد ہوا ہے۔ مؤمل بن جمیل کو قتیل الہوی (شہید عشق) کے نام سے شہرت حاصل ہوئی کیونکہ یہ لفظ اس کے ایک شعر میں وارد ہوا ہے۔

■

Dr. Shams Kamal Anjum
Head Dept of Arabi/Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah University
Rajouri - (J&K)

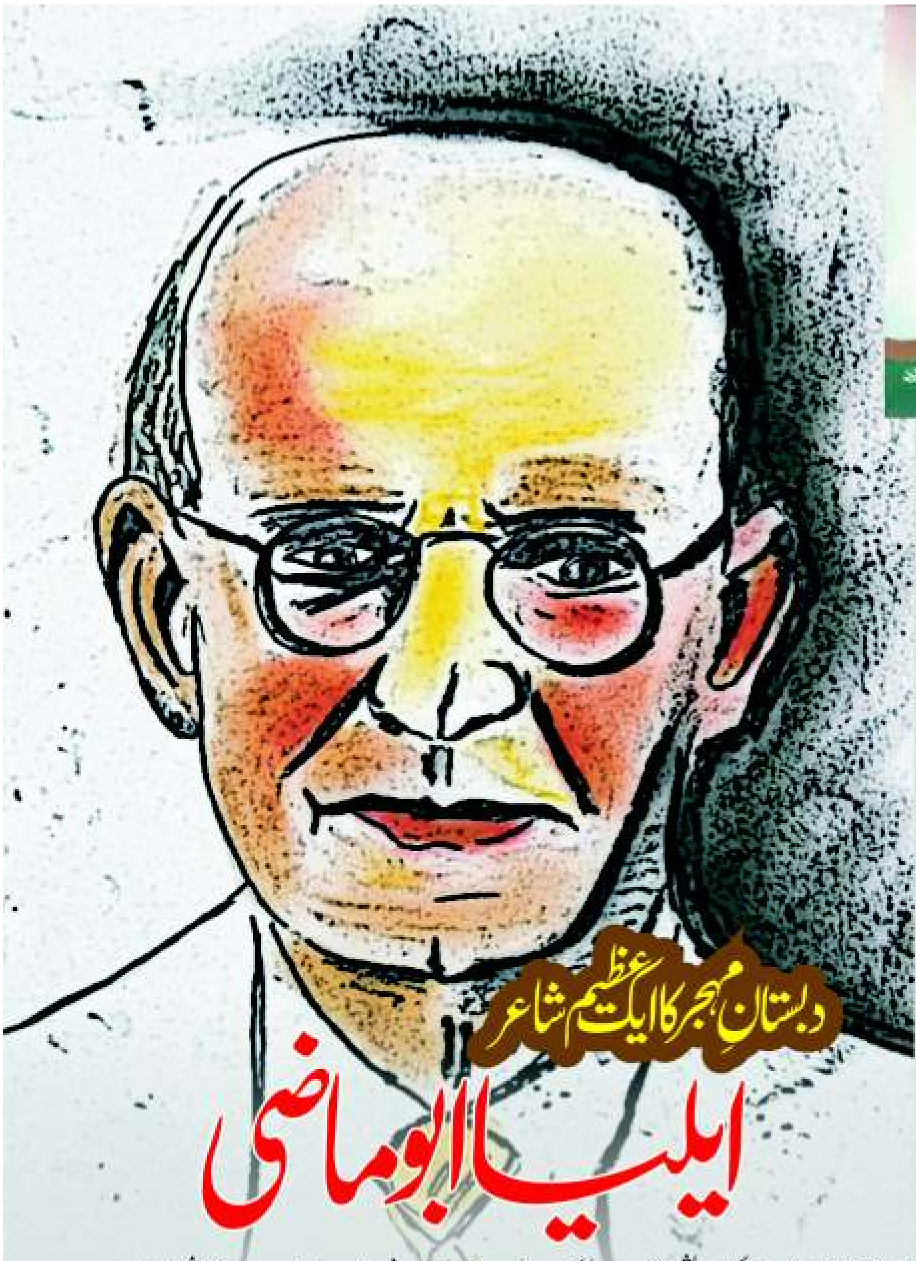

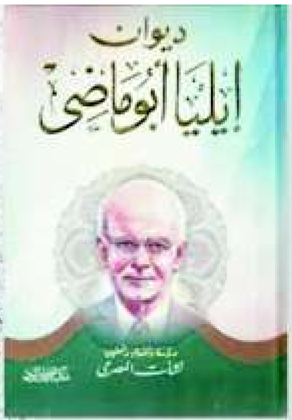

محمد نعیم صدیقی

دبستانِ مہجر کا ایک عظیم شاعر

ایلیا ابو ماضی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے ہی مہاجرین عرب کا شمالی اور جنوبی امریکہ کی جانب ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس ہجرت کو مہجر سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ترک وطن کا محرک کہیں تشدد اور ظلم وستم تھا۔ تو کہیں سیاسی اور اقتصادی بھی تھا۔ چنانچہ عرب مہاجرین نے امریکہ کی جانب ہجرت کی تو وہ اپنے ساتھ ایک بڑا ادبی سرمایہ بھی لے گئے۔ نئے ماحول میں پہنچ کر جب ان کی آنکھیں کھلیں تو انھیں دنیائے ادب میں ایسے نئے افق نظر آئے جن سے وہ نا آشنا تھے اور یہیں سے ان کے درمیان قدیم وجدید کی کشمکش شروع ہو گئی اور یہ کشمکش مہاجرین کے سامنے زندگی کے تمام شعبوں میں رونما ہوئی اور اس طرح سے اس نئے دیار میں زندگی کی کشمکش اور دنیا کے شور وغل نے شعرائے مہجر کو اس وجود کے ماورا پوشیدہ چیزوں پر غور وفکر کرنے سے باز نہیں رکھا۔ وہ زندگی کے ان تمام معموں کو جن کا حل آج تک نہیں نکلا حل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے، شمالی اور جنوبی امریکہ جانے والے ادیبوں نے اکثر ادبی فنون میں طبع آزمائی کی اور شعر وادب کی دونوں شاخوں میں ان کا کلام نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ مکتبِ فکر کے لحاظ سے مہجری ادب میں رومانوی فکر نمایاں نظر آتی ہے چونکہ مہجری ادبا وشعرا لفظی بندش وقیود کے پابند نہ تھے اور وہ اپنے مفہوم کو بے ساختہ طور پر پورے جوش وولولہ کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

مہجری عربی ادب کی تاریخ میں ادیبوں اور شاعروں کا عرب دنیا سے (بالخصوص لبنان اور شام کے عربوں کا) امریکہ کی جانب ہجرت کرنا ایک اہم واقعہ مانا جاتا ہے، جن لوگوں نے امریکہ کی جانب ہجرت کی وہاں پر انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور اپنی زبان وتہذیب سے وابستہ رہنے کے لیے کئی طرح کی کوششیں کیں۔ ان سعی کرنے والوں میں ایک نام مہجری دبستان شاعری کا 'امیر الشعرا' ایلیا ابو ماضی بھی ہے جو ایک لبنانی شاعر تھے اور لبنان کے ایک 'المحیدثة' نامی گاؤں میں 1889 میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ سال تھا جس میں آسمان شعر کا یہ ستارہ طلوع ہوا۔ اگر چہ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مہجری شاعری میں اس بچے کو امیر الشعرا کا درجہ ملے گا۔ سن بلوغ سے پہلے ہی شعر کہنے لگے تھے اور ابھی وہ گیارہ سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ 1900 یا 1902 میں مصر چلے گئے اور وہیں تجارت کرنے لگے اور اپنے چچا کی دوکان پر سگریٹ وغیرہ فروخت کرتے۔ خالی اوقات میں درس ومطالعہ میں مشغول رہتے اور شعر وشاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

مصر میں ابو ماضی کی زندگی خوشگوار اور پرسکون تھی انھیں صحافت اور شاعری کی دنیا میں لوگ جانتے تھے لیکن 1911 میں جب شام ولبنان میں عیسائیوں کے خلاف شورش برپا ہونے لگی تو ہجرت کرکے امریکہ چلے گئے اور وہاں کے شہر سنسناتی میں قیام پذیر ہو گئے اور وہاں اپنے بھائی مراد ابو ماضی کے ساتھ تجارت شروع کردی اور سنسناتی میں قیام کے پانچ سال بعد نیویارک منتقل ہو گئے جہاں ان کی ملاقات جبران خلیل جبران، میخائیل نعیمہ، نسیب عریضہ اور رشید ایوب اور ندرہ حداد جیسے شعرا وادبا سے ہوئی ان لوگوں نے مل کر 1920 میں جبران کی قیادت میں ادبی انجمن رابطہ قلمیہ کی بنیاد رکھی اس کے بعد دس سال تک دو رسالے 'رحلة الفتاة' اور 'مرآة الغرب' میں ایڈیٹر کے حیثیت سے صحافت کے فرائض انجام دیے۔

نیویارک میں ایلیاء نے 'السمیر' نامی رسالہ 1929 میں شروع کیا اور اس رسالے کو عرب ممالک میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی، اسی رسالہ کے حوالہ سے ڈاکٹر طفیل احمد مدنی لکھتے ہیں کہ: ''اس رسالہ کے سرورق پر دو شعر درج رہتے ہیں جو شاعر موصوف کی اسپرٹ اور اس کے ادبی جذبہ کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں وہ اشعار درج ذیل ہیں:

أنا لا أهدى اليكم ورقا
غيركم يرضى بحبر وورق

انما أهدی الی أرواحكم
فكر اتبقي اِذا لطرس احترق

میں تمھیں یہ کاغذ تحفے میں نہیں دے رہا ہوں، دوسرا تو سیاہی اور کاغذ پر ہی راضی ہوجاتا ہے، میں تو تحفے میں تمہارے دل ودماغ کے وہ خیال پیش کررہا ہوں جو کاغذ کے جل جانے پر بھی باقی رہیں گے۔[1]

ابوماضی نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ 'تذکار الماضی' کے نام سے 1911 میں شائع کیا اس دیوان میں پندرہ قصیدے ہیں جس کا موضوع قوم پرستی ہے۔ اس دیوان میں وہ منظومات شامل ہیں جو مصر کے دوران قیام کہی گئی ہیں اس کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ 'الجداول' 1917 میں مرآۃ الغرب نامی مطبع میں چھپ کر منظر عام پر آیا یہ دیوان ان کے فلسفیانہ کلام، قومی شاعری اور عشقیہ اشعار پر مشتمل ہے اس کا مقدمہ عظیم مجری شاعر میخائیل نعیمہ نے لکھا ہے اور یہ مقدمہ ایک شاعر کے قلم سے دوسرے شاعر کے لیے ایک پر خلوص سلام اور صادق ترین خراج محبت ہے:

''انھوں نے لکھا تھا کہ میں اس وقت یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے اور صاحب جداول'' کے مابین ایک روحانی قربت محسوس ہورہی ہے جسے میں ابوماضی کے پہلے اور دوسرے دیوان کے شاعر اور اپنے بیچ محسوس نہیں کرتا تھا، معلوم نہیں گذشتہ آٹھ برسوں میں ابوماضی بدلے ہیں یا میں خود بدل گیا ہوں''[2]

حقیقت یہ ہے کہ ایلیا اس دیوان میں روایت پرست شاعری اور طویل بحروں سے پوری طرح سے اپنا دامن چھڑا چکے تھے اور اب ان کے سامنے روح ومعنی کی ایک وسیع دنیا اور انسانیت کی لامحدود وسعت تھی انھوں نے اس دیوان میں اپنا ایک الگ اور منفرد اسلوب اختیار کیا ہے اور ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایلیا ابوماضی کو فطری اور طبعی مناظر سے غیر معمولی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے ان مناظر کو اپنے کلام میں خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی لکھتے ہیں:

''ابوماضی کی شاعری میں انسانیت سے ہمدردی، فطرت سے محبت اور آزادی کی زندگی پر بڑا زور ملتا ہے، فطرت سے جتنی بھرپور محبت ابوماضی کے اشعار میں ملتی ہے، شاید کسی بھی دوسرے مجری شاعر کے یہاں نہیں ملتی ایسا لگتا ہے فطرت کا حسن اور اس کی شیرینی ابوماضی کی روح اور اس کے الفاظ میں سرایت کرگئی تھی گویا فطرت کو اپنے تئیں ابوماضی کی سچی محبت کا احساس ہوجانے پر اس کے لیے اس نے اپنے سارے راز وا کردیے تھے۔ اسی طرح شعری مکالمہ میں بھی ابوماضی کی مہارت کو کوئی چھو نہیں سکا، اس کے قصیدے، 'الشاعر فی السماء' اور 'الاسطورية الازلية' وغیرہ ایسا تصور پیش کرتے ہیں گویا قاری اسٹیج پر ہونے والے کسی ڈرامہ کا مشاہدہ اور اس کے کرداروں کے مکالمے سن رہا ہے۔''[3]

بلاشبہ مذکورہ دیوان میں شاعر کی توجہ صرف معانی پر ہے الفاظ کی زینت، تشبیہات کے حسن اور اوزان کے تکلف سے وہ بے نیاز ہے چنانچہ ایلیا ابوماضی اپنے دیوان 'الجداول' کے ایک قصیدے میں کہتے ہیں۔[4]

لست منی ان حسبت الشعر الفاظاً ووزنا
خالفت دربك دربی والنقضی ماكان منا
فانطلق عنی لئلاّ تقتنی هما وحزنا
واتخذ غیری رفیقا وسوی دنیای مغنی

1۔ اگر تم شعر کو صرف الفاظ اور وزن پر مشتمل سمجھتے ہو تو میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
2۔ تمھارا راستہ میرے راستے سے الگ ہے میرے اور تمہارے درمیان جو تعلق ہے وہ ختم ہوچکے ہیں۔
3۔ تم میرے پاس سے چلے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے ہاتھ صرف فکر وغم ہی آئیں۔
4۔ تم میرے علاوہ کسی اور کو اپنا ساتھی بنالو اور میری دنیا کے علاوہ کوئی اور دوسرا مسکن تلاش کرلو۔

اسی طرح وہ ہمیں مسرت وشادمانی کے تصور کو اپنے ذہن میں مضبوطی سے جگہ دینے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ہم خوشی خوشی زندگی بسر کرسکیں۔ وہ شکوہ وشکایت کرنے سے انکار کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا ہوا پائے، وہ لوگوں کی خاطر تو ہنستے ہیں لیکن دل ہی دل میں روتے ہیں اور اپنے ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔[5]

ولكنی امرؤ للناس ضحكی
ولی وحدی تباریحی وحزنی
وتابی كبریائی ان یرانی
فتی مغرورقا بالدمع جفنی
فأستر عبرتی عنه لئلا
یضیق بها و اِن هی أحرقتنی
أقول لكل نوّاح: رویدا
فان الحزن لا یغنی ویضنی
وجدت الدمع بالأحرار یزری
فلیت الدمع لم یخلق بجفن

1۔ میں ایسا شخص ہوں کہ میرا ہنسنا تو لوگوں کے لیے ہے اور میرا رنج وغم وہ صرف میرے لیے ہے۔
2۔ میرا جذبۂ فخر اس بات سے انکار کرتا ہے کہ مجھے کوئی روتا ہوا یا میری آنکھوں کو کوئی اشکبار دیکھے۔
3۔ میں اپنے آنسوؤں کو دیکھنے والے سے پوشیدہ رکھتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان سے پریشان خاطر ہو، لہٰذا میں اپنے آنسوؤں کو پوشیدہ رکھتا ہوں خواہ وہ مجھے جلا ہی کیوں نہ ڈالے۔
4۔ میں ہر آہ وبکا کرنے والے سے کہتا ہوں کہ تھم جا کیونکہ غم فائدہ تو نہیں دیتا بلکہ جسم کو پگھلا دیتا ہے۔
5۔ میں نے دیکھا کہ غم آزاد لوگوں کو رسوا کردیتا ہے، کاش کہ آنسو کسی آنکھ میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔

بلاشبہ قنوطیت اور رجائیت کا مادہ وراثۃً منتقل بھی ہوتا ہے کیوں کہ ابوماضی کے والد بھی شاعر اور رجائیت پسند انسان تھے جو لوگوں سے اپنے حزن وملال کو پوشیدہ رکھتے تھے اور عوام سے صرف اپنی مسرت وشادمانی کا اظہار کرتے تھے۔

شاید ایلیا ابوماضی کے کلام میں مسرت وشادمانی اور جمال کے جاری وساری ہونے کا یہی سبب ہو۔ نیز اس کلام کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عصر جدید کے فکری دھاروں اور مادیت سے بڑا متاثر ہے کیونکہ انھوں نے جب بھی انسانی دکھ درد کے بارے میں سوچا اور اس کے بارے میں غور وخوض کیا تو اس میں ناامیدی کی کوئی جھلک نہیں ملتی بلکہ امید کی ایک کرن ساتھ ہوتی ہے، ابوماضی نے عمر خیام کی رباعیات کا بھی مطالعہ کیا تھا جس نے ان کے ذہن میں ایک اچھا اور گہرا اثر چھوڑا۔ اور ان کے بہت سے خیالات ہمیں ایلیا ابوماضی کے اشعار میں ملتے ہیں ان کے اشعار میں خیام کے فلسفہ کے ساتھ ساتھ جبران کا رومانوی رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے انھیں جدید عربی زبان وادب میں عمر خیام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حوالہ جاتی کتب:

1۔ ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، امریکہ میں عربی شعر وادب کا ارتقاء۔ صفحہ 170,171۔ منہاج پور، الہ آباد 1983
2۔ ڈاکٹر فوزان احمد، جدید عربی شاعر، صفحہ: 597۔ ادارۃ البحوث الاسلامیہ، جامعہ سلفیہ بنارس 2008
3۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی، جدید عربی ادب کے ارتقاء میں مجری ادباء کی خدمات، صفحہ: 328,329۔ نظامی پریس لکھنو 1984
4۔ ایلیا ابوماضی، دیوان 'الجداول' ص 4
5۔ ایلیا ابوماضی، دیوان 'الخمائل' ص: 82,83

■

Dr. Mohd Nayeem Siddiqui
Guest Lecturer, Dept of Arabi wa Farsi
Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)

زلفی حبیب

اردو کی ابتدائی خواتین ناول نگار

اردو ناول نگاری کی ابتدا سے ہی مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگاروں نے بھی اس میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے شروع کیے اور چند اہم موضوعات کو اپنے ناول کا حصہ بنایا جن میں بیشتر سماج کی ضرورت و اصلاح کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ انھوں نے زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے لکھا اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ ابتدائی دور کی خواتین کے یہاں ہمیں نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ بیشتر خواتین نے ان دونوں ناول نگاروں کی تقلید میں ناول لکھے کیونکہ نذیر احمد نے ناول لکھنے کا آغاز کیا اور اپنا پہلا ناول (مراۃ العروس 1869) لکھا تو وہ لڑکیوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق ہی تھا اور اس کے بعد ان کی بے شمار تخلیقات لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی خانگی زندگی کے متعلق ہی ہیں۔

یہ خواتین ناول نگار نذیر احمد اور راشد الخیری سے متاثر ہونے کے علاوہ رومانی تحریک سے بھی زیادہ متاثر تھیں۔ دراصل ان خواتین نے جس عہد میں لکھنا شروع کیا اس دور میں پریم چند کی حقیقت نگاری اور سجاد حیدر یلدرم کی رومان نگاری کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور اس وقت کا ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں دو تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقات پیش کر رہا تھا لیکن یہ ابتدائی خواتین ناول نگار پریم چند کی حقیقت نگاری کے برعکس سجاد حیدر یلدرم کی رومان نگاری سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ بلکہ اس وقت کی جتنی بھی خواتین لکھ رہی تھیں ان پر رومانی تحریک کا زیادہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے جنھوں نے رومانی تحریک کے زیر اثر عورتوں کے مسائل کو سمجھ کر تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کی حمایت میں اپنی مختلف تحریروں اور اپنے ناولوں کو پیش کیا۔ ان خواتین کے زیادہ تر ناول تعلیم نسواں اور اصلاح معاشرہ کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ عورتیں جس ماحول میں زندگی گزار رہی تھیں وہ ظاہر ہے نئے تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بہت پیچھے تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ان کے لیے محال تھا۔ وہ گھر کی چہار دیواری، مذہبی رسم و رواج اور پردہ کی سخت پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔

ان خواتین ناول نگاروں میں رشیدۃ النساء، صغرا ہمایوں، اکبری بیگم، نذر سجاد، حمیدہ سلطان مخفی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ رشیدۃ النساء اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے لوگوں کو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کیا۔ جہالت اور جاہلانہ رسم و رواج کو ترک کرنے کی کوشش کی۔ وہ مولوی نذیر احمد سے متاثر تھیں۔

رشیدۃ النساء کا پہلا ناول 'اصلاح النساءؒ' (1881) ہے۔ اس ناول میں انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی حمایت اور جاہلانہ رسم و رواج کی مخالف کی ہے۔ 'اصلاح النساءؒ' کی کہانی بہت طویل ہے۔ اس میں متوسط مسلم گھرانوں کی معاشرتی زندگی پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ انداز بیان دلکش اور زبان نہایت صاف سلیس، عام فہم اور روزمرہ کے محاوروں سے پر ہے۔ اس میں انھوں نے اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کی بڑی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ خصوصاً مسلم معاشرہ کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔

اپنے مقصد، تعلیم نسواں کی تکمیل کے لیے انھوں نے 'اصلاح النساءؒ' میں اشرف النساء کو اپنا مثالی کردار بنا کر پیش کیا ہے جس کے سانچے میں وہ تمام لڑکیوں کو ڈھالنا چاہتی ہیں اسی کے ساتھ انھوں نے جاہلانہ رسم و رواج کے غلط نتائج و نقصانات کی بھی عکاسی کی ہے۔ اپنے اس ناول کے ذریعے انھوں نے تعلیم نسواں کی

ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے تاکہ مسلم خواتین جاہلانہ رسم و رواج اور ناخواندگی کو چھوڑ کر تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تاکہ ان کی شخصیت کی تعمیر ہو اور معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہو سکے۔ اگرچہ اس دور میں بیشتر خواتین نے نذیر احمد اور راشد الخیری سے متاثر ہو کر لکھا لیکن بہت سی ایسی خواتین بھی ہیں جو ان دونوں حضرات کے اثر سے آزاد نظر آتی ہیں کیونکہ یہ دونوں ناول نگار مذہبی تعلیم اور امور خانہ داری کی اہمیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں لڑکیوں کے لیے مغربی و اعلیٰ تعلیم کا کوئی تصور نہیں لیکن بیشتر خواتین ناول نگار نے لڑکیوں کے لیے نہ صرف مغربی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا بلکہ پردہ کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کیا وہ دینی تعلیم کو لازمی قرار دیتی ہیں تو مغربی و جدید تعلیم بھی ان کے لیے اتنی ہی اہم ہے۔ نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

''چند خواتین ناول نگار ایسی ہیں جنھوں نے خواتین کے لیے ایک نئی زندگی کا خواب دیکھا۔ نئی تعلیم و تہذیب سے بہرہ ور ہونا ان کا بھی حق ہے۔ ان کی ہیروئن کا اگر گھر کے اندر استحصال ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی بہتر بنانے کی خاطر گھر سے باہر نکل کر جدوجہد کر سکتی ہے۔ ان کے یہاں مغربی تعلیم و تہذیب کے بہتر عناصر کو انگیز کرنے کی جرأت ملتی ہے۔ ان کی ہیروئن پیانو بھی بجاتی ہے اور نماز بھی پڑھتی ہے۔ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرتی ہے اور امور خانہ داری میں بھی طاق ہے اور غلط قسم کے مشرقی اور مغربی دونوں ہی طریقوں سے احتراز برتنے کی تلقین کرتی ہے۔''[1]

صغرا ہمایوں بھی ابتدائی خواتین ناول نگار میں سے ہیں۔ انھوں نے تقریباً 14 ناول لکھے۔ تحریر النساء، موہنی، مشیر نسواں، زہرہ اور سرگزشت ہاجرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھیں 'سرتاج خواتین ہند' کا خطاب بھی ملا کیونکہ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی زبوں حالی اور پسماندگی کا بغور مطالعہ کیا اور انھوں نے مختلف ممالک کی سیر کر کے ہندوستانی خواتین کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کی بے شمار کوششیں کیں مختلف مقامات پر تقریریں اور انجمنیں بھی قائم کیں اور مردوں کو بھی عورتوں کی پسماندگی کی طرف متوجہ کر کے اسے دور کرنے کی تجویزیں پیش کیں۔

انھوں نے اپنا ناول 'مشیر نسواں' (1906) اصلاحی غرض سے لکھا۔ وہ عورتوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے واقف کرانا چاہتی تھیں اور جدید تعلیم کو خواتین کے لیے ضروری سمجھتی تھیں۔ انھوں نے اپنے ناول مشیر نسواں میں سماجی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ناول کے اہم کردار رقیہ اور زہرہ ہیں۔ جو مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس پورے ناول میں عورتوں کی زبوں حالی پر توجہ دلائی گئی ہے جس کی اصلاح کی۔ انھوں نے حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن صغرا ہمایوں لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے خلاف آواز آتی ہیں اور لڑکیوں کے لیے ایک الگ اسکول کی حمایت کرتی ہیں۔

ان کا دوسرا ناول 'سرگزشت ہاجرہ' (1929) ہے۔ اس ناول میں بھی انھوں نے اعلیٰ تعلیم اور مذہبی تعلیم دونوں کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت پیش کی ہے۔ ان کے بھی ناولوں میں تعلیم نسواں اور ان کی تربیت پر زور دیا گیا ہے۔ سرگزشت ہاجرہ میں انھوں نے روزمرہ کے معمول اور زندگی کے شب و روز کا کچھ اس طرح ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صبح کے چھ بجے اٹھتی ہوں، نماز سے فارغ ہو کر سورہ یٰسین ضرور پڑھتی ہوں، باورچی کے پاس سودے کے پیسے بھجوا دیتی ہوں۔ ماما و مغلانی مل کر اناج نکالتیں، میں سامنے کھڑی رہتی، نو بجے ہمارے یہاں ناشتہ ہوتا، ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اور ہم باغ میں ٹہلتے، مالی کو بتلاتے یہ درخت یہاں لگاؤ، وہ گملا وہاں رکھو۔ اس کے بعد میں باورچی خانہ میں جاتی، دیکھ بھال لیتی، گیارہ بجے میز پر کھانا آجاتا، کھا کر وہ کچہری جاتے۔ تھوڑی دیر کے لیے میں اپنی والدہ کے پاس چلی جاتی۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن سے دل بہلاتی۔ پانچ بجے میں اپنے گھر واپس آجاتی۔ وہ بھی آجاتے۔ چائے پینے کے بعد وہ باہر چلے جاتے۔ میں اندر اخبار یا کتاب پڑھتی جب شام ہوتی وہ یہ کہہ کر چلے جاتے کہ فلاں دوست کے ہاں دعوت ہے۔ میں نماز پڑھ کر کتاب پڑھتی یا کبھی سو جاتی ہوں ورنہ ان کے آنے تک جاگتی۔''[2]

اکبری بیگم بھی اہم ناول نگار ہیں۔ 'گلدستہ محبت' ان کا پہلا ناول ہے لیکن اب یہ ناول نایاب ہے۔ ان کا دوسرا ناول 'گودڑ کا لال' (1907) ہے۔ یہ ناول بھی اصلاح معاشرت کی غرض سے تصنیف ہوا ہے۔ ان کا یہ ناول عورتوں میں کافی مقبول رہا ہے اور تو اور لڑکیوں کے جہیز میں بھی دیا جانے لگا ان دونوں ناولوں میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے ابتدائی معاشرے کی تصویر کشی ملتی ہے لیکن اس میں صغرا ہمایوں کے نظریہ کے برعکس مخلوط تعلیم کی حمایت اور پردہ کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے اور جدید تعلیم کو لڑکیوں کے لیے ضروری قرار دے کر اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

طیبہ بیگم نے بھی ناول لکھے۔ ان کے دو ناول 'حشمت النساء اور انور بیگم' کافی مشہور ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ناول بھی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ تعلیم نسواں ان کا اہم موضوع ہے۔ اس کے علاوہ ان میں نئی اور پرانی تہذیب کی کشمکش بھی ملتی ہے۔

نذر سجاد نے انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ناول نگاری کا آغاز کیا۔ ناول سے پہلے انھوں نے متعدد مختصر افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ پہلے پہل انھوں نے مضمون نگاری سے اپنی ادبی تخلیقات کا آغاز کیا۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیش نظر ہی شمس العلما ممتاز علی نے 1910 میں ہفتہ وار اخبار 'پھول' کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ نذر سجاد پہلے بنت نذر الباقر کے نام سے مضمون لکھتی تھیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں سلیم کی کہانی، دکھ بھری کہانی، پھولوں کا ہار، بچی رضیہ اور اس کی بکری وغیرہ شامل ہیں۔ نذر سجاد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی خواہش مند تھیں۔ جہاں بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ زندگی جینے کا سلیقہ ہو۔ چونکہ اس وقت سماج میں ہر طرف تبدیلی کا دور دورہ تھا۔ صدیوں کا مشرقی نظام ٹوٹ رہا تھا اور مغرب کے زیر اثر بہت سی چیزوں کو اخذ کیا جا رہا تھا اس لیے نذر سجاد چاہتی تھیں کہ بدلتے ہوئے سماج اور معاشرے کے ساتھ عورت کو بھی اسی طرح زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو جہاں وہ معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے لیکن وہ اسی وقت معاشرے کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکتی ہے جبکہ وہ مشرقی و مغربی دونوں طرح کی تعلیم سے آراستہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً سبھی ناولوں کا موضوع تعلیم نسواں ہے جو ان کا اصل مقصد تھا اور جس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ناول تخلیق کیے۔ ان ناولوں میں انھوں نے تعلیم نسواں پر زور دینے کے علاوہ سماج میں پھیلی ہوئی جاہلانہ رسم و رواج کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے لیکن یہ رسمیں بھی نذر سجاد تعلیم کے ذریعے ہی ترک کرنا چاہتی تھیں کیونکہ جب خواتین تعلیم حاصل کریں گی تو وہ ان جاہلانہ رسم و رواج کو بھی ترک کر دیں گی لہٰذا ان سب برائیوں اور معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے لڑکیوں کا تعلیم یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے۔

نذر سجاد نے کئی اہم ناول لکھے جن میں 'اختر النساء بیگم (1910)، جاں باز (1919)، آہ مظلومہ (1914)، ثریا (1940)، نجمہ (1939)، حرماں نصیب، مذہب اور

عشق (1935) قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام ناول انھوں نے اصلاح معاشرہ کی غرض سے لکھے اور ناخواندگی، دوسری شادی، عورتوں پر ہونے والے مظالم اور معاشرہ میں رائج فرسودہ رسم و رواج کو اپنے ناولوں کا موضوع بنا کر ان کی نشاندہی کی اور ان کی اصلاح کی طرف سماج کی بھی توجہ مبذول کرائی۔

ان خواتین کے علاوہ محمد بیگم ہیں، جنھوں نے تین ناول لکھے۔ صفیہ بیگم 'آج کل اور شریف بیٹی'، حسن بیگم کا ناول 'روشنک بیگم' (1920)، طیبہ بیگم کا 'انوری بیگم'، عباسی بیگم کا ناول 'زہرہ بیگم' (1935)، ضیا بانو کے تین ناول فغانِ اشرف، فریب اشرف، انجام زندگی، حمیدہ سلطان کا 'ثروت آرا بیگم' (1942)، بیگم شہواز کا 'حسن آرا'، اور ظفر آرا بیگم کا 'اختری بیگم' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان تمام خواتین نے اپنے زمانے کی عورتوں کی زبوں حالی، پسماندگی اور ناخواندگی کا بغور مطالعہ کر کے عورتوں کی معاشرتی حالت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اپنی تصانیف بھی خواتین کی اصلاح کی غرض سے لکھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے معاشرے میں پھیلے غلط رسم و رواج کی طرف بھی توجہ دلائی اور اپنے ماحول اور اپنے سماج کی حقیقی تصویریں پیش کیں۔

علاوہ ازیں ان سب کے یہاں زبان و بیان کی سادگی اور شائستگی نظر آتی ہے۔ کہیں بھی رنگین بیانی اور لفاظی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ البتہ ان تمام خواتین کے یہاں مشترکہ موضوعات ضرور نظر آتے ہیں کیونکہ ان سب کا منصب اس وقت کے سماج اور معاشرے کی زبوں حالی اور جاہلانہ رسم و رواج کو ختم کر کے خواتین کو تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ کرنا تھا اس وجہ سے ان خواتین کی تخلیقات میں موضوعات کی وسعت اور ناول کے فنی لوازمات کی پابندگی نظر نہیں آئے گی بلکہ ان ابتدائی ناول نگاروں سے ناول کے فنی لوازمات و معروضیات کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے۔

ان خواتین کے ناولوں کے کردار معاشرتی اور اخلاقی الجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان ناولوں کے بیشتر کرداروں کا تعلق عورتوں کی شخصی زندگی اور اس کی اس حیثیت و وقار سے ہے جو اسے اس وقت کے معاشرے میں حاصل تھی۔ اسی لیے خواتین ناول نگاروں نے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم کے بغیر نہ تو عورتوں کو سماجی وقار مل سکتا ہے اور نہ ہی تعلیم کے بغیر ان کی خانگی زندگی کامیاب ہو سکتی ہے۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے اور خواتین کے تعلیم حاصل کرنے کو معاشرتی زندگی کی کامیابی بتایا ہے اور

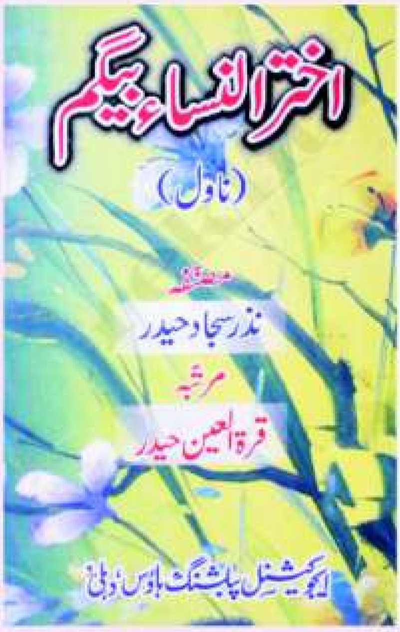

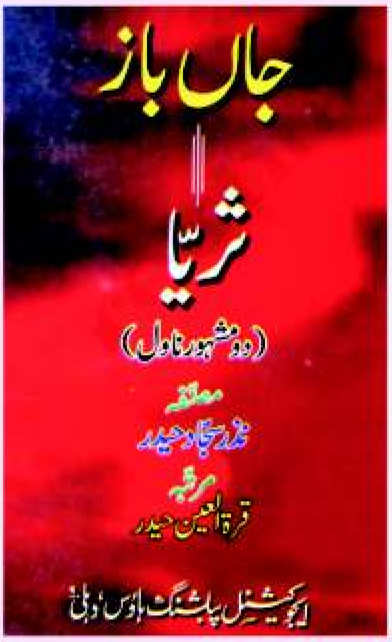

عورتوں کو بہترین زندگی گزارنے کا ایک ایسا راستہ بتایا جس پر چل کر انھیں کامیابی حاصل ہو۔ ان سب کا ماننا تھا کہ ایک عورت تعلیم حاصل کر کے ہی اپنی دشوار زندگی کو آسان بنا سکتی ہے کیونکہ عورتوں کے تمام مسئلوں کی جڑ تعلیم سے دوری ہے اگر انھیں تعلیم سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ اپنے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کر سکتی ہیں اس لیے کہ بغیر تعلیم کے انھیں نئے ماحول اور نئے ساتھیوں میں ڈھلنے میں پریشانی ہوتی ہے۔

ان ناولوں میں ہمیں مختلف طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ کردار ہیں جو اپنی پرانی مشرقی اقدار کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسری طرف وہ ہیں جو مشرق اور مغرب کے بیچ تذبذب میں نظر آتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو بنا کسی کشمکش کے مغربی اقدار بلا تامل اپنا لیتے ہیں اور کچھ ایسے کردار ہیں جو مغربی نظام کی اچھائیوں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انھیں اپنی مشرقی اقدار کا بھی پاس و لحاظ ہے اسی لیے وہ دونوں کی اچھائیوں کو اپناتے ہیں اور میانہ روی اختیار کر کے بیچ کا راستہ نکالتے ہیں۔ ان خواتین کے یہاں بیشتر کردار ایسے نظر آتے ہیں جو مغربی و مشرقی امتزاج سے خود کو ترقی یافتہ سماج میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور ایسے کردار زیادہ کامیاب اور آئیڈیل بھی نظر آتے ہیں جو مشرقی اور مغربی امتزاج سے ابھر کر جنم لیتے ہیں اور خود کو اپنے ماحول اور عہد سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و اقدار کا بھی پورا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔

خواتین کے ناولوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں وہ نظام دیکھنے کو ملتا ہے جس کی تہذیب اس وقت مٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بیشتر خواتین ناول نگاروں کے یہاں متوسط مسلم گھروں کا ماحول نظر آتا ہے جن کی زندگی میں ایک طرف ماضی کی مٹتی ہوئی تہذیب و قدر کا ماتم ہے تو دوسری طرف آنے والے نئے نظام کا عکس۔ اس منظر میں خواتین کو چونکہ گھر کی چہار دیواری میں رہ کر دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا لہٰذا اس کی پیش کش میں ان کی نظر گہری رہی ہے۔ فاطمہ بیگم سے لے کر نذر سجاد تک سب نے اس کو پیش کرنے میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

ان ناولوں میں ہمیں اس عہد کے رسم و رواج کی تصویر کشی بھی مل جاتی ہے۔ ہندوستانی مسلم گھرانوں کے رسم و رواج کو شادی بیاہ کی رسومات کا بھی بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ان خواتین نے ہر قسم کے رسم و رواج کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ بچے کی پیدائش سے لے کر شادی بیاہ اور قضا و موت کی تمام رسموں کو تفصیل کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''ہماری معاشرتی زندگی میں ان رسموں کی جو اہمیت ہے اسے ان ناول نگار خواتین نے پوری طرح محسوس کیا ہے اور ان کی تفصیلیں بیان کرتے وقت پورے فنی خلوص اور انہماک سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی وہ ان ناولوں میں ان رسوم کو ترک کرنے کی طالب و خواہاں نظر آتی ہیں اور بعض اوقات انھیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس بات سے قطع نظر کہ ان رسوم میں کیا کیا اچھائیاں اور برائیاں ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں ان کا ترک معاشرہ کے لیے مفید ہے یا مضر، ان کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت مسلم ہے اور ان کے پیچھے اس قوم کے خیالات و جذبات اور اس سے بھی زیادہ نظریہ حیات کا جو گہرا پرتو ہے وہ انھیں تاریخ کا ایک بیش بہا سرمایہ بناتا ہے اور یہ بیش بہا سرمایہ ہمیں عورتوں کی بدولت ملا ہے جو خواہ فن کے بڑے کامیاب نمونے نہ ہوں لیکن زندگی کے موثر اور حسین و جمیل مرقعے ضرور ہیں۔[3]

ان خواتین نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کو اپنا موضوع بنایا اور ان کے ناولوں کا مقصد سماجی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے لانا خاص کر خواتین کی حالت کو بہتر بنانا اور ان کو جہالت، ناخواندگی اور زبوں حالی سے نکال کر آزادی اور مساوات کا حق دلانا ہے جس کے لیے انھوں نے تعلیم نسواں کو خاص اہمیت دی اور اپنے ناولوں میں بھی ایسے قصے کہانیاں پیش کیے جن میں لڑکیوں کے لیے مغربی ومشرقی تعلیم کو ضروری قرار دیا۔ اس کے باوجود خواتین کی ان اصلاحی کوششوں کو ناول کی تاریخ لکھنے والوں نے بہت سرسری طور پر بیان کیا ہے جس سے ان ابتدائی خواتین ناول نگاروں کی تخلیقات کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ ناقدین کی اس بے پرواہی کا گلہ قرۃ العین حیدر نے بھی کیا ہے جنھوں نے ابتدائی دور کی خواتین 'صغرا ہمایوں' سے لے کر 'نذر سجاد' تک لکھنے والیوں کو نظر انداز کیا اور ان کا صرف سرسری ذکر کرنے پر اتفاق کیا۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

''ایک نامور ترقی پسند نقاد نے بہت ہی استہزائیہ انداز میں اماں اور دوسری خواتین ناول نگاروں کا تذکرہ یوں کیا ہے گویا وہ بہت حقیر صنف سے تعلق رکھتی تھیں اور ذہنی لحاظ سے بہت پسماندہ تھیں اور یہی ترقی پسند نقاد آزادی نسواں اور عورتوں کی ہمسری کا راگ الاپتے تھے.... ایک اور مشہور و معروف مارکسس نقاد نے نذر سجاد حیدر کے متعلق تحریر کیا کہ انھوں نے ناول لکھنے کی کوشش کی..... جملہ پورا نہیں کیا۔ اس احساس برتری اور بدماغی کا کوئی جواب نہیں۔ یعنی وہ صدیوں پرانی Fuedal مردانہ برتری کا رویہ ان کے یہاں برقرار تھا۔''4

علی عباس حسینی نے بھی اپنی کتاب 'اردو ناول کی تاریخ وتنقید' میں خواتین ناول نگار کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ صرف ان ابتدائی خواتین ناول نگار کا نام گنوا دینا کافی سمجھا اور یہ کہہ کر اپنی بات ختم کردی ہے کہ خواتین نے بھی کچھ قصے اور ناول لکھے ہیں۔ وہ خواتین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس اصلاحی دور میں جب مسلم خواتین کو تعلیم کی طرف راغب کیا جارہا تھا کچھ پڑھی لکھی عورتوں نے چھوٹے قصے اور ناول لکھے۔ ان کا مقصد لڑکیوں کو صحیح تعلیم دینا اور انتظام خانہ داری بتانا تھا۔ ان کی غرض حسن وعشق کی کہانی سنانا نہ تھی اور نہ جنسیات، اقتصادیات وسیاسیات کے مسائل سے بحث ان کا مقصد تھا۔ یہ سب کی سب کتابیں مولانا نذیر کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔''5

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علی عباس حسینی نے ان خواتین کی محنت وکوشش کو صرف چار سطروں میں بیان کردینا ضروری سمجھا۔ جب کہ ابتدائی دور کی ان خواتین نے نہ صرف تعلیم نسواں کی ہی طرف لوگوں کو متوجہ کیا بلکہ ان خواتین نے سماج میں پھیلی بہت سی برائیوں کو ختم کرنے اور عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف بھی آواز اٹھائی، آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ سماجی اصلاح میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مولوی نذیر کے قصوں کی تقلید سے آگے بڑھ کر بہت سے اہم ناول لکھے۔ لڑکیوں کے لیے نہ صرف مذہبی تعلیم اور امور خانہ داری کی تعلیم کا بلکہ جدید و اعلی مغربی تعلیم کی بھی حمایت کی۔ اس کے باوجود بیشتر نقادوں نے ان کے مختصر اذکر پر اکتفا کیا ہے۔

یوسف سرمست نے اپنی کتاب 'بیسویں صدی میں اردو ناول' میں ان خواتین ناول نگاروں کے ناولوں اور قصوں کی وضاحت کی ہے لیکن سب سے زیادہ اہم بات جو یوسف سرمست نے لکھی ہے وہ یہ کہ انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ کچھ خواتین ناول نگاروں نے ضرور نذیر احمد اور راشد الخیری کی اتباع میں ناول لکھے جن کا موضوع تعلیم نسواں اور مذہبی تعلیم ہے لیکن کچھ خواتین نے نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثر سے آزاد ہوکر بھی بہت سے ناول تخلیق کیے۔ یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''بہت سے ناول ایسے ہیں جو نذیر احمد اور راشد الخیری کی تقلید اور ان کے اثر سے صاف طور پر باہر نظر آتے ہیں۔ اس لیے ناولوں کی مصنفہ اپنی انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔ نذیر احمد مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام کی بجا آوری کو ناممکن سمجھتے تھے۔ راشد الخیری کے ہاں تو مغربی تہذیب کا اختیار کرنا گویا مذہب ہی سے نہیں بلکہ اخلاق سے بھی بیگانہ ہوجانے کا نام ہے لیکن اس کے برخلاف ایسی تمام خواتین ناول نگار جو نذیر احمد اور راشد الخیری کے اثر سے باہر ہیں۔ نہ صرف مغربی تہذیب کے ساتھ مذہبی احکام کی بجا آوری کو ممکن سمجھتی ہیں بلکہ اس کو مستحسن قرار دیتی ہیں۔ اس لیے وہ مغربی تہذیب کے ساتھ مشرقی قدروں کو بھی اپنانے پر زور دیتی ہیں۔''6

بہر حال یوسف سرمست نے کچھ حد تک خواتین کے ناولوں اور ان کے قصوں کی مختصراً وضاحت کی ہے۔ اس کے علاوہ وقار عظیم نے بھی اپنی کتاب 'داستان سے افسانے تک' میں ان ابتدائی خواتین کے ناولوں کا کچھ حد تک ذکر کیا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے اپنی کتاب 'اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار' میں وضاحت کے ساتھ ان خواتین کی اصلاحی کوششوں اور ان کی ادبی تخلیقات کا ذکر کیا اور اردو ادب میں ان کے مقام ومرتبہ کی اہمیت کو بھی تسلیم کرانے کی کوشش کی ہے۔

حواشی

1۔ ڈاکٹر نیلم فرزانہ: اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، نئی دہلی، براؤن بک پبلی کیشنز، 2014، ص 17
2۔ صغرا ہمایوں: سرگزشت ہاجرہ بحوالہ وقار عظیم، داستان سے افسانہ تک، دہلی، طاہر بک ایجنسی، 1972، ص 122
3۔ وقار عظیم: داستان سے ناول تک، دہلی، طاہر بک ایجنسی، 1972، ص 132
4۔ قرۃ العین حیدر: کار جہاں دراز ہے، دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2003، ص 279
5۔ علی عباس حسینی: اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، لکھنؤ، انڈین بک ڈپو 2000، ص 342/355
6۔ یوسف سرمست: بیسویں صدی میں اردو ناول، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ص 178/179

■

Zulfi Haseeb
Room No: 47, Shipra Hostel JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9968431550

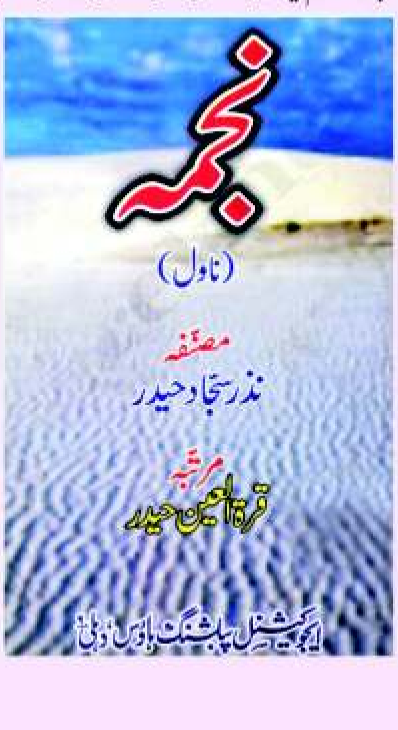

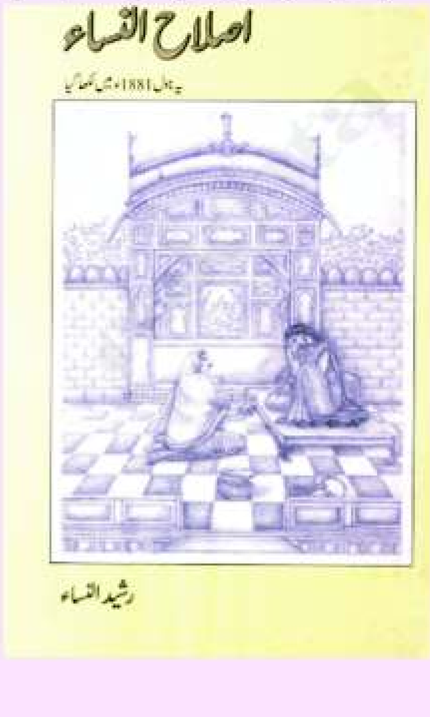

شائستہ مہ جبین

راجستھان میں سیرت نگاری

اجمالی جائزہ

راجستھان میں سیرت نگاری سوانح نگاری کے ساتھ ہی شروع ہوئی۔ سیرت نگاری کے ضمن میں ایک اہم نام حاجی نجم الدین فتح پوری (1819-1870) کا ہے۔ جو علاقہ شیخاواٹی سے تعلق رکھتے تھے اور اس علاقے کے پہلے صاحب دیوان شاعر بھی ہیں اور مصنف بھی ہیں۔ آپ نے دو درجن سے زیادہ کتب تحریر فرمائیں تھی۔ گو ان کتابوں کی حیثیت مذہبی ہے لیکن کچھ کتابیں سیرت نگاری اور سوانح نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام طور سے سیرت نگاری مذہبی شخصیت کا تصور ذہن میں پیدا کرتی ہے۔ ابتدا میں صرف حضور سرور کونین کے لیے سیرت نگاری مخصوص رہی۔ بعد میں خلفائے راشدین، صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور ان کے بعد بزرگان دین پر لکھی جانی والی کتابوں کو بھی سیرت نگاری میں شامل کیا گیا۔ اب کسی نیک شخص اور نیک نام ہستی پر بھی سیرت لکھی جاتی ہے۔

سیرت کے معنوں میں صاحب تذکرہ کے اخلاق و اعمال حسنہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ مخلوق خدا سے اس کا رویہ اور طور طریق دیکھ کر اس کی سیرت نگاری کی جاتی ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر خواجہ نجم الدین کی معرکۃ آرا کتاب شجرۃ الابرار ہے۔ یہ کتاب 1267ھ مطابق 1850 میں لکھی گئی تھی۔ اور ابھی حال ہی میں ان کے نبیرہ پیر غلام جیلانی نجمی فاروقی نے اس کو نئی ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ اس ایڈیشن پر سنہ اشاعت 2017 تحریر ہے۔ اس کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور سرور کائنات تک تمام پیغمبروں کی سیرت اور ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، اہل بیت اطہار، امام اربعین، اور بزرگان دین کی سیرت بیان کی گئی ہے۔ اس ضخیم کتاب میں کل صفحات 810 ہیں۔ اس کتاب میں پانچ سو سے زائد حضرات کا ذکر ہے۔ اس طرح یہ کتاب مذہبی نوعیت رکھتی ہے۔

راجستھان میں واحد مسلم ریاست ٹونک ہوا کرتی تھی۔ وہاں نواب محمد علی کے مختصر دور حکومت (1864-1867) میں سوانح نگاری کا کام ترجمہ کی شکل میں عمل میں آیا۔ نواب محمد علی معزول ہو کر بنارس چلے گئے تھے۔ وہاں بھی ان کی ایما پر تراجم کا کام بدستور جاری رہا۔ حالانکہ نواب محمد علی کی ایما پر تصنیف کی جانے والی زیادہ تر کتب فارسی میں ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں۔ لیکن فارسی کتب کے ساتھ ساتھ کچھ کام اردو میں بھی ہوئے۔ نواب محمد علی کے دور میں جس تیزی سے تراجم اور سیرت پر کام ہو رہا تھا، ان کے انتقال کے بعد گویا تھم سا گیا۔ ان کے بیٹے نواب ابراہیم علی خاں نے کم و بیش پچاس سال حکومت کی لیکن اتنے طویل عہد میں بھی محمد علی جیسا کام نہیں ہو سکا۔

اسی دور کی ایک اہم کتاب 'قرۃ العیون' ہے۔ 'قرۃ العیون' کی پہلی جلد راقمہ نے جے پور میں راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی میں دیکھی ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب 'سرور المحزون' کی شرح ہے اور اس کے سرورق پر لکھا ہے "حسب الحکم جناب یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ والی ٹونک دام حشمتہ و اقبالہ"۔ یہ مفید عام آگرہ سے 1271ھ میں شائع ہوئی۔

نواب ابراہیم علی خاں کے عہد میں وجود میں آنے والی کچھ منظوم سیرت کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ حسام الاسلام فی فتوحات سید الانام۔ یہ فتوحات شام کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔ جس کو سید عبد الرزاق کلامی نے اردو میں نظم کیا ہے۔ اس میں آنحضرت کے غزوات و فتوحات کا ذکر ہے۔ 1328ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوئی۔

2۔ صمصام الاسلام۔ یہ فتوح الشام کا اردو منظوم ترجمہ ہے۔اس کو بھی حافظ عبد الرزاق کلامی نے منظوم کیا تھا۔ 1312 ھ میں اعظم المطابع، جونپور سے طبع ہوئی تھی۔

3۔ قمقام الاسلام۔ اس کو بھی عبد الرزاق کلامی نے اردو میں منظوم کیا ہے۔اور یہ کتاب بھی 1312 ھ میں جونپور سے شائع ہوئی۔ان کتابوں میں سے راقمہ کو صرف ایک کتاب 'حسام الاسلام فی فتوحات سید الانام' ہی مل سکی، جو راجستھان اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور' میں موجود ہے۔

نوشیرواں نامہ 1896

نوشیرواں دنیا کے نیک نام اور عادل بادشاہوں میں سے تھا۔اس کی زندگی دیگر بادشاہوں کے لیے ایک مثال تھی۔اس کی نیک نامی کے سبب اس پر بہت سی کتب شائع ہوئیں۔منشی دیبی پرشاد نے اپنی کتاب نوشیرواں نامہ میں نوشیرواں بادشاہ کی سیرت بیان کی ہے۔منشی دیبی پرشاد کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔وہ ثقیل الفاظ کے استعمال سے بچتے ہیں۔اور عوام کی زبان کے انداز میں تحریر لکھتے ہیں ان کی تحریر میں قدامت بھی صاف نظر آتی ہے۔

جمال نبی 1901

اس مختصر رسالے کے مرتب ہیں سلطان الدین مبین۔ پہلے حصہ میں آنحضرت کی ولادت کا ذکر مبارک ہے۔دوسرے حصہ میں آپ کی تربیت اور پرورش کا ذکر ہے۔تیسرے حصہ میں آپ کے اسفار کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔چوتھے باب میں آپ کی ازدواجی زندگی کی ابتدا اور حضرت خدیجہ کا ذکر ہے۔

تذکرہ محبوب جہاں 1908

اس کے مرتب انوار الرحمٰن بسمل تھے۔میر قربان علی کی سوانح اور سیرت پر مبنی ہے۔

تذکرۃ الرسول 1920

یہ بھی انوار الرحمٰن بسمل کی مرتب کردہ ہے۔مرتب نے اس کتاب میں رسول اکرم کا نسب نامہ، آپ کی ازواج مطہرات اور ان انبیا کے حالات درج کیے ہیں جو آپ کے اجداد تھے۔ان کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگوں کا بھی مفصل ذکر ہے۔آپ کا حلیہ معجزات اور آپ کے ملفوظات پر گفتگو کی ہے۔

سیرت عثمان 1916

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو سو صفحات پر مشتمل ہے۔جے پور کی قوم پرنٹنگ ورکس، سے 1916 میں شائع ہوا تھا۔اس کے مرتب ہیں تسنیم نارنولی۔یہ در اصل حضرت عثمان ابن عفان کی مختصر سوانح اور سیرت ہے۔ حضرت عثمان کی نجی زندگی کے حالات، ان کے اخلاق و خصائل، بس، اوت اور صلہ رحمی اور ان کے حسن سلوک کا ذکر کیا گیا ہے۔

محفل خواجہ 1923

یہ خواجہ معین الدین چشتی کی سیرت اور سوانح پر مبنی ہے۔اس کو مولانا کلن شاہ شوکی جے پوری نے تصنیف کیا ہے اور یہ کتاب کنہیا لال اسٹیم پریس آگرہ سے 1923 میں شائع ہوئی۔

نذر اتا 1934

سنہ 1352 ھ (1934) میں ایک کتاب جے پور میں منظر عام پر آتی ہے جس کا نام 'نذر اتا' ہے اور جس کے مولف مولانا شاغل ہیں۔یہ کتاب در اصل حضرت سید محمد اتا کی سوانح عمری ہے۔جو فیروز شاہ کے عہد میں علاقہ نارنول میں موجود تھے اور جو عین عید کے دن شہید کر دیے گئے تھے۔در اصل اس کتاب میں صحیح معنوں میں نہ تو سوانح عمری ہے اور نہ ہی سیرت نگاری کی خوبیاں۔متن سے زیادہ حاشیہ ہے اور حاشیہ بھی اس قدر طویل ہے کہ قاری الجھ کر رہ جاتا ہے۔کہیں کہیں مولف خود بھی اپنی تحریر سے مطمئن نظر نہیں آتا۔موئف کو حضرت محمد اتا ترک کی تاریخ ولادت بھی دستیاب نہیں ہوئی۔اس کتاب کو صرف تاریخی واقعات کے نقطہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔کہیں کہیں مولف نے صرف اندازے سے کام چلانے کی کوشش کی ہے۔

عقدہ کشا۔(سیرت و فضائل اہل بیت) یوسف علی خاں عزیز

سنہ 1934 میں ریاست جے پور میں ایک کتاب تصنیف کی گئی جس کا نام ہے' عقدہ کشا' اس کے مصنف ہیں مشہور و معروف شاعر اور صوفی بزرگ یوسف علی خاں عزیز، جو آغا دہلوی کے شاگرد بھی ہیں۔اس کتاب میں اہل بیت اطہار کی فضیلت اور ان کی سیرت بیان کی گئی ہے۔خاص طور پر حضرت امام حسین کی سیرت واقعہ کربلا کی روشنی میں دکھائی گئی ہے۔کربلا کے واقعہ کے بعد مختار نامی شخص جب سامنے آتا ہے اور شہیدان کربلا کا انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی سیرت کے پہلو کو بھی مولانا عزیز نے ملحوظ رکھا۔در اصل واقعہ کربلا کے وقت یہ شخص قید خانے میں تھا۔

ہمارے خواجہ، 1930

ساٹھ صفحات کا یہ کتابچہ خواجہ معین الدین اجمیری کی سیرت اور حالات پر 1930 میں عزیزی پریس آگرہ سے شائع ہو کر منظر عام پر آتا۔اس کتابچے کے مصنف مولانا معنی اجمیری ہیں۔مولانا معنی کی تاریخ سلف جو ابتدا میں قسطوار اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ کئی بزرگان دین کی سیرت پر بھی انھوں مضامین تحریر کیے، جو ہفتہ وار استانہ، اجمیر میں شائع ہوا کرتے تھے۔

آخر میں راقمہ اصغر علی آبرو کی کتاب 'حدیقہ راجستھان' (1900) کا کچھ ذکر کرنا چاہتی ہے۔اصغر علی آبرو نے اس کتاب کو اس قدر مشکل الفاظ اور اصطلاحات کے ساتھ لکھا ہے کہ آج کا قاری قطعی طور پر اس کی تحریر کو نہیں سمجھ سکتا۔شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں دو دو تین تین صفحات تک صرف القاب و آداب ہی لکھے ہیں۔تمام کتاب داستانی انداز اور خوشامدانہ تحریر پر مشتمل ہے۔نوابین کے سیاسی واقعات کو اس قدر گھماؤ پھراؤ سے تحریر کیا گیا ہے کہ یہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے سوانح نگاری کے تعلق سے کون سے جملے منتخب کیے جائیں۔جس طرح قدیم داستانوں میں قصہ در قصہ ہوا کرتا تھا اسی طرح اس کتاب میں بھی جملہ در جملہ ایسی باتیں ہیں کہ قاری سمجھ نہیں پاتا کہ ابھی ایک بات مکمل ہوئی نہیں کہ یہ دوسری بات کہاں سے آ گئی۔اس لیے راقمہ اس تاریخی کتاب سے سوانح نگاری کی جھلکیاں نکالنے سے قاصر ہے۔

"سیرت کے معنوں میں صاحب تذکرہ کے اخلاق و اعمال حسنہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔مخلوق خدا سے اس کا رویہ اور طور طریق دیکھ کر اس کی سیرت نگاری کی جاتی ہے۔اس وقت میرے پیش نظر خواجہ نجم الدین کی معرکۃ آ را کتاب شجرۃ الابرار ہے۔یہ کتاب 1267 ھ مطابق 1850 میں لکھی گئی تھی۔اور ابھی حال ہی میں ان کے نبیرہ پیر غلام جیلانی نجمی فاروقی نے اس کو نئی ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔اس ایڈیشن پر سنہ اشاعت 2017 تحریر ہے۔اس کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور سرور کائنات تک تمام پیغمبروں کی سیرت اور ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔"

■

Shaista Mehjabi
House No: 949, Shri Ji ki Mori
Tripoliya Bazar
Jaipur - 302002 (Rajasthan)
Email: mehzabikhan0@gamil.com

صلاح الدین سابا

اردو تحقیق کا غواص
ڈاکٹر محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی پیدائش 7 دسمبر 1904 کو شہر حیدرآباد کے محلہ شاہ گنج میں ہوئی۔ چار سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایم اے کے بعد حکومت کے وظیفے کے طفیل آپ انگلینڈ گئے اور 1929 میں 'اردو زبان کے آغاز وارتقا' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال حیدرآباد لوٹ آئے۔ صوتیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دوبارہ لندن کا سفر کیا۔ یورپ سے واپسی کے بعد جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں ریڈر بنے اور پھر پروفیسر کی حیثیت سے اردو کی خدمت کی۔ اس کے بعد زور صاحب کا تبادلہ دارالعلوم کالج میں بحیثیت صدر ہوا۔ پھر چادرگھاٹ کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے چند ماہ بعد کشمیر یونی ورسٹی کی صدارت قبول کی۔ تقریباً دس سال عہدے پر فائز رہے۔ اس یونیورسٹی کے ساتھ ان کا منسلک ہونا شعبے کی ترقی کی راہ میں نیک فال ثابت ہوا۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں گزرا۔ آخرکار اس ہمہ جہت شخصیت نے 52 ستمبر 1962 میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔

ڈاکٹر زور صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز تعلیم کے زمانے سے ہی ہو چکا تھا۔ حیدرآباد اور شمالی ہند کے معیاری رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ 1925 میں ان کی پہلی تصنیف 'طلسم تقدیر' منظر عام پر آئی جو اسی سال ان کی دوسری کتاب 'روح تنقید' بھی شائع ہوئی۔ وہ بہ یک وقت اردو کے ایک صاحب نظر نقاد بلند پایہ محقق، ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ ایک مورخ، مدون، شاعر اور افسانہ نگار بھی تھے۔ وہ ایک باعمل، متحرک اور فعال شخصیت تھے۔ علاوہ ازیں بحیثیت مرتب انھوں نے اردو کی جو خدمت کی وہ ناقابل فراموش ہے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ یعنی پورے 37 سال اردو کی خدمت میں گزار دیے۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے تحت دکن کے پوشیدہ ادبی ذخیروں کو جن فرزندوں نے اپنے خون جگر سے سینچا۔ ان میں ایک نام سید محی الدین قادری زور کا ہے۔ ان کے دل میں اس زبان و ادب کی تحقیق کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ اسی عشقیہ جذبے کے تحت انھوں نے اپنی پوری زندگی دکنی زبان و ادب کی تحقیق کے لیے وقف کردی۔ بقول ڈاکٹر محمد علی اثر:

''ڈاکٹر زور جامعہ عثمانیہ کے ان نامور اور قابل فخر فرزندوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی بے پناہ تحقیقی و تدریسی اور تنظیمی صلاحیتوں کے ذریعے کم و بیش چار دہوں تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ وہ اپنی ذات میں ایک فرد یا انجمن ہی نہیں بلکہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔'' (سب رس، حیدرآباد، نومبر و دسمبر، 1966)

ڈاکٹر زور تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ بے پناہ تنظیمی صلاحیت کے بھی مالک تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد انھوں نے 1931 میں رکھی جب ان کی عمر محض 27 سال تھی۔ 1933 سے ادارے کے کتب خانے میں کتابیں جمع کی جانے لگیں۔ یہ زور صاحب کی کوشش اور لگن کا ہی نتیجہ تھا کہ چند ہی سال میں کتابوں اور مخطوطات کا ایک اعلیٰ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ ڈاکٹر زور نے ایسے ایسے نادر مخطوطات کو مرتب کر کے شائع کروایا جس سے اردو دنیا ناواقف تھی۔ ذیل میں ان مخطوطات کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ:

کلیات محمد قلی قطب شاہ، ڈاکٹر زور کی دکنی ادبی خدمات کے یادگار کارناموں میں سے ہے۔ یہ کلیات، قطب شاہی عہد کے پانچویں حکمراں سلطان محمد قلی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ 1939 کی ابتدا میں 'دوصد سالہ جشن یادگار ولیؔ' کے موقعے پر دکن کے مخطوطات کی جو نمائش منعقد کی گئی تھی اس میں اس کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا تھا کہ دکن کے جو ادبی جوہر بکھرے پڑے ہیں انھیں یکجا کر کے منظر عام پر لایا جائے۔ مگر اس سے پہلے ہی ڈاکٹر زور کا ذہن اس عمدہ سوچ کی طرف راغب ہو چکا تھا اور اپنی اسی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا کام بھی وہ شروع کر چکے تھے۔ انھوں نے قلی قطب شاہ کی کلیات کو ترتیب دینے کا کام مارچ 1937 سے شروع کیا اور تین

سال کی کڑی محنت کے بعد جون 1940 میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ جس میں سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد کا پیش لفظ شامل ہے۔ 1028 صفحات پر مشتمل اس کلیات میں ڈاکٹر زور کے قلم سے تین سو پچیس صفحات پر محیط ایک علمی و تحقیقی مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں نہ صرف کلیات کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے بلکہ محمد قلی کے واقعات حیات، کتاب کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ممکنہ حد تک دیگر نسخوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں 22 نظمیں شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں 312 غزلیں اور آخری حصے میں دیگر اصناف سخن یعنی قصائد، رباعیات، مراثی، ریختی اور مثنویاں شامل ہیں۔ کلیات میں چند خوبصورت تصویریں بھی موجود ہیں جیسے سلطان محمد قلی قطب شاہ، بھاگمتی، حیدر محل، چار مینار، بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔ ان تصاویر سے اس کتاب کی رونق میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ یہ مقدمہ ایک تحقیقی مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ڈاکٹر زور نے قطب شاہ کے تخلص پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں کل 17 تخلص استعمال کیا ہے اور کلیات میں محمد قلی نے اکثر غزلوں اور نظموں میں اپنا تخلص معانی استعمال کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں قطب یا قطب شہ بھی ملتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض محققین نے اسے دو الگ الگ افراد کا کلام سمجھا مگر ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق سے نتیجہ اخذ کیا:

''معلوم ہوتا ہے خود سلطان محمد قلی نے آخر کو معانی کی جگہ قطب شہ تخلص کو ترجیح دی تھی اس لیے پہلا دیوان مرتب ہونے کے بعد جو کچھ لکھا وہ اسی تخلص سے لکھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی وضاحت کے بعد سلطان محمد نے اس کا کلام مرتب کرتے وقت ہر جگہ معانی نکال کر قطب شہ ڈال دیا ہو۔'' (ڈاکٹر زور، کلیات قلی قطب شاہ، ص 412)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی مقدمہ میں زور صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کلیات کی اشاعت سے اردو شاعری کی دوسو سال قدیم تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور نے جو مقدمہ پیش کیا ہے اس میں تحقیقی اور تنقیدی پہلو نمایاں ہے۔ کتاب کے محاسن اور معائب دونوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کے متعلق اکبر حیدری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''آج تک اعلی اردو نثری کتابوں پر جتنے بھی مقدمے لکھے جاچکے ہیں ان سب میں ڈاکٹر زور کا یہ مقدمہ مبسوط اور مربوط، سیر حاصل اور عظیم الشان ہے۔ یہ ڈاکٹر زور کے کامیاب اور Genius انشا پرداز ہونے کا بین ثبوت ہے۔''

(محی الدین قادری زور، حیات، شخصیت اور کارنامے، ص 307)

زور صاحب کے کلیات قلی قطب شاہ کو مرتب کرنے کے 45 سال بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی درخواست پر سیدہ جعفر نے اسی کلیات کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر زور سے جو تسامح ہوا اس کی طرف سیدہ جعفر نے بخوبی اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمد قلی کی نظموں کو موضوع کی مناسبت سے مختلف عنوانات دیے ہیں جب کہ اصل نسخہ میں عنوانات نہیں ہیں۔ جیسے 'شاعر کا مذہب' عنوان قائم کر کے ڈاکٹر زور نے دو ایسی نظموں کو اس کے تحت جگہ دی ہے جن میں شاعر نے اپنے عقائد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح شب برات کی سرخی کے تحت دس، عید رمضان کے موضوع پر گیارہ، بقر عید کے موقع پر کہی ہوئی نو نظموں کو نوروز کے عنوان کے تحت کلیات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس عنوان بندی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس سے نظموں کا موضوعاتی تعین عمل میں آیا جس کے سبب کسی خاص موضوع کی نظم کو تلاش کرنے میں سہولت ہوگئی۔

کلیات قلی قطب شاہ میں بعض غزلیں ایسی ہیں جن میں ایک خاص موضوع پر مربوط اور مسلسل خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور ایک مرکزی تصور بھی موجود ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر زور نے ان غزلوں کے لیے نظم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے علاوہ سیدہ جعفر نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کلیات کے تیسرے حصے میں ڈاکٹر زور نے ریختی کی سرخی قائم کر کے چند ایسی غزلیں درج کی ہیں جن میں عورت نے مرد سے اظہار عشق کیا ہے اور جن میں عورتوں کی زبان اور ان کے مخصوص احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ لیکن کلیات کے حصہ دوم میں ایسی بعض غزلیں موجود ہیں جنھیں اس زمرے میں شامل کیا جاسکتا تھا مگر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سید جعفر نے الفاظ اور معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

''ڈاکٹر زور کے مرتبہ کلیات میں اکثر جگہ سنسکرت کے تت سم اور تت بھو الفاظ اور دکنی کے قدیم لفظوں کے معنی یا تو نہیں بتائے گئے ہیں یا جو معنی بتائے گئے ہیں ان کی صحت کی طرف مرتب نے توجہ نہیں کی ہے۔''

(سیدہ جعفر، کلیات قلی قطب شاہ، ص 278)

ان اعتراضات کو ڈاکٹر زور نے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے۔ ان تمام مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور اس کلیات کو ترتیب دینے میں کہیں نہ کہیں تدوین کے قاعدے پر کھرے نہیں اتر پائے ہیں۔ چونکہ پہلی کوشش تھی اور انھوں نے حتی الامکان اس کے ساتھ انصاف کرنا چاہا اور جہاں کہیں بھی ان کے مطابق خامیاں رہ گئیں وہاں انھوں نے اس ضمن میں اپنی لاعلمی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ پہلی کوشش میں سو فیصد درستگی کی امید رکھنا ہماری ہی کم عقل کو ثابت کر رہا ہے۔ ڈاکٹر زور ہمیشہ دکن کے گم نام ادبی ذخیروں کو تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی خواہش رکھتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی کوشش اور کسی کام کو انجام دینے کی لگن کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر حفیظ سے ان کی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر زور نے ایک بار کہا تھا:

''بیوقوف صاحب! کوئی قلم اٹھاتے ہی نوبل پرائز ہولڈر نہیں بن جاتا۔ برسوں قلم گھسنا پڑتا ہے، تب کہیں ایک معیار پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات ہم دکھنیوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ چاہتے ہیں کہ لکھیں گے تو معرکے کی کتاب لکھیں گے ورنہ نہیں لکھیں گے۔ اسی طرح گم نام مرجاتے ہیں۔'' (ادبی تحریریں، ص 15)

اردو شہ پارے:

جس زمانے میں ڈاکٹر زور لندن اور پیرس میں قیام پذیر تھے اسی دوران انھیں آکسفرڈ، کیمبرج، پیرس کی یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی نایاب قلمی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں بعض ایسی تھی جن کے نسخے ہندستان میں موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ ان نادر مخطوطات کو علمی دنیا میں متعارف کرنا ضروری ہے۔ آج سے 90 سال قبل 1928 میں 'اردو شہ پارے' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو 1929 میں شائع ہوئی۔ اس وقت نہ عام اردو دانوں کو معلوم تھا کہ اردو زبان و ادب میں چار سو سال قبل اتنی اعلی درجے کی نظم و نثر لکھی گئی ہوگی۔ اردو شہ پارے نے اردو زبان کی ادبی تاریخ کی قدامت قائم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ مگر اس موضوع پر ابتدائی کوشش ہونے کی بنا پر اس میں بعض خامیاں تھیں۔ بعض شاعروں کے حالات میں قطعیت نہ تھی اور بعض بیانات ظن اور قیاس پر مبنی تھے۔ اردو شہ پارے میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک اردو نظم و نثر کے شہ پاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ شعرا اور نثر نگاروں کے حالات کے ساتھ ان کی نظم و نثر کے بہترین نمونوں کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب کے

شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں ان واقعات کا تذکرہ ہے جن کا سامنا انھیں مواد فراہم کرنے کے دوران کرنا پڑا۔

ارشادنامہ:

ڈاکٹر زور نے بیجاپور کے مشہور صوفی شاعر برہان الدین جانم کی عارفانہ مثنوی 'ارشاد نامہ' کو بھی مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے ارشادنامہ 1943 کے آس پاس مرتب کر کے چھپوایا تھا۔ اس کے آغاز میں انھوں نے ایک معلوماتی مقدمہ لکھا ہے لیکن افسوس کہ کسی وجہ سے یہ مقدمہ نامکمل اور ادھورا رہ گیا ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے جانم اور ان کے والد میراں جی شمس العشاق کے سلسلہ نسب، ولادت، وفات، تصانیف اور دیگر کوائف کی تحقیق کی ہے۔ زور صاحب کا مرتبہ متن واحد نسخے پر مبنی ہے۔ ارشاد نامہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زور نے سکھ سہیلا بھی مرتب کیا یہ بھی شاہ برہان الدین جانم کی ایک صوفیانہ نظم ہے۔ جو چار مصرعوں کے اٹھائیس بندوں پر مشتمل ہے۔ زور صاحب نے اس کا مکمل متن مرتب کیا لیکن اپنے ماخذی نسخے یا نسخوں کا حوالہ نہیں دیا۔

تذکرۂ مخطوطات:

ڈاکٹر زور کا ایک اہم کارنامہ تذکرۂ مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ عربی، فارسی، اردو اور خصوصاً دکنی کے ذخیرۂ مخطوطات کے اعتبار سے دنیا کے چند اہم اور قابل فخر کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ ان مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایک ہزار ایک سو پچاس مخطوطات کی وضاحتی فہرست پانچ جلددوں میں شائع کی ہے۔ تذکرۂ مخطوطات کی پہلی جلد 1943 میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے پہلی بار شائع ہوئی جو 396 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں دو سو پچہتر مخطوطات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسری جلد 1951 میں شائع ہوئی۔ اس میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے مخطوطے شامل ہیں۔ تیسری جلد 1957 میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب 890 صفحات اور 200 قلمی نسخوں کی فہرست ہے۔ چوتھی جلد 1958 میں شائع ہوئی۔ 296 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 200 قلمی کتابوں کی توضیح کی گئی ہے۔ پانچویں جلد 1959 میں شائع ہوئی۔ یہ 346 صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم جلد ہے جس میں 250 قلمی نسخوں کی فہرست ہے۔ زور صاحب کے بعد آخری جلد 1983 میں شائع ہوئی جسے اکبرالدین صدیقی اور محمد علی اثر نے مرتب کیا ہے۔

ان میں ایسے قلمی نسخے بھی ہیں جو اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکے۔ ان فہرستوں میں قدیم دکنی شعرا اور ادیبوں کے مخطوطات کے علاوہ شمالی ہند کے مصنفین کی قلمی کتابیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف مخطوطے کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے بلکہ مصنف کے واقعات حیات، کتاب کی ادبی قدر و قیمت اور اس کے ماخذوں پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ممکنہ حد تک دیگر نسخوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ ان میں بعض ایسے صاحب دیوان شعرا کا تذکرہ اور نمونہ کلام درج ہے جن کے نام یا تخلص سے بھی اردو دنیا نا آشنا تھی۔ ان کی اس محنت و مشقت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں۔

''سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے سیپیاں، مرجان اور موتی نکال لانا یقیناً ایک بہت بڑا کام ہے لیکن ان موتیوں کو جانچنا پرکھنا اور پھر ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اس سے بھی بڑا کام ہے۔ ڈاکٹر زور نے ایک صاحب بصیرت پارکھ اور مخطوطہ شناس کی حیثیت سے قدیم اردو ادب کے نادر و نایاب مخطوطات کو اہل علم کے سامنے پیش کر کے تاریخ ادب اردو میں ڈھائی تین صدیوں کا اضافہ کیا ہے۔'' (سب رس 1996، ص 29)

تاج الحقائق:

ڈاکٹر زور نے دکن کی بہت سی نظموں کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی مرتب کیا۔ تاج الحقائق دکنی نثر کی مشہور کتاب ہے۔ اس کی تدوین کا کام زور صاحب مکمل نہ کر سکے اور وہ ادھورا ہی رہ گیا۔ تاج الحقائق کے مصنف کے تعلق سے محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض نے اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے اور بعض اسے وجہی کی تصنیف نہیں مانتے۔ ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر زور کو بھی اس بحث میں سخت اختلافات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شاید اس لیے وہ کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچ پائے۔

مثنوی طالب وموہنی:

مثنوی طالب و موہنی کی ترتیب ڈاکٹر زور کی ایک گراں قدر خدمت ہے۔ یہ مثنوی سید محمد والہ موسوی نے 1150ھ میں حیدرآباد میں تصنیف کی۔ اس میں مہاراشٹر کے تاریخی شہر پر پنڈہ کے ایک ہندو مہاجن کی دختر موہنی اور ایک مسلمان نوجوان طالب کے عشق کی المیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اسے 1957 میں ادارۂ ادبیات اردو کے تحت شائع کیا۔ یہ مثنوی صرف ایک مخطوطے کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔ اس میں زور صاحب نے کوئی خلاصہ نہیں لکھا۔ دو اعتبار سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ پہلا یہ کہ مذکورہ مثنوی اس عہد میں تصنیف کی گئی جب دکنی زبان کے زوال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس اعتبار سے یہ اردو کے لسانی ارتقا کی اہم کڑی ہے دوسرا یہ کہ میر کی مشہور مثنوی 'دریائے عشق' کا ماخذ اس مثنوی کو مانا جاتا ہے۔ حالانکہ میر نے کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔

ابراھیم نامہ:

دکنی ادب کی ترتیب میں یہ ڈاکٹر زور کا آخری کارنامہ ہے۔ ابراہیم نامہ بیجاپور کے شاعر عبدل کی مثنوی ہے یہ کتاب 1937 سے 1940 کے درمیان میں ہی ترتیب دی گئی ہے۔ یہ مثنوی 70 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی مقدمہ درج نہیں کیا گیا ہے۔ ابراہیم نامہ کی ادبی لسانی اور تاریخی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اس کا تنقیدی متن مرتب کیا اور اسے ایک مفید مقدمے سے آراستہ کر کے 1969 میں شائع کیا۔ اسی طرح کلیات قلی قطب شاہ کے بعد 'تذکرہ گلزار ابراہیم' بھی مرتب کرنا چاہتے تھے مگر وہ مکمل نہ ہو پایا۔

ڈاکٹر زور نے ان نادر و نایاب مخطوطات کو مرتب کر کے نہ صرف ادبی ذوق رکھنے والے قارئین پر ایک بڑا احسان کیا ہے بلکہ ان مخطوطات کے ذریعے اس عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن اور تاریخ کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ان ادبی ذخیروں کو دنیائے ادب میں متعارف کر کے لافانی کر دیا بلکہ انھیں گراں مایہ خدمات کے ذریعے اردو زبان و ادب کے خدمت گزاروں کی فہرست کی صف اول میں جگہ بنالی جس کے سبب رہتی دنیا تک اردو ادب میں ان کا نام باقی رہے گا۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ کا زمانہ علم و ادب تہذیب و تمدن اور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں گزارا اور آخری دم تک اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ وہ گم نام فنکاروں کو منظر عام پر لے آئے۔ دکن کی مٹتی ہوئی دھندلی سی اور بے ربط تاریخ کو نئے روپ میں ڈھال کر جدید اور ترقی یافتہ صورت میں ایک مکمل تاریخ ملک کے سامنے پیش کر دی جس سے آنے والی نسلوں کے لیے تحقیق کی راہ ہموار ہو گئی اور مواد کا ایسا ذخیرہ مل گیا کہ جس پر اردو والوں کو فخر کرنا چاہیے۔

■

Salahuddin Saha
C/o Samiuddin
A-66, Christian Colony,
Opp Moris Nagar Police Station
Delhi - 110007
Mob.: 7396689934
Email: salluodisha@gmail.com

سید اطہر رضا بلگرامی

معاشی ترقی میں

مادی وغیر مادی عوامل کا تصادم

جس وقت کسی فرد یا ملک کی معاشی ترقی کی جاتی ہے، اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے، تو ہمیشہ مادی وسائل پر ہی توجہ مرکوز رکھی جاتی ہے۔ ہم قومی پیداوار، قومی آمدنی، فی کس آمدنی، معیار صرف، روزگار کی نوعیتیں، انوسٹمنٹ، بچت، قدرتی وسائل کے ذخائر، ملکی و غیر ملکی تجارت، درآمدات و برآمدات، ملک کا انفراسٹرکچر جیسے عوامل کے فروغ سے معاشی ترقی کی شرح کا تعین کرتے ہیں۔ خودکفیل، تیز رو، سست و پست ماندہ معیشتوں کی شناختیں انھیں عوامل کے فروغ کی سطحوں سے کی جاتی ہیں۔

(1)

معاشی ترقی کا مرکز انسان ہے۔ اس لیے اس کی معاشی ترقی کو انھیں مادی عوامل کے ذریعے پہچانا جاتا ہے اور پرکھا جاتا ہے۔ اس کی خوشحال، مطمئن وآسودہ زندگی یا ناآسودہ زندگی کی یہی پہچان بتلائی جاتی ہے کہ وہ کیسے زندگی بسر کر رہا ہے؟ وہ کیا کھا رہا ہے؟ کیسا کھا رہا ہے؟ کیا پہن رہا ہے؟ وہ کیسے گھر میں رہ رہا ہے؟ زندگی کی بنیادی ضرورتوں وآرام وآسائش کی اشیا و خدمات پر کس قدر قدرت رکھتا ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت کیسی ہے؟ وہ کتنے صحت مند ماحول میں زندگی گزار رہا ہے؟ وہ اپنے چاروں طرف پھیلتے ہوئے مواقع سے کس قدر واقف ہے؟ اور ان سے کتنا مستفید ہو رہا ہے؟ اور پھر ان سب کے لیے بنیادی طور پر یہ بھی جاننا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی آمدنی کی سطح کیا ہے؟ گویا ایک انسان کی معاشی ترقی کے یہی عوامل ہیں جن کی بلند و پست سطحیں خوشحال وآسودہ یا ناسودہ زندگی کی پہچان بن جاتی ہیں انھیں کے ذریعے معاشی ترقی کا تعین کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ ان عوامل کے بغیر خوشحال و مطمئن زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مطمئن و آسودہ زندگی تو ایک طرف، انسان کی زندگی کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ کیا غذا، پانی، صاف ستھری ہوا، موسم کی مناسبت سے کپڑا و دیگر لوازمات، پناہ کے لیے سر پر چھت اور دیگر سہولیات کی دستیابی کے بغیر کوئی زندگی کا تصور کرسکتا ہے؟ انھیں عوامل پر قدرت آپ کی خوش حال و مطمئن زندگی کا معیار طے کرتی ہے۔ معاشی زندگی خواہ کسی فرد کی ہو یا ملک کی، انھیں عوامل کے ذریعے پہچانی گئی ہے۔ اس حقیقت کا کوئی منکر نہیں ہوسکتا لیکن معاشی ترقی کی تاریخ جب بہتر سے بہتر معیار زندگی کا ثبوت پیش کرتی ہے وہیں پھیلتی ہوئی غربت و افلاس، بے چینی و انتشار اور تفریق و امتیاز کی تصویریں بھی دکھلاتی ہیں تو پھر ایک معقول فکر انسانی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ جس حقیقت کو اتنا نمایاں کیا جا رہا ہے اور جس پر یقین کامل ہے وہ ایک نامکمل ادھوری حقیقت ہے۔ مزید جتنا اس حقیقت کو مستحکم و ناگزیر ثابت کیا جا رہا ہے اسی قدر وہ اپنی کمزوریوں کو نمایاں کرتی جا رہی ہے۔ اگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی وسائل کے بغیر معاشی ترقی تو کجا انسان کی زندگی ناممکن ہے تو دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ محض مادی وسائل کی بدولت انسان معاشی ترقی کی معراج کو نہیں پاسکتا۔

ترقی کی مادی فکر کی بنیادی کمزوری یہی ہے کہ اس نے ایک کو حقیقت کل سمجھا اور دوسری کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر غور کیجیے تو انسان کو سمجھنے کا یہی ادھوراپن ترقی کے ہمراہ تمام مسائل کے پنپنے اور پھیلنے کی وجہ بنا ہوا ہے۔ مادی ترقی کی چکاچوند میں غیر مادی قوتوں کو لاکھ نظر انداز کیا جائے، دبایا جائے، لیکن ان کو فنا نہیں کیا جاسکتا۔ ان قوتوں کا ادراک انسان کو ہوتا رہتا ہے۔ اگر مادی قوتیں ان کو فطری عمل سمجھ کر ہمدردانہ جذبے کے تحت محض اشک شوئی کے بطور کچھ اقدامات اٹھاتی بھی ہیں تاکہ کمزوریوں پر پردہ پڑا رہے تو ان کے دیرپا مثبت نتائج سامنے نہیں آتے۔ وہ محض وقتی دلاسے اور سہارے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ غریبوں میں مفت یا انتہائی کم قیمت پر راشن مہیا کرکے، مفت یا کم قیمت پر دوا علاج کی سہولتیں دے کر، انتہائی سستے مکان دے کر، مفت تعلیم و وظیفوں کا بندوبست کرکے اور اسی طرح کے دیگر امدادی پروگراموں کے ذریعے انصاف و مساوات کی تبلیغ تو کی جاتی ہے لیکن اس میں جذبے کی صداقت سے زیادہ اشتہاریت کارفرما رہتی ہے اور نتیجتاً مادی فکر کے منفی اثرات پر خاطر خواہ پردہ نہیں پڑتا۔ معاشرہ غربت و افلاس، انتشار و ناآسودگیوں کا شکار بنا رہتا ہے۔

انسان کی شخصیت کا دوسرا پہلو جو غیر مادی عوامل کی قوتوں کا مظہر ہے، احساس کے ذریعے پہچانا جاتا ہے، مادی عوامل کی طرح ناپا تولا نہیں جاسکتا۔ یہ پہلو ہر ذی روح میں موجود ہے، جانوروں میں، پرندوں میں اور انسانوں، سبھی میں کیا خطرے کے وقت جانوروں کے بچوں کو دوڑ کر ماں کی پناہ میں آتے نہیں دیکھا؟ بچے کے زخمی ہو جانے یا کھو جانے پر ماں کی بے چینی اور تڑپ نہیں

دیکھی؟ جو اس کی آنکھوں اور جسم کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتی ہے، بچوں کی چونچ میں دانہ دیتے وقت مامتا کی لہر کا احساس نہیں کیا۔ یہ سب احساسات کی وہ غیر مادی لہریں ہیں جن سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان کو ناپا تولا نہیں جاتا، محسوس کیا جاتا ہے۔ آپ سب کچھ اطمینان قلب کے ساتھ اچھا کر رہے ہوں لیکن اگر کہیں کوئی کوتاہی ہوگئی تو کیا فوری طور پر غلطی کا احساس نہیں ہوتا؟ صدمہ اور تکلیف نہیں پہنچتی؟ اگر پہنچتی ہے تو غیر مادی احساس کی قوت زندہ و روشن ہے۔ اس کوتاہی پر پچھتاوا ہوگا، آپ اس کو درست کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہر شخص کو صحیح غلط، جائز و ناجائز، مناسب و غیر مناسب فیصلوں کا ادراک ہوتا ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ مادی عوامل کی کشش اس احساس کو دبائے رکھے اور ان عوامل سے ملنے والی تسکین پر پردہ ڈالے رکھے لیکن یہ غیر مادی قوتیں زندہ رہتی ہیں اور زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ابھر کر احساس کرا دیتی ہیں کہ کیا غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ان قوتوں کو مادی قوتوں کی کشش کے ہمراہ زندہ رکھنے، ان پر عمل کرنے، اور ان کو اہمیت دیتے رہنے میں ہی متوازن شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ توازنِ قدرت ہے جس سے چشم پوشی تمام مسائل کو جنم دیتی ہے۔

معاشی ترقی کی مادی فکر نے انسان کو محض مادی پیکر میں دیکھا ہے اور تمام تر ضروریات کو پورا کرتے رہنے کے عمل کو ہی ترقی سمجھا ہے۔ اگر انسان اپنی ہر خواہش کو پورا کرنے کی استعداد رکھتا ہے یا اس کی کوشش کرتا رہتا ہے تو اسی جہد پیہم کا نام معاشی ترقی سمجھا گیا ہے۔ اس فکر نے غیر مادی قوتوں کو ایک لاحاصل حقیقت سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ مادی قوتیں غیر مادی قوتوں کے وجود سے انکار تو نہیں کرتیں لیکن ان کے خیال میں مادی قوتوں کی مانند انسان کو مادی تسکین کی بلندیوں پر نہیں لے جاسکتی ہیں۔ معاشی ترقی کا مطلب زیادہ سے زیادہ مادی خواہشات کی تسکین میں پوشیدہ ہے۔ جب تک انسان اس کے لیے سرگرداں رہے گا، وہ معاشی ترقی کی منزلوں کو سر کرتا رہے گا اور جب اس کی یہ جد و جہد سست ہوگی، محتاط ہوگی تو یقیناً اس کی مجموعی معاشی ترقی بھی پست رہے گی۔

(2)

معاشی ترقی کے مادی عوامل کی تمام تر سرگرمیاں انسان کی دو فطری جبلت کے سہارے پروان چڑھ رہی ہیں۔ اوّل، ہر انسان لامتناہی خواہشات رکھتا ہے۔ ایسی لامتناہی کہ زندگی کی آخری سانس تک چلتی رہتی ہیں اور کبھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔ دوم، وہ فطرتاً آزاد ہے۔ ان دو صفات نے اس کو لالچی، خود غرض بھی بنا رکھا ہے۔ ہماری موجودہ مادی معاشی ترقی کی روش جس کو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کہا جاتا ہے انسان کی انھیں دو کمزوریوں کے سہارے پروان چڑھ رہی ہے۔

انسان کی خواہشات پر کوئی پابندی نہیں۔ جیسا، جتنا چاہے پیدا کرے اور خواہشات کی تکمیل کرے۔ پیداوار یوں ہی تو نہیں ہوگی۔ اس کے لیے سرمایہ چاہیے، ٹکنالوجی چاہیے، محنت چاہیے، انفرااسٹرکچر چاہیے، خام مال چاہیے، طریق کار و پلاننگ چاہیے۔ ان سب کے لیے انسان کو مطلب آزاد رکھا گیا ہے۔ انسان نے منظم طور پر ان تمام وسائل پر قدرت حاصل کی اور پیداوار کے ڈھیر لگا دیے تاکہ خواہشات کی تسکین کرتا رہے۔ یہی مادی آسودگی گویا منجملہ معاشی ترقی کا عکس بنی۔

خواہشات کی تسکین صرف پیداوار سے نہیں بلکہ نظامِ تقسیم سے ہوتی ہے۔ آزاد کھلے بازاروں کا نظام آیا۔ ان بازاروں کو مال و اسباب سے بھر دیا گیا جہاں ایک انسان حسب خواہش اور حسب استعداد اشیا و خدمات کو حاصل کر کے اپنی تسکین کرنے لگا۔ ان مال و اسباب میں یکسانیت نہیں رکھی گئی تاکہ انسان کی بدلتی ترجیحات کے مطابق خواہشات کی تسکین ہوتی رہے اور اس کے لیے مسلسل تحقیقات، ٹکنالوجی اور وسائل کے رد و بدل کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ سرمایہ لگایا جاتا رہا اور نئے سے نئے مال و اسباب کے ذریعۂ استعمال کے بدلتے طریق کاروں کے ذریعے ان کو زیادہ پرکشش بنایا جاتا رہا اور بس انسان اپنی خواہشات کے انبوہ کو لے کر ان کے پیچھے بھاگتا رہا جس نے جتنی تسکین حاصل کر لی معاشی ترقی کا وہی پیمانہ بن گئی۔

ابھی بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ابھی خواہشات کو آزادانہ طور پر اور مہمیز کرنا ہے۔ انسان کو اپنے ملک کی معیشت سے نکال کر دوسرے ممالک کی چکاچوند کا حصہ بنانا ہے۔ دنیا کی تمام معیشتوں کو کھلا رکھا گیا تاکہ کھلی تجارت کے ذریعے بیرونی ملازمتوں کے ذریعے، وسائل و ٹکنالوجی کے تبادلے کے ذریعے، بیرونی ریسرچ و انکشافات کے ذریعے انسانی خواہشات کو بھڑکایا بھی جائے اور تسکین کے ذرائع بھی فراہم کیے جائیں اور انسان تسکین کی خاطر مزید جد و جہد میں سرگرداں نظر آئے۔ اسی جہد و پیہم کا نام تو معاشی ترقی ہے۔

معاشی ترقی کی اس روش پر کوئی سوالیہ نشان نہ اٹھتا بشرطیکہ زندگی کے اس رخ پر بھی نگاہ کر لی جاتی کہ کیا گروہ انسانی جسمانی، ذہنی، طبعی، علاقائی، سماجی و معاشرتی اعتبار سے برابر ہیں، اگر نہیں تو کیا یہ تفریقات مختلف صلاحیتوں کا مظہر نہیں ہیں؟ اور پھر کیا انھیں تفریقات کے ساتھ خواہشات کی تسکین کی استعداد مساوی رہ سکتی ہے۔ آپ نے تو اشیا و خدمات کے انبوہ میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا لیکن اس کمزوری سے پردہ پوشی نے تفریق پیدا کر دی۔ معاشرہ امیر و غریب، محروم و صاحب اختیار میں تقسیم ہوتا گیا۔ سسٹم نے تو یہ کہہ کر اپنا پلہ جھاڑ لیا کہ سب کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی پوری آزادی ہے۔ صلاحیتوں کو ابھارنے کے ذرائع فراہم کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کس کا کام ہے کہ دیکھیے کہ صاحب ضرورت اس سے فائدہ اٹھا بھی پا رہا ہے یا نہیں؟ یا آزادی کا فائدہ اٹھا کر صرف وہی مستفید ہو رہے ہیں جو صاحب اختیار ہیں؟ آپ کے پیدا کیے ہوئے مواقع، آپ کی فکر کی تبلیغ کے آلہ کار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

انسان طبعاً خود غرض بھی ہے، مطلب پرست بھی ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے فائدے پر رہتی ہے۔ اب آزادی اور جسمانی و ذہنی تفریق نے خود غرضی کے جذبے کو سب کچھ سمیٹ لینے کا موثر آلہ کار بنایا۔ مصنوعی کمیابی (Artificial Scarcity) ذخیرہ اندوزی، دانستہ قیمتوں کو بڑھا کر منافع خوری کو ترغیب دینا اسی خود غرضیوں کے شاخسانے ہیں جو معاشی اعتبار سے کمزوروں کو اور کمزور، امیروں کو اور امیر بنا رہے ہیں۔ سسٹم نے اس کا احساس کیا ہے۔ امیروں کے لیے کچھ پابندیوں کا اہتمام کیا اور غریبوں کو اسی قدر چھوٹ و رعایت دی ہے لیکن مجموعی اعتبار سے اس کے نمایاں اثرات ہی نظر آتے ہیں۔ آسودگی اور نا آسودگی کی خلیج بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی نظر آ رہی ہے۔

آزادی اور خود غرضی نے تو ایک مقابلے کی فضا پیدا کر دی۔ حسب صلاحیت اور حسب استعداد جو جتنا سمیٹ پا رہا ہے، سمیٹ رہا ہے اور بلند سے بلند تر معیار زندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہ مظاہرے دوسروں کے لیے ترغیب کا باعث ہیں جہاں پھر جائز و ناجائز، مناسب و غیر مناسب احساسات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنے سے بلند کے ہمعصر بن جانے کی دھن میں انسان سرگرداں نظر آتا ہے اور نہ جانے کتنی اخلاقی، معاشرتی برائیوں کو پھیلانے کا سبب بن جاتا ہے۔

آزادی نے وسیع مواقع فراہم کر دیے ہیں اور معاشرہ اس سے پورا فائدہ اٹھا کر بہتر سے بہتر معیار زندگی کا حامل ہوتا جا رہا ہے لیکن آزادی اور فطری ہوس و خود غرضیوں نے معاشرے کو غریب و امیر میں بانٹ بھی

رکھا ہے۔ اس طرز کی معاشی ترقی کے ساتھ معاشی انصاف، مساوات برقرار رکھنا مشکل ہے۔ ہم نے قومی پیداوار، قومی آمدنی، فی شخص آمدنی، بچت وانوسٹمنٹ اور خوشحالی ومطمئن زندگی سے وابستہ تمام اشیا وخدمات کی دستیابی کے اعتبار سے یقیناً بہت ترقی کر لی ہے لیکن پھر دوسری طرف غربت وناآسودگی اور نتیجتاً انتشار و بے چینی کو بھی بڑھا رہے ہیں۔ یہ تنبیہ ہے کہ ہم کو معاشی ترقی کی مادی فکر کی کمزوریوں پر نگاہ رکھنی ہوگی۔

بطور ردعمل ایک دوسرا سسٹم بھی آیا جس کو سوشلسٹ سسٹم کا نام دیا گیا۔ اس سسٹم نے آزادانہ مادی ترقی کے مضر اثرات پر نگاہ رکھی اور انسان کی بے لگام آزادی کو تمام بے انصافیوں اور سماجی تفریقات کا منبع قرار دیا۔ ان برائیوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس نے دوسرا انتہائی قدم اٹھایا۔ اس نے انسان کی آزادی کو ہی سلب کر لیا اور ترقی کے تمام وسائل کو مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیا۔ اب انسان کیا کھائے گا، کیا پہنے گا، کس طرح کے گھروں میں رہے گا؟ کہاں پڑھے گا، خوشحال زندگی کے لوازمات کیا ہوں گے؟ وغیرہ جتنے بھی معاشی زندگی کے پیمانے ہیں، وہ حکومت طے کرے گی۔ انسان کی اپنی انفرادی شخصیت کچھ بھی نہیں۔ وہ سماج کا فرد ہے۔ اس کو سماج کے لیے زندہ رہنا ہے اور سماج کے ہی لیے مرنا ہے۔ اس کی نجی دولت، پراپرٹی اور وسائل کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ بھی ہے سب حکومت کا ہے۔

یقیناً کوئی بھوکا نہیں، کوئی ننگا نہیں، کوئی بے گھر نہیں اور کوئی بے تعلیم نہیں۔ ہنر اور قابلیت کے مطابق سب کو کام دستیاب ہے۔ کیا پیدا کر رہے ہو؟ اس پر پیدا کرنے والے کا اختیار نہیں، حکومت کا اختیار ہے۔ اس پیداوار کو آپ اپنی مرضی کے مطابق نہیں حکومت کی مرضی کے مطابق فروخت کریں گے اور حکومت طے کرے گی کہ اس میں آپ کا کتنا حصہ ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ حکومت کے زیرنگر ہے۔ مساوات کی ایک اچھی تصویر ابھر کر سامنے آئی جو سرمایہ دارانہ نظام کی بڑھتی برائیوں کے سامنے پیش کی گئی۔ ابتدا میں بڑی پرکشش نظر آئی۔ بازاروں میں انتخاب کے محدود دائروں میں دستیاب اشیا نے عوام کو بظاہر ایک جیسا بنا دیا۔ نہ کوئی ننگا بھوکا فقیر اور نہ کوئی عیش وعشرت میں ڈوبا امیر۔

یہ پرکشش دور زیادہ پرکشش نہیں رہا۔ انسان کو گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے اپنی انفرادیت کو فنا ہونے میں ظلم کا احساس کیا۔ انسان سماج کے لیے ہے، وہ سماج ہی میں پلتا بڑھتا ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ تم کچھ بھی نہیں تو یہ اس کو قبول نہیں۔ یہاں اس کی فطری آزادی پر ضرب لگتی ہے۔ اس کی انفرادی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ یہ ظلم وہ زیادہ دنوں تک سہہ نہیں سکتا۔ مزید دنیا کے دیگر ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت آزادانہ مادی ترقی سے فیضیاب ہو رہے تھے، ان کی طرز زندگی، عیش وعشرت بھی ان کے سامنے تھی۔ نتیجتاً بطور ردعمل وہ اپنے آپ کو سماج کا کارآمد رکن سے زیادہ حکومت کا غلام سمجھنے لگے۔

یہ ردعمل فطری تھا کیونکہ مساوات کی خاطر اس سسٹم نے انسان کے فطری آزادی کے جذبے کا ہی گلا گھونٹ دیا۔ اس کو آزادی زیادہ قیمتی لگنے لگی۔ احتجاج و بغاوت کا بازار گرم ہوا اور دھیرے دھیرے یہ سسٹم اپنی کشش کھوتا گیا۔ آج صرف نظریے باقی ہیں، اس سسٹم کے تحت چلنے والا اب کوئی ملک نہیں ہے اور جو ہیں بھی وہ کھلی معیشتوں کے زیادہ قریب ہے۔

(3)

مادی معاشی ترقی انسانی معاشرہ کو ایک مثالی معاشرہ میں تبدیلی کرنے میں ناکامیاب رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ کھلی معاشی ترقی نے مادی اعتبار سے بلندیوں کو سر کیا ہے۔ آپ انسان کے رہن سہن، اشیا و خدمات کی گوناگوں بڑھتی ہوئی دستیابیاں، انسانی صلاحیتوں میں روزافزوں فروغ اور انسان کے آزادانہ مستفید ہونے کی روش نے یہ تو ثابت کر دیا کہ معاشی ترقی کا مفہوم مادی دائرے میں ہی واضح کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بڑھتی ہوئی بے چینی و انتشار کیوں ہے؟ غریب ممالک کو چھوڑیے، امیر ممالک بھی اپنے یہاں سے غریب و افلاس کو کیوں نہیں دور کر سکے؟ ہر ملک میں سماجی تفریق کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟ اور نتیجتاً لوٹ کھسوٹ اور کرائم کیوں پھیلتے جا رہے ہیں۔ سسٹم یہ کہہ کر پلہ نہیں جھاڑ سکتا کہ ہم نے سب کے لیے مواقع فراہم کیے اور پوری آزادی دی ہے کہ حسب استعداد فائدہ اٹھا کر ترقی کے دھارے میں شامل ہو جائیں لیکن یہ کھلی غفلت ہے جس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ اس کے جواب میں دوسرے سسٹم نے انسان کی آزادی کو ہی سلب کر لیا اور نتیجتاً احساس غلامی کو ہوا دی۔ اس طرح اگر غور کیجیے تو دونوں سسٹم نے انسان کی متوازی قوتوں میں ڈھلی شخصیت کو نظرانداز کیا اور ظاہرہ ترقی کے باوجود مساوات پر مبنی پرسکون معاشی ترقی سے محروم رہے۔

انسان کا وجود مادّی و غیرمادی عوامل کا مرکب ہے۔ وہ فطرتاً لامتناہی خواہشات بھی رکھتا ہے اور آزاد بھی رہنا چاہتا ہے۔ چونکہ جسمانی، ذہنی، علاقائی، معاشرتی، نفسیاتی اور مزاجی اعتبار سے انسان برابر نہیں ہیں اس لیے ان قوتوں میں اتحاد کی جگہ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں کی پرواہ کیے بغیر اپنے لیے سب کچھ سمیٹ لینے کی لالچ اور سے اور کی ہوس، طاقت و اختیارات بڑھاتے رہنے کا رجحان اسی آزادی اور خودغرضی کا شاخسانہ ہے۔ ترقی کی مادی فکر نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا اور ان کو اپنی فکر کے فروغ کا موثر ذریعہ بھی بنایا۔ نتیجتاً معاشرہ کو ترقی کے ہمراہ انتشار سے نہ بچا سکا۔ غیر مادی قوتیں ہی اس بے لگام آزادی، خودغرضی اور لالچ جیسے جذبوں پر انکش لگاتی ہیں بشرطیکہ ان کو سمجھا جائے، ان کو اہمیت دی جائے۔ ایک معقول و معتدل انسان وہی ہو سکتا ہے جو ان دونوں قوتوں کو اہمیت دیتا ہو۔ ایسے ہی متوازن انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔

کچھ منطقی دلائل ہیں جن کی اگر وضاحت کی جائے تو غیرمادّی عوامل کی اہمیت اور ان کی کارکردگی واضح ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس مادّی دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے تمام عوامل، زمین، اس کی نمو، پانی، تمازت، جنگل، نباتات، زمین کے اندر پوشیدہ خزانہ، سمندر کی دولت، بدلتے موسم سب انسانی کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں۔ قدرت کے عطیات ہیں۔ ان کو بنانے والا، ان میں مختلف صلاحیتوں کے معیار طے کرنے وال ایک پوشیدہ، ان دیکھی سب سے عظیم طاقت ہے۔ انسان اُن کا خالق نہیں ہے۔ ہاں، جس نے خلق کیا ہے، انسان کی فلاح و بہبود کے لیے خلق کیا ہے۔ اب اگر انسان اپنی ذہنی کاوش، محنت اور مسلسل غور وخوض کے ذریعے قدرت کے ان عطیات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کوئی شے پیدا کرتا ہے تو اس کی حیثیت خالق کی نہیں، بلکہ خلق کی ہوئی۔ اشیا کے سہارے کوئی دوسری شے پیدا کرنے والے کی ہوگی۔ ہم اپنی محنت، کاوش، جستجو کا صلہ پانے کے حقدار ضرور ہیں لیکن ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اصلی مالک تو وہی ہے جس نے تمام اسباب خلق کیے ہیں۔

اگر انسان اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے تو اس کی بے لگام دعوے داری پر روک لگ جائے گی۔ جب انسان سمجھتا ہے کہ ہمارا دماغ جس کو ہم نے نہیں بنایا ہمارے ہر کارہائے نمایاں کا مرکز ہے اور جس کی اہلیتوں کو مکمل طور پر آج بھی نہیں سمجھا جا سکا ہے تو پھر ہم کیوں اور کیسے ہر سطح، ہر موقع پر ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کائنات کے ہر ذرّہ کو انسان اپنی محنت و جستجو سے اپنی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنا سکتا ہے لیکن اس احساس

کے ساتھ کہ اس کا اصلی خالق کوئی اور ہے، اس نے ہم کو مستفید ہوتے رہنے کی مکمل آزادی دی ہے۔ اگر انسان نے یہ نکتہ ذہن نشین کرلیا تو ملکیت کا جذبہ نہیں ابھر پائے گا اور تمام بنی نوع انسانی کسی عظیم طاقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر آجائیں گے۔ اسلام میں توحید کا یہی تصور ہے جو ذاتی ملکیت اور اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

چلیے ہم تھوڑی دیر کے لیے آپ کی تمام ذہنی و جسمانی کاوشوں کا احترام کرتے ہوئے کسی شے کا خالق مان لیتے ہیں اور چلیے یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ہماری کاوشوں نے ہی ذہنی صلاحیتوں کو پہنچایا ہے تو ہم اس کا فائدہ اٹھا کر اگر کوئی شے بناتے ہیں تو ملکیت ہماری ہوئی۔ اگر ملکیت آپ کی ہے جس کو آپ اپنی کاوشوں کا انعام سمجھ رہے ہیں، تو پیداوار کے ٹارگیٹ پر قدرت کا ثبوت دیجیے۔ قدرتی آفات سے پیداوار کو محفوظ رکھنے کا مظاہرہ کیجیے۔ زمین کے پوشیدہ خزانوں کو بڑھا گھٹا لیجیے۔ جنگلات وسمندری دولت کو بڑھا لیجیے۔ جو بڑھائیں گے، وہ آپ کی نافہمی کا ثبوت ہوگی، قدرت کے دیے ہوئے حجم میں اضافہ کا نہیں۔ ذرا موسم اور آب وہوا کے بدلتے ہوئے نظام پر اور اچانک تبدیلیوں پر قدرت حاصل کرکے دکھلایئے۔ ذرا غور کیجیے آپ پیداوار، نقل وحمل، نظام تقسیم، تجارت کہاں، کہاں آپ آزادا وخود مختار ہیں اور کس سطح تک ہیں؟ آپ نظام قدرت کے محتاج ہیں، مختار نہیں کہ جو جس طرح کے اقتصادی فیصلہ کرنا چاہیں، آزادانہ کرتے رہیں اور مستفید ہوتے رہیں۔ جب آپ کو اپنی موت وزندگی اور درازی عمر پر قدرت نہیں تو دیگر فیصلوں پر کتنا اور کیسے یقین کرسکتے ہیں۔

آج تمام ممالک کو اس کا احساس ہو چکا ہے کہ نظام قدرت میں اپنی خودغرضیوں کے تحت بے جا مداخلت کی گئی ہے اور انتہائی خطرناک نتائج میں پوری معیشتوں کو جھونک دیا گیا ہے۔ زلزلے، سونامی، سیلاب، برفانی طوفان، شدید بارش یا بارش کی محتاجی کے نتیجے میں عظیم خشک سالی نے پیداوار، تقسیم، تجارت، اشیا وخدمات کی ترسیل کے نظام کو بگاڑا ہے اور توازن سے زیادہ عدم توازن پیدا کیا ہے۔ ہم نے آزادی وخودغرضی میں ڈوب کر معقول ومعتبر ترقی کے بجائے انتہائی غیر معتبر ترقی کی روش کو پنایا ہے۔

اگر قدرت نے اپنے نظام میں ایک توازنی سسٹم کو قائم رکھا ہے تو انسان جو اسی کائنات کا جز ہے اس میں بھی اسی توازن کو قائم کیا ہے۔ اس نے اگر ایک طرف مادّی عوامل کی قوتوں کے ذریعے انسانی زندگی کے وجود کو برحق کیا، آزادی کا جذبے پیدا کرکے تمام کائناتی عوامل سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا، آزادی میں پوشیدہ خودغرضی کے جذبہ کے مضر اثرات کا تجربہ کرایا محتاط رہنے کا سبق دیا تو دوسری طرف کچھ غیر مادی قوتوں کی نگہبانی بھی رکھی تاکہ جذبہ آزادی کی سرکشی اقتصادی ومعاشرتی توازن کو بگاڑنے نہ پائے۔ ہم نے جس طرح نظام قدرت میں اپنی خودغرضیوں کے تحت بے جا مداخلت کرکے توازن کو بگاڑا اور اس کے برے نتائج میں بنی نوع انسان کو جھونک دیا، اسی طرح غیر مادی قوتوں کی اہمیت اور ان کی کارکردگی کو نظر انداز کرکے، معاشی ترقی کے منصفانہ نظام کو بگاڑا اور نتیجتاً وبلند وبالا مادی معاشی ترقی کے ہمراہ پنپتی اور پھیلتی غربت، ناآسودگی، انتشار اور بے انصافیوں سے معاشرہ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

اگر کسی کام کی انجام دہی میں غلط وصحیح کا احساس رہتا ہے، آپ کا ضمیر مطمئن رہتا ہے یا احساس گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، ایک پچھتاوے کا احساس ہوتا ہے یا قلبی سکون کا تو جان لیجیے یہ غیر مادی قوتیں زندہ ہیں، فعال ہیں۔ آپ کے کاموں کی نگہداشت کررہی ہیں، آگاہ کررہی ہیں تاکہ پرسکون متوازی زندگی برقرار رہے لیکن جس وقت مادی عوامل کی کشش حاوی ہوکر ان غیر مادی قوتوں کو دبا دیتی ہیں، بے اثر کردیتی ہیں تو پھر انسان کی بے لگام آزادی، خودغرضی، طمع وحرص سب عود کر آتی ہیں اور پھر وہ صرف اپنی شخصیت کو بنانے سنوارنے پر مرکوز ہوجاتا ہے۔ عصر حاضر کی مادی معاشی ترقی کا المیہ یہی ہے کہ اس نے ان قوتوں کی اہمیت کو نظر انداز کیا ہے اور مادی عوامل کو ہی ترقی کا مرکز قرار دیا ہے۔ مادی کشش نے ایسا پردہ حائل کردیا ہے کہ غیر مادّی قوتوں کے وجود کو لاحاصل حقیقت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس کا انجام سامنے ہے۔ ہم معاشرے میں مادی اعتبار سے سب کچھ حاصل کرلینے کے باوجود غربت، بے انصافیوں، بداعتمادیوں اور نتیجتاً تفرقہ اور انتشار سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکے، انصاف ومساوات کو نہیں پا سکے۔

اس کوتاہی کا احساس ہو چکا ہے۔ آج تمام ترقیاتی سرگرمیوں میں محض عوامل پر نہیں انسان پر نگاہ مرکوز ہے۔ آج انسان کو ترقی کا مرکز تسلیم کرکے تمام عوامل کو اس کے گرد پھیلایا جارہا ہے تاکہ ہر فرد مواقع کو پہچان سکے اور حسب اہلیت انتخاب کرکے ترقی کی دوڑ میں شامل ہوسکے۔ پھر اس کا بھی لحاظ رکھا جارہا ہے کہ معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کو ہر طرح کی سہولت وامداد پہنچائی جاتی رہیں تاکہ نامحرومیوں کی خلیج بڑھنے نہ پائے۔ اس کا بھی لحاظ رکھا گیا کہ صاحب حیثیت وصاحب اختیار کو کمزوروں کے مقابلہ زیادہ زیر بار رکھا جائے۔ ان کو زیادہ پابند بنایا جائے اور غریبوں کو اسی قدر بغیر کسی بوجھ کے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس طرح کے تمام اقدامات مستحسن ہیں جو ایک طرف امیری کی سرکشی کو دباتے ہیں اور انسانیت کو ابھارتے ہیں۔ اگر غریبوں کی غربت کا احساس جاگا ہے، ناانصافیاں، وعدم مساوات کا احساس ہوا ہے اور اس کی وجہ صاحب اختیار طبقہ کی بے جا، بے لگام آزادی و خودغرضی سمجھی گئی ہے تو کیا یہ غیر مادّی قوتوں کی تنبیہ نہیں ہے۔ ان کا سرگرم عمل ہونا نہیں ہے۔ یہ قوتیں لاکھ نظر انداز کی جاتی رہیں، لاکھ دبائی جاتی رہیں، کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ یہ ناانصافیوں کی فضا میں جاگتی ہیں ابھرتی ہیں اور معاشرہ کو توازن کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ قانون قدرت کا فطری عمل ہے جو عدم توازن میں توازن پیدا کرتا ہے۔

اختتامیہ

اگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مادّی عوامل کے بغیر نہ زندگی کا وجود ممکن ہے اور نہ اس کا فروغ تو یہ بھی ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ غیر مادی عوامل کی اہمیت کا احساس کیے بغیر ایک متوازن، پرسکون، پروقار زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک متوازن تیز رو معاشی ترقی کے لیے دونوں عوامل کی کارکردگیوں پر توجہ دینی ہوگی۔ بہ صورت دیگر غیر متوازی کیفیتوں کا پیدا ہونا فطری ہے۔ صرف مادی فلاح وبہبود پر نظر رکھنا موجودہ پھیلتی بے اطمینانی اور بے اعتمادی کا سبب ہوگا اور ظاہرہ ترقی کے پس پردہ ایسی منفی قوتوں کو تقویت ملتی رہے گی۔ دوسری طرف صرف غیر مادّی قوتوں پر توجہ دینا بھی غیر فطری اور غیر معقول عمل ہوگا۔ ایسی فکر راہبیت وسادھویت کا معاشرہ تو پیدا کرسکتی ہے، لیکن معتدل، متوازن سماج نہیں دے سکتی۔ دونوں طرح کی انتہاپسندی قدرتی توازن کے منافی ہے۔ اس کا نتیجہ میرے پیش نظر ہے۔ ہم نے مادی عوامل کی ترقی پر معاشی ترقی کا انحصار کیا تو اس کے مضر اثرات نے سبق دیا اور ہم پلٹ کر انسانی فلاح کی بات کرنے لگے، انسان مرکز بنانے لگے۔ یہ ایک فطری ردعمل ہے جو ذہن انسانی کو انتہاپسندی سے نجات دیتا رہے گا۔

■

S.A. R. Bilgrami
B-40, Johrai Farm, Noor Nagar Ext
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob:9891425690
E-mail.: atharb40@gmail.com

گرافکس
(Graphics)

ٹیکسٹ باکس بنانا (Creating Text Boxes)

تصویر WD-5.26: ٹیکسٹ باکس

آپ ایم ایس- ورڈ میں اپنی دستاویز یا تصویروں پر ایسے باکس بنا سکتے ہیں، جن میں کوئی ٹیکسٹ آزادانہ طور پر بھرا گیا ہو۔ ٹیکسٹ باکس بنانے کے لیے 'Insert' ٹیب کے Text حصہ میں 'Text Box' بٹن کو کلک کیجیے۔ اپنے من پسند ٹیکسٹ باکس پر کلک کیجیے۔ ٹیکسٹ باکس فوراً آپ کی دستاویز میں جڑ جائے گا۔ Draw Text Box ہدایت دینے پر آپ کا ماؤس پوائنٹر ایک پتلے اور بڑے جمع نشان (+) میں بدل جائے گا۔ آپ اسے دستاویز میں کسی بھی جگہ لے جا کر ماؤس بٹن کو دبا کر پکڑ لیجیے اور جس طرح مستطیل (Rectangle) بنایا جاتا ہے، اسی طرح ماؤس پوائنٹر کو کھینچتے ہوئے من پسند سائز کا باکس بنا لیجیے۔ یہ باکس شروع میں موٹی سایہ دار باؤنڈری سے بنا نظر آتا ہے اور اس میں چاروں طرف ہینڈل بھی ہوتے ہیں، جن کی مدد سے آپ اس کا سائز بدل سکتے ہیں اور اسے سرکا سکتے ہیں۔

ٹیکسٹ باکس بن جانے پر نقطہ شمول (Insertion Point) پہلے سے ہی اس میں ہوگا۔ اب آپ اپنا ٹیکسٹ ٹائپ کرنا شروع کر سکتے ہیں، جو ٹیکسٹ باکس میں بھر جائے گا۔ کسی ٹیکسٹ باکس میں بھرے ٹیکسٹ کو آپ ایم ایس- ورڈ کی سبھی خصوصیات کے ساتھ خواہش کے مطابق فارمیٹ کر سکتے ہیں۔ تصویر WD-5.26 میں ٹیکسٹ باکس دکھایا گیا ہے، جس میں ایک بلیٹ لسٹ بھری گئی ہے۔

ٹیکسٹ باکس ٹولس کا فارمیٹ ٹیب (Format Tab of Text Box Tools)

تصویر WD-5.27: ٹیکسٹ باکس ٹولس کے تحت فارمیٹ ٹیب

دستاویز میں ٹیکسٹ باکس جڑتے ہی ربن میں Text Box Tools عنوان کے تحت فارمیٹ ٹیب (تصویر WD-5.27) جڑ جاتا ہے، جو Drawing Tools، Picture Tools، Clipart Tools وغیرہ کے فارمیٹ ٹیب سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے زیادہ تر حصے، جیسے Text Box Styles، Shadow Effects، 3-D Effects، Arrange اور Size بقیہ Tools کے فارمیٹ ٹیب کے حصوں کی طرح ہیں، جن کے بارے میں ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔

Text Box Tools کے فارمیٹ ٹیب میں صرف Text حصہ دستیاب ہے، جس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

(i) **ٹیکسٹ باکس جوڑنا (Draw Text Box)**: اگر آپ ایک آسان چوکور ٹیکسٹ باکس اپنی دستاویز میں جوڑنا چاہتے ہیں، تو صرف Text Box Tools کے فارمیٹ حصہ میں Darw Text Box بٹن پر کلک کریں۔ نقطہ شمول کی جگہ پر ایک ٹیکسٹ باکس فوراً جڑ جائے گا۔ آپ اس بٹن کی مدد سے ایک ٹیکسٹ باکس میں دوسرا ٹیکسٹ باکس بھی جوڑ سکتے ہیں۔

(ii) **ٹیکسٹ کی سمت کا انتخاب کرنا (Text Direction)**: Draw Text Box بٹن کے بغل میں دیے گئے Text Direction بٹن کی مدد سے آپ ٹیکسٹ باکس میں دیے جانے والے ٹیکسٹ کی سمت بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس بٹن پر کلک کرنے سے اس پر دیے گئے تیر کے (⇨) گھڑی کی سوئی کی سمت (Clockwise) میں گھومتے ہیں، جس سے آپ کو ٹیکسٹ کی سمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

(iii) **دو ٹیکسٹ باکسوں کو آپس میں جوڑنا (Create Link)**: مان لیجیے، آپ نے دستاویز میں دو ٹیکسٹ باکس جوڑے ہیں، آپ چاہتے ہیں کہ دونوں ٹیکسٹ باکس آپس میں جڑ جائیں، یعنی ٹیکسٹ ٹائپ کرتے وقت جب پہلے ٹیکسٹ باکس میں جگہ نہ بچے، تو ٹیکسٹ خود ہی دوسرے ٹیکسٹ باکس میں سیٹ ہو جائے۔ یہ کام آپ Text Direction بٹن کے نیچے دیے گئے Create Link بٹن سے آسانی سے کر سکتے ہیں۔

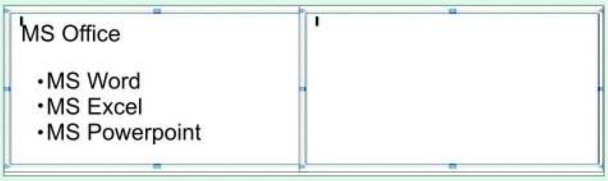

تصویر WD-5.28: دو ٹیکسٹ کو آپس میں جوڑنا

اس کے لیے آپ سب سے پہلے ٹیکسٹ باکس میں کلک کیجیے۔ اب Create Link بٹن کو کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کا ماؤس پوائنٹر ٹیکسٹ سے بھرے کپ میں بدل گیا ہے۔ اب آپ دوسرے ٹیکسٹ باکس میں (جسے آپ پہلے ٹیکس باکس سے جوڑنا چاہتے ہیں) کلک کر دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے ہی آپ ٹیکسٹ کے کپ کو دوسرے ٹیکسٹ باکس میں لے کر جائیں گے، تو وہ کپ ٹیڑھا ہو جائے گا، گویا آپ ٹیکسٹ کو کپ میں بھر کر دوسرے ٹیکسٹ باکس میں انڈیل رہے ہوں۔

(iv) **ٹیکسٹ باکسوں کے بیچ تعلق توڑنا (Break Link)**: Break Link بٹن کے ذریعے آپ دو جڑے ہوئے ٹیکسٹ باکسوں کا تعلق توڑ سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے پورا ٹیکسٹ چنے ہوئے باکس میں (جس میں ماؤس کرسر ہو) سیٹ ہو جائے گا۔

ٹیکسٹ باکسوں سے جڑے دیگر کاموں، جیسے رنگ بھرنا، رنگ اور فونٹ بدلنا، شیڈ بدلنا، سہ رخی شکلیں بنانا وغیرہ کے لیے Text Box Tools کے فارمیٹ ٹیب کے دیگر حصوں کا استعمال کریں، جو دیگر Tools کے فارمیٹ ٹیب کے حصوں کی طرح ہیں۔

کوئک پارٹس (Quick parts)

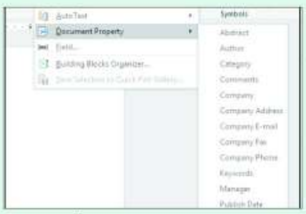

تصویر WD-5.29: کوئک پارٹس

اس بٹن کا استعمال زیادہ نہیں کیا جاتا ہے۔ Insert ٹیب کے Text حصہ میں دیے گئے Quick Parts نامی بٹن کی مدد سے آپ اپنی ستاویز میں فوراً ٹیکسٹ کے ٹکڑے، جیسے سرخی، مصنف کا نام، حوالہ، خصوصی تبصرہ، کمپنی کا نام، کمپنی کا پتہ وغیرہ جوڑ سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں زیادہ جاننے کے لیے ایم ایس- ورڈ کی Help سہولت کی مدد لیں۔

ورڈ آرٹ (Word Art)

ایم ایس- ورڈ میں آپ لفظوں کو فنکارانہ طریقے سے کئی رنگوں میں بھی بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ورڈ آرٹ گیلری کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس گیلری میں کوئی اسٹائل

چننے کے لیے 'Insert' ٹیب کے Text حصہ میں Word Art کے تیر کے بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے آپ کو تصویر WD-5.30 کی طرح ورڈ آرٹ گیلری کا مینو دیا جائے گا۔

تصویر WD-5.30: ورڈ آرٹ گیلری

آپ اس گیلری میں سے اپنی پسند کی اسٹائل اسے کلک کرکے چن سکتے ہیں۔ چن کر 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے گیلری کا ڈائیلاگ باکس غائب ہوکر 'Edit Word Art Text' ڈائیلاگ باکس تصویر WD-.531 کی طرح دیا جائے گا۔

تصویر WD-5.31: ورڈ آرٹ میں ٹیکسٹ کو ایڈٹ کرنا

اس ڈائیلاگ باکس میں آپ اپنی پسند کے فونٹ، سائز اور اسٹائل میں کوئی بھی ٹیکسٹ بھر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس ہندی کے فونٹ ہوں، تو ان میں بھی ٹیکسٹ بھر سکتے ہیں۔ ٹیکسٹ بھرنے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے وہ لفظ آپ کے ذریعے چنے ہوئے اسٹائل تصویر WD-5.32 کی طرح آپ کی دستاویز میں جڑ جائیں گے۔

تصویر WD-5.32: ورڈ آرٹ میں بھرا ہوا ٹیکسٹ

شروع میں یہ آرٹ چاروں طرف سے ہینڈلوں سے گھرا ہوگا۔ آپ ان ہینڈلوں کا استعمال کرکے اس کو کسی عام تصویر (Graphics) یا آبجیکٹ کی طرح چھوٹا بڑا کر سکتے ہیں اور کھینچ لے جاکر کہیں بھی لگا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کے رنگوں سے مطمئن نہیں ہیں تو ورڈ آرٹ کے ٹول بار میں 'Format Word Art' بٹن کو کلک کرکے اپنی پسند کے رنگوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ ورڈ آرٹ آپ ایک یا دو رنگوں میں بنا سکتے ہیں۔

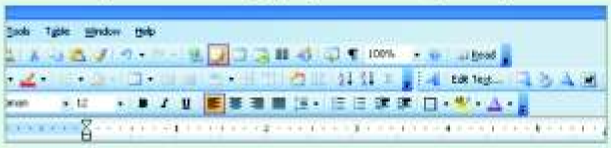

تصویر WD-5.33: ورڈ آرٹ ٹولس کے تحت فارمیٹ ٹیب میں ضروری بٹن

جب بھی آپ ورڈ آرٹ کا استعمال کرتے ہیں، ربن کے اخیر میں Word Art Tools عنوان کے تحت فارمیٹ ٹیب جڑ جاتا ہے۔ اس میں ورڈ آرٹ سے متعلق سبھی ضروری بٹن موجود ہیں، جن کا مناسب استعمال کرکے آپ ورڈ آرٹ کا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ڈراپ کیپ (Drop Cap)

آپ نے اخبارات و رسائل میں دیکھا ہوگا کہ متن (ٹیکسٹ) کو دیدہ زیب بنانے کے لیے کسی مضمون کا پہلا حرف بڑا کردیتے ہیں۔ آپ وہی انداز اپنے ایم ایس۔ورڈ کی دستاویز میں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے لیے آپ سب سے پہلے پورے ٹیکسٹ کو یا اس کے پہلے پیراگراف کو چن لیں۔ اب 'Insert' ٹیب کے Text حصہ میں Drop Cap بٹن پر کلک کریں۔ اس سے نیچے کی طرف ایک مینو کھلے گا، جس میں سے آپ Drop Cap کا من چاہا اسٹائل چن سکتے ہیں۔ آپشن چننے سے حرف بڑا ہوکر پہلی کچھ لائنوں میں ایڈجسٹ (Drop) ہوجائے گا۔ In Margin چننے پر حرف بائیں طرف حاشیہ میں اور پوری دستاویز کا ٹیکسٹ دائیں طرف حاشیہ کے باہر سیٹ ہوجائے گا۔

Generally, women are considered to be poor drivers. Be it any city or country, women drivers are feared by everyone. But do you know that there are two people who hold the record for being the worst drivers of the world? The first out of these two is a 75 years old man who received as many as ten traffic tickets, drove on the wrong side of the road four times, committed four hit -and- run offences, and caused six accidents, all within twenty minutes on October 15, 1966. The second one is a 62 year-old woman, who failed her driving test 40 times before eventually passing it in August, 1970. But the irony is that by that time, she had spent over seven hundred dollars in lessons, and could no longer afford to buy a car.

Drop Cap Options کلک کرنے پر Drop Cap ڈائیلاگ باکس (تصویر WD-5.35) کھلتا ہے، جس کے ذریعے آپ Dropped یا In Margin آپشن چن کر بڑے حرف کا فونٹ بھی چن سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، Lines to Drop اسپن کنٹرول باکس کے ذریعے آپ یہ بھی طے کر سکتے ہیں کہ حرف بڑا ہوکر کتنی لائنوں میں ایڈجسٹ ہوگا۔ Distance from text: اسپن کنٹرول باکس سے آپ بڑے حرف اور ٹیکسٹ کے درمیان کی دوری متعین کر سکتے ہیں۔

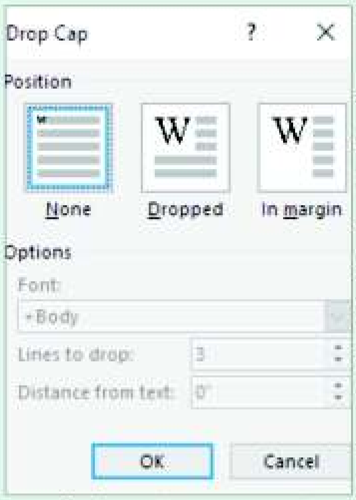

تصویر WD-5.35: ڈراپ کیپ ڈائیلاگ باکس

جب آپ مطمئن ہوجائیں، تو OK بٹن پر کلک کریں۔

اگر آپ Drop Cap کا استعمال ختم کرنا چاہیں، تو ٹیکسٹ کو چن کر Drop Cap مینو میں None کی ہدایت دیں۔

ورڈ میں تصویر، شکل اور خوبصورت حروف سے متعلق متعدد خصوصیات ہیں، جن میں سے زیادہ تر کا ذکر ہم کر چکے ہیں، لیکن سبھی کے بارے میں تفصیل سے سمجھانا یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ ہیلپ آپشن کی مدد لے سکتے ہیں۔

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

درس بلاغت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
صفحات: 230، قیمت: 85 روپے، چھٹی طباعت: 2019
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر اقرا اسبحان، A-10، ہلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس بات سے ہم بھی واقف ہیں کہ اردو تنقید میں ایک وہ زمانہ بھی آیا جب کلام میں لفظی ومعنوی خوبیوں کے تمام وسائل معیوب ٹھہرے۔ اگر بعض وسائل پر توجہ دی بھی گئی تو اپنی شرطوں پر۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سے ہمارا نظام بلاغت تقریباً دور ہوتا گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا مغرب کی تقلید کے باعث ہوا۔ یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا مغربی ادبی اظہار کے تمام ممکنہ طریقے نظام بلاغت یا بلاغت کے تصور سے عاری تھے؟۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے جن بزرگوں نے مغرب سے استفادے پر زور دیا، اور مغربی معیاروں کو اچھا جان کر اس کی روشنی میں اپنے ادبی سرمایے کو چھانا، ان میں سے اکثر وہ تھے جو مغرب کے نظام بلاغت یا تصور بلاغت سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہی نہیں تھے۔ ان کے سامنے چند کتابیں تھیں جو ان کے نزدیک اعلیٰ اخلاقیات کی حامل تھیں اور انھی کو مغرب کی کل کائنات سمجھ لیا گیا۔ سادگی، اصلیت، جوش اور نیچر پر اس قدر زور دیا گیا کہ یہ خیال عام ہو چلا کہ صنائع بدائع کی کوئی اہمیت نہیں اور علم عروض شعر کے لیے بالکل ضروری نہیں کیونکہ شاعر وہبی ہوتا ہے۔ نتیجتاً ہم مشرقی معیاروں سے دور ہوتے گئے اور جب کبھی توجہ کی تو وہ اتنے مشکل نظر آئے کہ بے زاری اور بڑھ گئی۔ بعض صنعتیں جن سے ہمارا کلاسکی شعری معاشرہ پہلی سماعت یا قرأت میں ہی واقف ہو جاتا تھا، آج ہمیں وہ کتابوں سے رٹنی پڑتی ہیں۔ اس منظرنامے پر غور کیا جائے تو زیر تبصرہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ کیوں ہے اور اس کا اختصاص کیا ہے، اس پر آگے بات کی جائے گی، لیکن اس سے پہلے چند باتیں اور...

یہ بات مسلمہ ہے کہ ادبی اظہار کے تمام طریقوں کا انحصار لفظ ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ادبی طریق اظہار لفظ پر منحصر ہونے کی وجہ سے زبان پر بھی ان کا انحصار ہے۔ لہٰذا جب تک زبان کے عمل کا مطالعہ نہ کیا جائے ادبی مطالعہ نہ تو مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی معنی خیز بلکہ ایسا ادبی مطالعہ کارآمد ہی نہیں ہوتا جس میں زبان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ زبان کے مطالعے کی اساس بعض تصورات پر مبنی ہے جن میں ایک تصور بلاغت کا بھی ہے۔ بلاغت اس صورت حال کو کہتے ہیں جو زبان کو حسن وخوبی کے ساتھ استعمال کرنے پر متشکل ہوتی ہے۔ یہ شکل بھی ایک طرح سے تصوراتی ہوتی ہے۔ یعنی اس کلام کو بلیغ کہا جائے گا جو بامعنی ہو، مرتبۂ کمال کو پہنچا ہوا ہو اور مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ بلاغت کے تصور کو حاصل کرنے کے لیے چار علوم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یعنی ان چار علوم کی روشنی میں کوئی کلام خوبصورت ہو تو ایسے کلام کو کلام بلیغ کہا جائے گا اور وہ بلاغت کے تصور کے عین مطابق ہوگا۔ یہ چاروں علوم حسب ذیل ہیں:

1۔علم بیان/علم ادب/علم کتابت (استعارہ، تشبیہ، کنایہ، مجاز مرسل) 2۔علم بدیع (صنائع لفظی وصنائع معنوی) 3۔علم عروض 4۔علم قافیہ

مندرجہ بالا علوم میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو باریک اور مفصل مطالعے کا تقاضا نہ کرتا ہو۔ ان میں علم عروض اور علم قافیہ یقیناً مشکل ترین ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان مشکل ترین علوم کو بڑی حد تک آسان کر کے سمجھایا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اپنے موضوع پر یہ کوئی پہلی کتاب ہے۔ اس سے پہلے بھی اس موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں بحرالفصاحت، تسہیل البلاغت، آئینۂ بلاغت، نسیم البلاغت کے علاوہ اور بھی کتابیں موجود ہیں۔ اول تو ان میں اکثر کتابیں اس قدر مفصل اور باریک مطالعے پر مبنی ہیں کہ ان سے خاطر خواہ فائدہ ماہر اور مشاق ارباب قلم ہی اٹھا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کتابوں کی نوعیت بنیادی حوالے کی ہے۔ دوسرے ان کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے نوآموز بہت سے سامنے کے مسائل بھی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری خوبی اس کا اختصار اور جامعیت ہے۔ تیسری خوبی یہ ہے کہ 'درس بلاغت' کسی ایک مصنف کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مختلف ماہرین کے بلاغت کے مختلف گوشوں پر مضامین، اس ترتیب سے شامل کیے گئے ہیں کہ کتاب کے مرتب ہونے کا گمان ہی نہیں گذرتا۔ مثلاً اس میں سب سے پہلا مضمون 'بلاغت کیا ہے' از شمس الرحمٰن فاروقی، دوسرا مضمون 'علم بیان' ڈاکٹر صادق کا ہے۔ ظاہر ہے جب نوآموز بلاغت کے تصور کو اچھی طرح سمجھ جائے گا تو علم بیان کو سمجھنا اور اس کی افادیت کو محسوس کرنا اس کے لیے مشکل یا بے کار نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح یہ

ترتیب آگے بڑھتی رہتی ہے اور آخری مضمون یعنی بارھواں باب 'موجودہ عہد میں علوم بلاغت کی اہمیت' کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مربوط و مبسوط اور منصوبہ بندی میں یہ کتاب اپنی پیش رو کتابوں سے خاصی منفرد ہے۔

بلاغت اور فصاحت کے بارے میں قدیم کتابوں میں یہ تصور عام ہے کہ بلاغت کے لیے فصاحت ضروری ہے لیکن فصاحت کے لیے بلاغت ضروری نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اس تصور پر کلام کیا ہے اور بلاغت میں فصاحت کی لازمی حیثیت کو مسترد کیا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ طلبا کو فصاحت اور بلاغت کو علاحدہ علاحدہ سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ ورنہ یہ سوال بدستور قائم رہتا کہ بلاغت کے لیے فصاحت ضروری ہے تو فصاحت کے لیے بلاغت ضروری کیوں نہیں؟ یہ سوال اس لیے بھی بامعنی اور ضروری ہے کہ بلاغت کلام کی وہ صورت حال ہے جس میں مرتبۂ کلام اور مقتضائے حال لازماً پائے جاتے ہوں۔ اگر فصاحت کو (جو کہ سماعت سے تعلق رکھتی ہے) بلاغت کے لیے لازم کر دیا جائے تو بلاغت کا مجروح ہونا یقینی ہے۔ اب چونکہ فصاحت کا تصور سماعت سے ہے لہٰذا یہ تصور زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے نئے زمانے کے مطابق اس کی وضاحت ضروری تھی۔ یہ کتاب کی چوتھی خوبی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں موجودہ زمانے میں ترسیل کی ناکامی اور 'مرتبۂ کمال' کو لے کر جو مغالطہ ہو سکتا تھا اس کی وضاحت کی گئی ہے، یہ پانچویں خوبی ہے۔

'درس بلاغت' کے زیر نظر چھٹے ایڈیشن میں کئی مقامات پر یہ احساس ہوتا ہے جیسے کچھ حذف ہو گیا ہو اور عبارت ناقص معلوم ہوتی ہے۔ ایک جگہ مجھے کچھ زیادہ تردد ہوا تو پانچویں ایڈیشن سے موازنہ کرنا پڑا۔ معلوم یہ ہوا کہ چھٹے ایڈیشن کے صفحہ 14 کے دوسرے پیراگراف میں ''... تو بلاغت کے لیے فصاحت کی شرط بھی ضروری نہ ہونا چاہیے'' ٹائپ ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت اس کے باوجود مسلمہ ہے۔ اس کی مقبولیت کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہی ہوگا کیونکہ اس کا پہلا ایڈیشن 1981 میں آیا تھا اور اب یہ چھٹا ایڈیشن ہے جو گیارہ سو کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔ ایسی مقبولیت کم ہی کتابوں کو میسر آتی ہے۔ میں ایسی اہم کتاب کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کے اہتمام پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

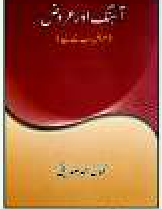

آہنگ اور عروض

مصنف: کمال احمد صدیقی

صفحات: 357، قیمت: 125/روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد مقیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کمال احمد صدیقی کے نام سے ہر کوئی واقف ہے۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ کمال احمد صدیقی ریڈیو کشمیر میں ملازمت کرتے تھے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر محمد حسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالہ تحریر کیا۔ ماس میڈیا کے تعلق سے کمال احمد صدیقی کا یہ مقالہ نہایت وقیع اور کارآمد ہے۔ یہ مقالہ 'ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ برقی ذرائع ابلاغ کے میدان میں مستقبل کے خواہاں طلبا کے لیے یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ کمال احمد صدیقی ایک مشاق شاعر بھی تھے اور حلقۂ شعر و ادب میں ان کے شعری مجموعے 'بادبان اور دوسری نظمیں' کی خاصی پذیرائی بھی ہوئی۔ کمال احمد صدیقی کی ایک حیثیت مدون متن کی بھی ہے اور اس تعلق سے ان کی تدوین کردہ کتاب 'بحر الفصاحت' از نجم الغنی خاں رامپوری، ایک مستند متن ہے۔ غالبیات کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ مطالعۂ غالب کی تحقیق میں کمال احمد صدیقی بھی ان چند ناموں میں سے ایک ہے جسے نظر انداز کرنا گویا ایک قسم کی محرومی ہے۔ بیاض غالب اور غالب کی شناخت کے حوالے سے ان کی تحقیقی خدمات اپنی وقعت و عرق ریزی کے باعث اہم ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'آہنگ اور عروض' ان کے ایسے ہی شاہکار کارناموں میں سے ایک ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کی پہلی اشاعت 1989 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اہتمام سے عمل میں آئی اور یہ پانچویں طباعت بھی کونسل ہی کی توجہ کا ثمرہ ہے۔ کمال احمد صدیقی نے یہ کتاب بڑے تجربے کے بعد عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ تحریر کی ہے۔ بالخصوص جدید زمانے میں عروض پر نئی طرز میں کسی کتاب کا آنا اور پانچ ایڈیشن نکلنا غیر معمولی بات ہے۔ عروض نہایت مشکل فن ہے۔ اردو تنقید میں ایک زمانہ وہ بھی آیا جب عروض کی اہمیت سے انکار کیا جانے لگا۔ بلاشبہ عروض کا علم کسی ناموزوں طبع کو شاعر نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ شاعری کے لیے تخیل اور طبع موزوں کی بنیادی اہمیت ہے۔ لہٰذا عروض کا علم موزوں طبع افراد کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھیں اظہار کے گوناگوں طریقے اور اسالیب سے آشنا کراتا ہے۔ عروض کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اہل زبان سے بھی شعر میں استعمال لفظ میں غلطی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی لفظ کو بڑے شعرا کم از کم چار بڑے شاعروں نے غلط ہونے کے باوجود استعمال کیا ہو اسے سند مانا جاتا ہے۔ لیکن عروض اور قافیے کی غلطی خواہ کتنا ہی بڑا شاعر کرے اسے سند نہیں مانا جاتا۔ اسے غلطی ہی کہا جاتا ہے۔ زبان یا لفظ کی غلطی اگر اہل زبان شاعر کے یہاں آئے تو اس لیے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ شعر میں وزن اور قافیے کی وجہ سے فصاحت میں خلل آنا فطری اور بدیہی ہے۔ کمال احمد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ عروض پر مبنی قدیم کتابوں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے، اور جس کی وجہ سے سمجھنے میں جو دشواری پیدا ہوتی ہے، اسے بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ یعنی زبان کی حد تک اس علم کے بیان میں جو سنجیدگی تھی اسے دور کر دیا ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلے کی تفہیم ایسی سلیس اور آسان زبان میں کی ہے کہ قاری کو حیرت کے ساتھ ساتھ سمجھ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

کمال احمد صدیقی نے عروض کی فہم کے لیے جو طریقہ کار اپنایا ہے وہ قاری کو اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ قاری کمال احمد صدیقی کے حلقۂ درس میں بیٹھا عروض کی باریکیاں سیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی بات کہنے کے بعد درمیان میں سوال بھی کرتے ہیں اور پھر جواب اس طرح دیتے ہیں گویا انھیں فیڈ بیک ملا ہو۔ مثال کے طور پر:

''اچھا۔ فاصلۂ صغریٰ یا فاصلۂ صولت کی کوئی مثال دیجیے۔

اجی، ذرا ذہن پر زور ڈالیے۔ کچھ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ عربی میں تو بہت الفاظ اس طرح کے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی مثالیں تو مل ہی سکتی ہیں۔

چلیے۔ ہم شعر پڑھتے ہیں۔ فاصلہ صغرا/صولت کی نشاندہی آپ کریں:

دل کو آئینہ کیا، شیشہ گراں ہم بھی ہیں
تک ادھر دیکھیے، صاحب نظراں ہم بھی ہیں

بہت خوب بہت خوب۔ نظَرَاں۔ واقعی نظراں میں الف مع غنہ کے یعنی انی الف ساکن ہے۔ اور پہلے تین حرف ن، ظ اور ر پر فتحہ کی حرکت ہے۔''

اقتباس سے ظاہر ہے، کمال احمد صدیقی صرف تعریف پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ

مثالوں کو درمیان میں لاتے ہیں۔ مثالیں لانے کا انداز عام روش سے ہٹ کر ہے۔ یعنی مثالیں دے کر قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں پھر مطلوبہ مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس طریق کار سے کتاب کتاب نہ معلوم ہو کر تجربہ گاہ معلوم ہوتی ہے اور سارے عروضی مسائل ایک دلچسپ کھیل۔ ایسے عام قاری جنھوں نے کبھی عروض کی کوئی کتاب پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ زحاف کا مسئلہ کس قدر الجھن بھرا ہے۔ اچھا یہ ایک آدھ ہو تو بات بھی بنے، ایک طویل فہرست ہے جسے دیکھ کر ہی اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا سب حفظ کرنا پڑے گا۔ اگر میں یہاں دوسری کتابوں سے مثال دوں گا تو بات طویل ہوجائے گی، لیکن کمال احمد صدیقی کے یہاں سے مثال دینا ضروری ہے۔ تاکہ جن لوگوں نے اس کتاب کا نام پڑھ کے ہی اسے کھولنے کی ہمت نہیں کی وہ مائل ہوسکیں۔

''اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ سب زحافوں کی مجموعی تعداد اڑتالیس ہے، تو آپ میں سے کچھ لوگ سنجیدگی سے سوچیں گے کہ اب آگے پڑھنا فضول ہے۔ دو کم پچاس زحافوں کو یاد رکھنا کوئی مذاق نہیں، لیکن گھبرائیں نہیں ان میں سے گیارہ تو ایسے ہیں جو عربی شاعری سے مخصوص ہیں... ان گیارہ زحافات کو، کسی ذہنی نقصان کے احساس کے بغیر بھول سکتے ہیں... باقی جو زحاف ہیں، وہ بھی اپنی تعداد سے تو بے شک ڈراتے ہیں لیکن ان میں کئی ہیں جن کے کام مختلف ارکان میں ایک سے ہیں، لیکن نام مختلف ہیں۔''

بلاشبہ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے، کیونکہ صاحب کتاب نے یقیناً عروض کو ایک کھیل کی طرح پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے نئے قاری اسے توجہ سے پڑھیں گے مگر ایسے جیسے کوئی تماشا پیش نظر ہے، اس طرح علم عروض بڑی حد تک آسان ہوجائے گا اور مشق بہم پہنچے گی۔ عروض کی یہ آسانی مشروط اس بات سے مشروط ہے کہ تماشے کو ''فرض منصبی'' نہ سمجھا جائے۔ اتنے اہم موضوع پر کتاب کی طباعت کا بار اٹھانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، لائق مبارک باد ہے۔

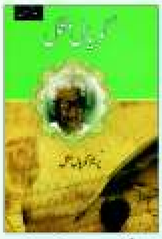

گوپال متل (مونوگراف)

مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر سلمان فیصل، ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن، حکومت دہلی

ممتاز ادیبوں کے مونوگراف شائع کرنے کا سلسلہ ایک احسن عمل ہے جس کے ذریعے عام قاری ایک نشست میں کسی ادیب کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتا ہے اور اس کے ذریعے موصوف ادیب کے نثری وشعری نمونوں سے روبرو بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک مونوگراف کسی ادیب کا ادبی ہیولی تیار کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اردو کے کئی ادارے اس عمل میں شریک ہیں اور اپنی پالیسی کے تحت منتخب ادیبوں کے مونوگراف شائع کر رہے ہیں۔ اس فہرست میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی بھی شامل ہے۔

رواں سال میں بھی ملک کے بڑے اردو ادارے قومی کونسل نے کئی ادیبوں پر مونوگراف شائع کیے ہیں جن میں ایک مونوگراف گوپال متل کے نام ہے اور اس کو تیار کیا ہے ان کے بیٹے پریم گوپال متل نے۔ گوپال متل اردو ادب کی ایک معروف شخصیت ہے۔ اردو کے تئیں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ گوپال متل کی شخصیت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بطور صحافی بھی مسلم ہے۔ انھوں نے کئی رسائل وجرائد میں کام کرنے کے بعد خود اپنا ایک رسالہ 'تحریک' جاری کیا جو بڑے آب وتاب کے شائع ہوتا رہا۔

پریم گوپال متل نے اس مونوگراف میں گوپال متل کی سوانح وشخصیت، ان کی شاعری اور صحافت کے علاوہ ان کے کچھ معاصرین کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ مزید برآں گوپال متل کی نثر ونظم سے انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ صاحب کتاب نے اپنے ابتدائیہ میں ان تمام تحریروں اور کتابوں کے بارے میں بھی قاری کو آگاہ کیا ہے جو گوپال متل کی خدمات کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ مصنف کے مطابق گوپال متل پر سب سے پہلے ان کی زندگی میں ہی کمار پاشی نے اپنے سہ ماہی جریدہ 'اسطور' کا نمبر شائع کیا تھا جس میں ممتاز ادیبوں کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ متل صاحب کی زندگی میں ہی ان پر ایم فل کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان پر مزید دو اور ریسرچ کی گئی۔ مختلف رسالوں میں ان پر گاہے گاہے مضامین بھی شائع ہوتے رہے لیکن یہ سلسلہ کم ہی رہا۔ متل صاحب کے رسالہ 'تحریک' کا اشاریہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ گوپال متل کی شعری کائنات چار مجموعوں 'دوراہا، صحرا میں اذان، شرار نغمہ اور سچے بول' پر مشتمل ہے۔ ان کا نثری سرمایہ دو کتاب 'ادب میں ترقی پسندی' اور 'لاہور کا جو ذکر کیا' کے علاوہ سیکڑوں اداریوں پر مشتمل ہے۔ گوپال متل نے دوسری زبانوں سے اردو میں کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

پریم گوپال نے 'سوانح وشخصیت' کے عنوان سے گوپال متل کی شخصیت کا جامع نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے قارئین کو باخبر کیا ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو وا کرتے ہوئے مصنف نے رسالوں سے وابستگی اور ملازمت کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ان کی ادبی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ کئی واقعات کے ذریعے گوپال متل کی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت گوپال متل کی زندگی میں جو نشیب وفراز پیش آئے ان کا ذکر بھی خاص طور سے کیا گیا ہے۔ 'گوپال متل بطور صحافی' کے عنوان سے ان کی صحافت پر مختصراً ذکر کے بعد رسالہ 'تحریک' کے اداریوں سے چالیس سے زائد اقتباسات پیش کیے گئی ہیں۔ ان اقتباسات کے ذریعے گوپال متل کی فکری بصیرت کا ادراک ہوتا ہے۔

'گوپال متل بطور شاعر' کے عنوان کے تحت ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں ان کی نظموں کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ ترقی پسندی کے زمانے میں جس طرح سے انھوں نے نظم نگاری کی تھی وہ بالکل یک طرفہ مارکسی نظریے کی حامل نہیں تھی بلکہ زندگی کے حقائق کو بیان کرتی تھیں۔ پریم گوپال متل نے لکھا ہے کہ ''گوپال متل نے نظمیں بھی لکھی ہیں، پابند بھی، آزاد بھی، مگر ان نظموں میں انھوں نے نہ سرمایادار کو برا بھلا کہا، نہ مزدور اور محنت کش کو ہیرو بنایا، نہ ہی جنس کو ادب کا ایک عنصر قرار دیا بلکہ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے زندگی کے ان تلخ حقائق کی عکاسی کی ہے جن سے انسان روز اول ہی سے دوچار ہے۔'' گوپال متل کی متعدد نظموں کا تجزیہ اس باب میں شامل ہے جس کے ذریعے مصنف نے ان کی نظم نگاری کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوپال متل کی غزلوں پر کم ہی گفتگو کی گئی ہے۔ بقول مصنف گوپال متل کی غزلوں میں کئی رنگوں کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے کہیں وہ غالب، کہیں داغ، کہیں حسرت تو کہیں فیض نظر آتے ہیں لیکن ان کا آہنگ اپنا ہے اور جہاں رنگ وآہنگ دونوں ان کے اپنے ہیں وہاں ان کی غزلوں کی فضا ہی بدل گئی ہے، قدم قدم پر تازگی ہے ایک حسن ہے ایک دلکشی ہے۔

مونوگراف کے آخر میں متل صاحب کے کچھ معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے جن میں

تاجور نجیب آبادی، محمد دین تاثیر، مولانا صلاح الدین احمد، اسرار الحق مجاز، جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی اور مخمور سعیدی شامل ہیں۔ ان معاصرین کے ذکر میں گوپال متل کی ادبی سرگرمیوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور گوپال متل سے ان کے روابط پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ مونوگراف گوپال متل کی شخصیت کے مکمل نقوش کو ایک نشست میں ابھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

علاج بذریعہ غذا

مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی
صفحات: 415، قیمت: 185 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: سعید اختر اعظمی، نزد جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

صحت اور بیماری دھوپ چھاؤں کی مانند ہیں جو زندگی میں اندھیرے اجالے کی طرح آتی جاتی رہتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ صحت کی قدر و قیمت بیماری کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے۔ صحت کی نعمت رب کائنات کے حضور کلمہ تشکر کی ادائیگی کی دعوت دیتی ہے تو علالت علاج اور پرہیز کے ذریعہ 'مراجعت' کی جانب راغب کرتی ہے۔ قدرت نے بیماریاں پیدا کی ہیں تو اس کا علاج بھی رکھ دیا ہے تاکہ انسان زندگی سے مایوس نہ ہوجائے۔ یہ علاج مختلف قسم کی دواؤں، جڑی بوٹیوں اور دیگر اشیا سے کیا جاتا ہے۔ خالق کون و مکاں نے انسان کو یہ فہم عطا کیا ہے کہ وہ علاج کی تمام تدابیر آزمائے اور اپنی بقائے صحت کی کوشش کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دوا کے بغیر کسی بیماری کا علاج نہیں کیا جاسکتا؟ اس کا جواب اثبات کے بجائے نفی میں ہے اور زکریا رازی کے اس قول سے مزید واضح ہوجاتا ہے۔ 'جب تک غذا سے علاج کیا جاتا ہو دوا سے علاج مت کرو۔' گویا کہ دوا کے مقابلے میں اشیا خورد ونوش سے علاج بہتر ہے اور اسی کو ترجیح دینا چاہیے۔ 'علاج بذریعہ غذا' اسی حوالے کو معتبر کرتی ہے۔

علم الادویہ اور علم العلاج کے ماہر حکیم احتشام الحق قریشی کی کتاب 'علاج بذریعہ غذا' عوام الناس کو خوراک کے متوازن استعمال اور موقع بہ موقع بصورت دوا استفادے پر ابھارنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ ابتدائی پندرہ ابواب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ غذا کیا ہے؟ غذا اور دوا میں کیا فرق ہے؟ طب یونانی میں غذاؤں کی تقسیم کس طرح کی گئی ہے؟ غذا سے علاج کرنے کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ ایسی کون سی غذائیں ہیں جو جگر اور معدہ کے لیے ضرر رساں ہیں؟ پھلوں کو نہار منہ کیوں نہیں کھانا چاہیے؟ مریضوں کے لیے غذائی قوانین کیا ہیں؟ مختلف غذاؤں میں غذائی اجزا کا تناسب کیا ہے اور ان کے ہضم ہونے کے اوقات کیا ہیں؟ نباتاتی اور حیواناتی غذائیں کون کون سی ہیں اور ان سے علاج کس طرح ممکن ہے؟ پانی اور برف سے کس طرح علاج کیا جاسکتا ہے؟

غذا میں لذت کام ودہن والی وہ تمام اشیا شامل ہیں جو معدہ کی طلب کا جواب دے سکیں۔

یہ جزو بدن بن کر توانائی کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوا جزو بدن نہیں بنتی اور اپنے اثرات کے نفاذ کے بعد جسم سے خارج ہوجاتی ہے۔ غذا یا تو صالح ہوگی یا فاسد یا تو لطیف ہوگی یا کثیف۔ یا تو کثیر ہوگی یا قلیل یا متوسط۔ علاج بذریعہ غذا کے جامع ومشترک اصول ہیں۔ حقیقت مرض کا علم ہو یا نہ ہو یہ اصول کارآمد قرار دیے گئے ہیں۔ گرم، سرد، خشک وتر غذا کی مزاجی کیفیتیں ہیں۔ ان چاروں میں سے کوئی دو کیفیتیں ہونے کے نتیجے میں امراض لاحق ہوتے ہیں۔ تمام ترغیر قابض غذائیں (لوکی، پالک، دودھ وغیرہ) روغنی اشیا (گھی، مکھن اور جملہ مغزیات) معدے میں سوزش پیدا کرنے والی غذائیں (چقندر، شہد، چائے، اچار وغیرہ) لیس دار غذائیں (پالک، بھیجا) قابل کراہت غذائیں اور فاسد غذائیں جگر ومعدہ کے لیے نقصان دہ ہیں۔ پھلوں کو نہار منہ کھانے سے اعصاب معدہ، آنتیں، تلی، جگر، پھیپھڑے اور سینے کی جھلیاں کمزور ہوجاتی ہیں۔ مریضوں کے لیے غذائی قوانین یہ ہیں کہ انھیں حالات کے مطابق کم وبیش یا برائے نام غذا دی جائے۔ ان کے ہضم ہونے کے اوقات سے بھی واقفیت لازمی ہے۔ نباتاتی غذاؤں میں گندم، چاول، چنا، دال، سبزی، پھل اور میوے شامل ہیں جبکہ حیواناتی غذاؤں میں دودھ، شہد، انڈا، مچھلی اور گوشت کی شمولیت ہے۔ ان سے علاج کیسے ہو اس کی معلومات رکھنا چاہیے۔ اناج جسم کی نشو ونما میں معاون ہوتے ہیں۔ سبزیاں دماغی قوت بڑھاتی ہیں۔ اطبا کا کہنا ہے کہ جسم انسانی میں پیدا ہونے والی سبھی بیماریوں کا علاج پھلوں اور میوہ جات سے ہوسکتا ہے۔ گوشت خوری انسان کی غلطی ہے نہ محض تفریحی مشغلہ، تمام تحقیق اسے بہترین غذا مانتی ہے۔ اس کی چربی اور حیوانی اعضا سے بھی مختلف بیماریوں کا علاج ممکن ہے۔ پانی سرد ہو یا گرم یا برف کی صورت میں اس سے علاج میں معاونت ملتی ہے۔

اگلا باب غذائی علاج کی تفصیل پر مبنی ہے۔ اس کی تشریح وتوضیح میں مختلف پھل، گوشت، سبزی وغیرہ کی شناخت، مزاج اور فوائد پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ بطور مثال 'کھچڑی' کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

چاول اور دال سے پکنے والی مشہور غذا ہے۔ اگر اسے یخنی کرکے تیار کیا جائے تو شلہ کھچڑی کہتے ہیں۔ اس کا مزاج ان اجزا پر منحصر ہے جس سے یہ تیار کی جاتی ہے۔ مثلاً دال کوئی گرم قسم کی استعمال کی گئی ہے یا سرد یا معتدل وغیرہ، چاول کا مزاج سرد تر ہے۔ اچھے، پرانے اور خوشبودار چاولوں کی کھچڑی شیریں اور گراں ہے۔ بدن کو قوت دیتی ہے اور موٹا کرتی ہے۔ یہ زود ہضم ہے۔

حکیم احتشام الحق قریشی نے طب قدیم کی طویل تاریخ اور تجربات سے استفادہ کرکے یہ کتاب قارئین کے روبرو کی ہے۔ اس طرح شفایاب ہونے والوں کی دعائیں انھوں نے اپنے دامن میں خود بخود سمیٹ لی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ھیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ھیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

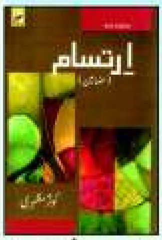

ارتسام

مصنف: کوثر مظہری

صفحات: 464، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ابوظہیر ربانی، لیکچرر شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی

عصر حاضر کے نقادوں میں پروفیسر کوثر مظہری کا ادبی قد نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر میں بیک وقت بے باک نقاد کے علاوہ شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت بھی بنائی ہے۔

'ارتسام' کوثر مظہری کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں شامل مضامین کی نوعیت ایک مخصوص موضوع کی نہیں ہے اس لیے مصنف نے کتابوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ 'رنگ نثر' ہے جس میں نو مضامین ہیں۔ مثلاً 'یادگار غالب پر ایک قاری کا نوٹ'، 'فراق کا تصور عشق'، 'من آنم کے حوالے سے'، 'محمد حسن کا مضمون'، 'نئی جدیدیت'، 'نئی ترقی پسندی'، 'بازدید'، 'آل احمد سرور کی اقبال فہمی'، 'تنقیدی اصطلاحات، تعین قدر کا مسئلہ، وہاب اشرفی کا نقد الشعر، نقد غزل اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ۔

طوالت کے سبب تبصرہ میں ہر مضمون کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن قاری عنوانات سے مضامین کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

کوثر مظہری نے کتاب کے پہلے حصے میں جن ادبی شخصیات کی تصانیف یا مضامین کو پرکھا اور نتیجہ پیش کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کوثر مظہری میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں اپنی بات پر اعتماد ہوتا ہے لیکن وہ فیصلے صادر نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کتاب کے 'پیش نامہ' میں لکھتے ہیں:

''ان مضامین میں سے کچھ ایک پیش کیے گئے میرے موقف سے قارئین اختلاف بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ادب فہمی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس لیے کسی طرح کی ادعائیت کا میں قائل بھی نہیں۔''

دوسرا حصہ 'رنگ شاعری' میں 24 مضامین شامل ہیں جس میں پہلا مضمون افضل کی بکٹ کہانی ہے۔ کوثر مظہری نے اس میں ہندوستان کے لسانی و تہذیبی نقوش کا جائزہ لیا ہے۔ کہانی مثنوی کی ہیئت میں ہے اور قدیم اردو شاعری کے نمونوں میں اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ مصنف نے کہانی میں پائے جانے والے اردو کے ارتقائی مراحل کے نقوش کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس طرح اردو کے خمیر میں ہندوستان کا ملا جلا جو روپ ہے، ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ افضل کی اس بکٹ کہانی میں مختلف زبانوں سے استفادہ کیا گیا ہے جس کا ذکر کوثر مظہری نے تفصیل سے کیا ہے۔ مثلاً

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی — بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی
نہ مجھ کوں بھوک دن۔ نا نیند راتا — برہ کے درد سوں سینہ پراتا
تمامی لوک مجھ بور کہی ری — خرد گم کردہ مجنوں ہو رہی ری
نہیں اس درد کی دارو کی کن — بھئے حیراں سبھی حکمائے ذوفن

کوثر مظہری لکھتے ہیں:

''یہاں جو غم سوں، مجھ کوں، درد سوں کا استعمال ہوا ہے وہ دکن میں اور شمالی ہند کی قدیم شاعری میں موجود ہے۔ افضل ولی سے بہت پہلے کے شاعر ہیں لیکن اس لسانی اظہار کے ڈانڈے دکن سے ہی جا کر ملتے ہیں۔''

رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری نے ہندوستانی ادب کو بہت متاثر کیا ہے لہٰذا ٹیگور کے حوالے سے تین مضامین 'ارتسام' میں شامل کیے گئے ہیں، جن میں ایک مضمون 'ٹیگور اور اقبال' بھی ہے۔ دیگر مضامین میں ایک مضمون 'طنز و مزاح کا شعری اسالیب' ہے جس میں اردو شاعری میں طنز و مزاح کے اسالیب کی شعریات واضح کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں طنز نگار یا مزاح نگار کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنی ذہنی افتاد کی تفہیم کرے تاکہ طنز و مزاح دونوں کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو طنز و مزاح طعن و تشنیع کے سوا کچھ نہیں رہ پائے گا۔ دیگر مضامین میں کوثر مظہری نے جن شاعروں کے ادبی اور شعری نظریات کا جائزہ لیا ہے وہ اپنے موضوعات کے اعتبار سے بھی نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ادب کی مختلف شعری اصناف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے شاعروں میں سنت کبیر اور نظیر، سودا، راسخ عظیم آبادی، مومن، ظفر، جوہر، فیض، اختر الایمان، ندا فاضلی، ظفر گورکھپوری، وہاب دانش، علی ظہیر، شجاع خاور، فرحت احساس، خورشید اکبر، عبید الرحمٰن ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے حصے میں قصیدہ کی صنفی شناخت، اردو نظم: صنف اور ہیئت کی تعمیر کے حوالے سے بھی مضامین شامل ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ 'رنگ فکشن' ہے جس میں کل آٹھ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'نئے ناولوں کے موضوعات اور اسالیب' ہے۔ ان سارے ناولوں کی اشاعت 1980 یا 1990 کے بعد ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر خواب رو، دو گز زمین، آنگن اور زمین، مہاساگر، بیان، دویہ بانی اور فرار ہیں۔ مصنف نے زندہ محاورے (ناشر شرما)، فائر ایریا (الیاس احمد گدی)، فرات (حسین الحق)، نمرتا (صلاح الدین پرویز) کالی مائی (علی امجد) مہاساگر (عبدالصمد)، آخری داستان گو (مظہر الزماں خاں، دویہ بانی (غضنفر) بیان (ذوقی) مکان (پیغام آفاقی) دل من (یعقوب یاور) دھند میں اگا پیڑ (آشا پربھات) اور آنکھ جو سوچتی ہے (کوثر مظہری) جیسے اہم جدید ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان میں تنوع پایا جاتا ہے اور اسلوب بھی سب کا الگ الگ ہے۔ چنانچہ یہ ناول جمود کا شکار ہوتے نظر نہیں آتے۔ بعد ازیں سہیل عظیم آبادی کے ناولٹ 'بے جڑ کے پودے' اور ذوقی کے ناول 'پوکے مان کی دنیا' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں انور عظیم، ذکیہ مشہدی، طارق چھتاری اور خالد جاوید کے ایک ایک افسانے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ منٹو کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پر لکھے گئے بعض اہم نقادوں کے تنقیدی تجزیوں کی بازدید ہے جو لائق توجہ ہے۔

مختصر یہ کہ کتاب میں شامل تمام مضامین قابل توجہ ہیں۔ اس کے مطالعے سے کوثر مظہری کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

خواتین کی احتجاجی شاعری

مصنف: ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ

صفحات: 175، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: تنویر پبلشرز، ثنا اپارٹمنٹ، ریڈ ہیلس، حیدرآباد، تلنگانہ

مبصر: سمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پیش نظر کتاب 'خواتین کی احتجاجی شاعری' کو ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد نذیر احمد کا پیش لفظ اور مصنفہ کا عرض حال بھی کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ 'ماضی اور حال میں عورت کا مقام' ہے۔ اس

باب میں مصنفہ نے قدیم عہد سے عصر حاضر تک عورتوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عہد قدیم سے اب تک عورتوں کا استحصال ہوا ہے، عہد قدیم میں جب کوئی جنگ ہوتی تھی تو جنگ کی کامیابی کے ساتھ یہ خبر سب سے پہلے دی جاتی تھی کہ دشمن فوج کی کتنی خواتین کو گرفتار کیا گیا ہے۔ گویا عورتوں کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا، ان کی عصمت دری کی جاتی اور حکمراں طبقہ اسے سیاسی مفاد کے لیے استعمال کرتے۔ ایسی عورتوں کے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے عصر حاضر میں عورتوں کو درپیش مسائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آزادی سے لے کر اب تک کے فسادات اور اس میں عورتوں پر کی گئی زیادتی کا ذکر کیا ہے۔ مصنفہ نے مذہبی صحیفوں میں عورت کی حیثیت اور سماج میں ملنے والے ان کے حقوق کے درمیان کے فرق کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ عورتوں پر ہونے والے تمام مظالم کو انھوں نے مردوں سے منسوب کرتے ہوئے عورتوں کو معصوم اور تشدد کا شکار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ گھریلو تشدد میں زیادہ تر خواتین کا رول ہی ہوتا ہے، خواہ وہ ساس کی شکل میں ہو، نند یا پھر بھابی کی شکل میں ہو۔ میرا خیال ہے کہ مصنفہ کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'ہندوستان میں آزادیِ نسواں کی تحریک' ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے کتاب کے اس حصے میں ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم، پیسے لے کر فروخت کرنے یا مرضی کے خلاف شادی کرنے کے مسئلے کو پیش کرنے کے ساتھ ہندوستان میں آزادیِ نسواں کے لیے ہونے والی جدوجہد کا جائزہ لیا ہے۔ حالانکہ انھوں نے اس ضمن میں عرب عورتوں کا حال بھی بیان کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے اندر عورتوں کی صورت حال کیا تھی۔ اس کے علاوہ مغرب میں عورتوں کی زبوں حالی کو بھی مصنفہ نے سلیقے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے مرد کا ایک طبقہ عورتوں کی کامیابی سے پریشان ہوتا ہے باوجود اس کے عورتوں نے ان چیلنج کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ ناسازگار حالت میں بھی اپنی اہمیت منوائی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کا تیسرا باب 'خواتین میں احتجاجی شعور' ہے۔ یہ اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ مصنفہ نے 'احتجاج' کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ احتجاج کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ عورتیں مرد کے وجود سے انکار کردیں، بلکہ ایسے سماج کی تشکیل دی جائے جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو سماجی، سیاسی، معاشی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے ساتھ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی لڑائی میں مردوں نے بھی عورتوں کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ مصنفہ نے فیمینزم کی ابتدا اور سماج پر پڑنے والے اس کے اثرات کو بھی پیش کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ 1960 کے بعد جب Women's Liberation Movemnet ایک طرح سے ختم ہونے لگا تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے عورتوں کی جنسی آزادی کی حمایت کی اور جسم فروشی کا باقاعدہ پیشہ مان لیا گیا۔ ان کا خیال ہے کہ جب مرد کے استحصال سے عورتیں آزاد ہوئیں اور عورتوں نے قلم کا سہارا لیا مردوں کے ظلم واستحصال کے خلاف آواز بلند کی، حالانکہ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہر دور میں باصلاحیت خواتین تھیں مگر ان کے پاس طبع آزمائی کا موقع میسر نہیں تھا ورنہ خواتین میں سے بھی کوئی میر، غالب، اور اقبال کی ہم پلہ شاعرہ منظر عام پر آتیں۔

زیر مطالعہ کتاب کا چوتھا باب 'ہندوستانی شاعرات کے کلام میں احتجاج' ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے خواتین کی ادب سے قربت، تاریخ فیمینزم کو پس منظر میں بیان کرنے کے بعد ہندوستان کی خواتین کی شاعری اور اس کی احتجاجی لے کو پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابتدا میں خواتین کی شاعری میں روایتی رنگ ملتا ہے مگر آہستہ آہستہ ان کا شعور پختہ ہوتا گیا اور وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے لگیں، اور جیسے ہی حقوق نسواں کی تحریک شروع ہوئی خواتین بھی اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرنے لگیں۔ مصنفہ نے نوشابہ خاتون، انوری بیگم، صفیہ بیگم قمر فاطمہ تاج اور جمیلہ نشاط کا تعارف اور ان کی شاعری کا مختصر نمونہ پیش بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ذیلی عنوان 'سماجی احتجاج' کے ذیل میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، عشرت آفریں اور ترنم ریاض کی شاعری اور اس کے موضوعات کا تفصیلی اور خصوصی جائزہ پیش کیا ہے۔ سیدہ نسیم سلطانہ کا خیال ہے کہ مذکورہ شاعرات نے سماجی عدم مساوات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ آج بھی شاعرات سماجی عدم مساوات اور سماج کے دوسرے مسائل پر کھل کر اظہار خیال کر رہی ہیں۔ چوتھا باب 'ہندوستانی شاعرات کے کلام میں احتجاج' کے دوسرے ذیلی عنوان 'سیاسی احتجاج' میں اس شاعری کا ذکر کیا گیا ہے جس میں مزاحمتی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نسائی حسیت پر مبنی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں وحشت ناک سناٹے یا ہولناک خاموشی نہیں ملتی بلکہ عصری، سیاسی اور سماجی مسائل کی گونج سنائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ کی کتاب 'خواتین کی احتجاجی شاعری فیمینزم کی تعریف اور خواتین کی شاعری کی تاریخ کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی اردو کی چند اہم شاعرات، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، کی شاعری اور شعری مزاج کو سمجھنے میں بھی یہ کتاب رہنمائی کرتی ہے۔ ڈاکٹر سیدہ نسیم سلطانہ نے چند ایک مقام کو چھوڑ کر مدلل اور مفصل گفتگو کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

افکار کی خوشبو

مصنف/ ناشر: عبدالحی

صفحات: 192، قیمت: 100 روپے، اشاعت: 2019

مبصر: غلام نبی کمار، مدیر سہ ماہی 'پنج آب'

اردو زبان وادب کے فروغ میں جہاں افسانہ نگاروں، شاعروں، سوانح نگاروں، سفرنامہ نگاروں اور مؤرخین وغیرہ کا ذکر ناگزیر ہے، وہیں اس کی نشوونما میں محققین اور ناقدین کے کردار کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج اردو کی کن اصناف میں لکھا جارہا ہے، قلم کار اور ادیب کس صنف کی جانب زیادہ مائل ہو رہے ہیں، کون کون حضرات کس صنف میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہم بہ خوبی آگاہ ہیں۔ چونکہ اب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں اس لحاظ سے قارئین کو نئی صدی میں اردو زبان کی آبیاری کر رہی نوجوان نسل سے واقف کرانا بھی لازم ہے۔ اردو کی نئی اور اُبھرتی ہوئی پیڑھی میں ایک اہم نام ڈاکٹر عبدالحی کا ہے جو تحقیق، تنقید اور صحافت سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی اب تک دو کتابیں 'اردو صحافت اور سرسید احمد خاں' اور 'ادبی صحافت: آزادی کے بعد' شائع ہوئی ہیں۔

'افکار کی خوشبو' ڈاکٹر عبدالحی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یوں تو ان کے بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوپاک کے مؤقر ومقتدر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم 'افکار کی خوشبو' کو انھی مضامین میں چند اہم تحاریر کا گلدستہ کہا جاسکتا ہے جن سے یقیناً ان کے افکار وخیالات کی خوشبو آتی ہے۔ اس مجموعے میں سولہ مضامین اور بارہ تبصرے شامل ہیں جو کئی اہم اور معروف ترین شخصیات کے فن اور فکر کی نمائندگی کرتے

ہیں۔اس کتاب کا آغاز مصنف کے پیش لفظ سے ہوتا ہے اور پھر عبدالحی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں لکھے گئے تین مضامین بعنوان 'جواں جواں صلاحیتوں کی متحرک تصویر' از فاروق ارگلی، 'اردو صحافت کے جواں سال ناقد' از سید احمد قادری اور 'نقش ہیں سب ناتمام' از راشد اعظمی شاملِ کتاب ہیں۔پیش لفظ میں مصنف نے ابتدا تخلیق اور تنقید کے باہمی رشتے کی وضاحت نیز تنقید کی اہمیت بیان کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو زبان کے ساتھ اپنی رغبت، گھر کا ادبی پس منظر، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستگی اور کتاب میں شامل مضامین کا بڑی خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے۔فاروق ارگلی نے ڈاکٹر عبدالحی کو جواں جواں صلاحیتوں کی متحرک تصویر قرار دیا ہے۔انھوں نے اس جواں سال ادیب کی تمام ادبی اور صحافتی جہات کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تنقیدی خوبیوں کی بھی خوب پذیرائی کی ہے۔سید احمد قادری اور راشد اعظمی کے مضامین بھی عبدالحی کی اردو زبان کے تئیں خدمات، ان کی فکر اور ادبی صلاحیت کو نمایاں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحی نے اس کتاب میں انشائیہ، نظم، غزل، خاکہ، ڈرامہ، مزاح، ناول، صحافت اور ادب اطفال وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔کتاب میں شامل پہلا مضمون 'اردو انشائیے کا نقشِ اولین: محمد حسین آزاد' پر مندرج ہے، جس میں انشائیہ کی تعریف، انشائیہ کے معنی و مفہوم، صنفِ انشائیہ کے موجد، اردو میں انشائیہ کے اولین نمونے، انشائیہ نگاروں کا مختصر ذکر خصوصاً صنفِ انشائیہ میں محمد حسین آزاد کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عبدالحی نے اقبال پر 'اقبال کی شاعری میں مردِ مومن کا تصور' اور 'اقبال کا پیغام' کے عنوان سے دو مضامین لکھے ہیں۔ اول الذکر مضمون میں اقبال کی مختلف نظموں اور غزلوں کے اشعار کو حوالہ دے کر ان کے مردِ مومن کے تصور کو واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔آخر الذکر تحریر میں علامہ اقبال کی نظم ''خضرِ راہ'' کو بنیاد بنا کر قارئین کو ملک و قوم و ملت کے حوالے سے اقبال کے نظریے اور پیغام سے روشناس کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی نے اردو کے مشہور و معروف خاکہ نگار رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔انھوں نے رشید احمد صدیقی کے معاصر خاکہ نگاروں میں ان کی انفرادیت متعین کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔عبدالحی نے رشید احمد صدیقی کے خاکوں کے تین مجموعوں 'گنج ہائے گراں مایہ'، 'ہم نفسانِ رفتہ' اور 'ذاکر صاحب' کو خاص طور پر اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔مضمون نگار نے 'رئیس الغزل مولانا حسرت موہانی' پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔عبدالحی نے اس کتاب میں 'آغا حشر کی ڈرامہ نگاری: سلور کنگ کے حوالے سے' کے علاوہ 'مغرب میں تھیٹر کا ارتقا' کے عنوان سے بھی ایک اہم تحریر رقم کی ہے۔عبدالحی نے 'اختر الایمان کی شاعری کی انفرادیت' میں اختر الایمان کی چند مقبول نظموں 'تنہائی'، 'موت'، 'خاک و خون'، 'مسجد'، 'ایک لڑکا' کا تذکرہ کر کے ان کی شاعری میں زندگی کی حقیقت پسندی کے پہلو کو روشن کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحی نے ابن صفی پر دو مضامین لکھے ہیں جن میں 'ابن صفی کی مزاح نگاری' اور 'ابن صفی کے ناول 'شاہی نقارہ' کا جائزہ' قابلِ ذکر ہیں۔اول الذکر مضمون میں انسان کی زندگی میں طنز و مزاح کی ضرورت و اہمیت، روایت اور مزاح نگاری میں ابن صفی کا مقام متعین کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ناقد نے مضمون میں ابن صفی کے طرزِ بیان، اسلوب نگارش اور فن پر قدرت کو اپنی گفتگو کا مرکز بنایا ہے۔مزید برآں دوسرے مضمون میں ابن صفی کے ناول کے تعلق سے بھی اچھی بحث کی گئی ہے۔'آتش رفتہ کا سراغ اور ذوقی' اس کتاب میں شامل ایک اہم مضمون ہے۔مشرف عالم ذوقی معاصر اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔'آتشِ رفتہ کا سراغ' ان کا مقبول ناول ہے۔ڈاکٹر عبدالحی نے اس ناول کا بڑی عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔انھوں نے جہاں اس ناول کے پلاٹ، موضوع، تکنیک و تجربے اور کرداروں پر روشنی ڈالی ہے، وہیں اس کی بے جا طوالت کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ شاہد علی خاں اردو صحافت کے معمار کہے جا سکتے ہیں۔دہلی میں اردو کی ادبی صحافت کا ذکر ہو اور شاہد علی خاں کا نام نہ آئے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔'شاہد علی خاں کتاب نما سے نئی کتاب تک' اس ضمن میں قابل مطالعہ مضمون ہے جو بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔اس کتاب میں دیگر مضامین بھی معلوماتی ہیں جن میں 'الفاظ کا دیوتا: محی الدین نواب'، 'احمد علی برقی اعظمی اور ان کی شاعری'، 'اشاریہ نیا دور' اور 'بچوں کا البیلا ادیب: ابن آدم' قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحی نے اس کتاب میں مختلف موضوعات کی بارہ کتابوں پر تبصرے شامل کیے ہیں۔جن میں 'اسلوبیاتی تنقید' از مرزا خلیل احمد بیگ، 'ہوا کے دوش پر' از ڈاکٹر فیروز عالم، 'زاویہ نظر' از ناوک حمزہ پوری، 'زنجیرِ در' از سید شان معراج، 'ادبی معاصرین کا مطالعہ' از معین الدین عثمانی، 'وہاب نامہ' از وقار مانوی، 'ان کہی باتیں' از غضنفر اقبال، 'تجزیات بیادِ ڈاکٹر حسن مثنیٰ' از ڈاکٹر ریحان حسن، 'لرن اردو' از خالد سعید، 'نیا دور: مجاز نمبر' مدیر: وضاحت حسین رضوی، 'عالمی جائزہ' مدیر: اے رحمان شامل ہیں۔ان تبصروں سے پتہ چلتا ہے کہ تجزیاتی عنصر کے علاوہ عبدالحی تبصراتی فن میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ کتاب کی خوبیوں، خامیوں اور کمیوں کو کس طرح بیان کیا جاتا ہے، ان کے تبصروں سے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

مظہر امام (شخصیات سیریز)

مرتب: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 192، قیمت: 208 روپے

ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

مبصر: ایم نصر اللہ نصر، ہوڑہ

کتابوں کی ترتیب کو عام طور پر آسان کام سمجھا جاتا ہے اور لگتا بھی ہے۔لوگوں سے کسی خاص موضوع یا شخصیت پر ان کے لکھے ہوئے مضامین کو حاصل کر کے یکجا کر لیجیے یا پھر لکھوا لیجیے اور ایک مقدمے کے ساتھ اسے کتابی شکل دے ڈالیے کتاب مکمل۔لیکن سچ پوچھیے تو یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پہلے تو موضوع کا انتخاب ہی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بعد ازاں مضامین کا یکجا کرنا یا لکھوانا کسی مشکل امر سے کم نہیں۔ایک ایک مضمون کی بازیافت اور دستیابی وقت طلب مرحلہ ہے۔ اس کام کو ڈاکٹر امام اعظم نے بڑی محنت اور مشقت سے کیا ہے اور مظہر امام کی شخصیت اور شاعری نیز مظہر شناسی کے لیے اچھے مواد کا انتظام و اہتمام کر دیا ہے جس کے لیے وہ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب 'مظہر امام' مظہر امام پر ایک مونوگراف ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی کی فرمائش اور گزارش پر ترتیب دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس میں شامل مشاہیر قلم کاروں کے مضامین، مرتب کا مقدمہ، مظہر امام کے نام مؤقر اہل ادب کے خطوط، انٹرویوز اور انتخاب کلام کسی گنج ہائے گرانمایہ سے کم نہیں۔ان کے مطالعے سے مظہر امام کی ادبی شخصیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔سب سے پہلے ڈاکٹر امام اعظم کا مقدمہ 'مظہر امام شخصیت اور فن' وقیع اور معلوماتی ہے جو قاری کے مطالعے میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔جس میں تاریخی پس منظر کے ساتھ خاندانی انتساب بھی شامل ہے۔ان کے جدِ امجد شیخ المشائخ مولانا مدار بخش ساکن صوبہ پنجاب (غیر منقسم ہندوستان) سے لے کر مظہر امام تک کے سفر حیات اور حالات زندگی قلم بند ہیں۔ایک خاندانی شجرہ ہے جو نئی معلومات فراہم کرتا ہے۔

یہ مقدمہ ایک مختصر مگر جامع مظہر امام شناسی کا مرقع ہے۔ یہ مقدمہ تقریباً 48/

صفحات پر مشتمل ہے جس سے قاری کے علم میں خصوصی اضافہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مظہر امام پر آل احمد سرور، پروفیسر ظفر احمد نظامی، ابوالکلام قاسمی، مناظر عاشق ہرگانوی، مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، انتظار حسین اور ڈاکٹر امام اعظم کے پرمغز اور معلومات سے بھرے مضامین بھی شامل ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی اہم ہیں جن میں مظہر امام کی رمز شناسی، خاکہ نگاری، احتجاج پسندی، کج کلاہی، تنقیدی بصیرت اور دیگر صلاحیتوں کا خوبصورت احاطہ کیا گیا ہے۔ دلیپ کمار سے انٹرویو اور آزاد غزل پر تنقیدی تبصرہ بھی ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

مظہر امام ستمبر 1951 تا دسمبر 1958 کلکتہ میں درس و تدریس اور صحافت سے وابستہ رہے۔ کتاب کے مضامین کافی معیاری ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضمون 'مظہر امام: الفاظ کے رمز شناس' میں ان کی مرصع سازی' لفظی پیکر تراشی اور معنی آفرینی کی مدبرانہ جستجو کی ہے۔ ان کے درد و داغ، سوز و ساز اور شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ 'آتی جاتی لہروں' کے حوالے سے بھی بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کو ایک رچا ہوا ذوق اور شگفتہ اسلوب کا حامل ٹھہرایا ہے۔ کلاسیکی سرمائے اور فکر و فن کے نئے میلانات کو بھی تلاش کیا ہے۔ ان کی شخصیت میں شائستگی' ذوق سلیم اور درد مندی کے اوصاف بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 'زخم تمنا'، 'رشتہ گونگے سفر کا' اور 'پچھلے موسم کا پھول' میں غزل کی آبرو اور کشمیر کی فردوسی فضا کی رنگینی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان غزلوں کا مقام اور مرتبہ بھی طے کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کی ترتیب و تشکیل میں ڈاکٹر امام اعظم نے واقعی کافی محنت کی ہے اور جس کے بھی مضمون کا انتخاب کیا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ اس سے ان کی دور اندیشی اور ادب شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تو اور بھی غیر معیاری مضامین سے کتاب کی ضخامت میں اضافہ کر سکتے تھے مگر انھوں نے خود کو سستی شہرت سے محفوظ رکھا ہے اور سہل پسند ہونے سے بچایا بھی ہے۔ اس کے لیے وہ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

سارا شہر غزل کہتا ہے

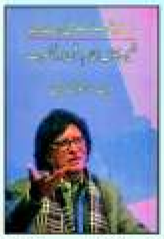

(شین کاف نظام: فن اور شخصیت)

مرتب: ڈاکٹر نثار راہی

صفحات: 288، قیمت: 550 روپے، سال اشاعت: 2019

ناشر: سٹرنس سوسائٹی فار ایجوکیشن جودھپور (راجستھان)

مبصر: ڈاکٹر اسد رضا، F-97 سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی-25

زیر بحث کتاب اردو کے منفرد لب و لہجے کے معروف شاعر اور مستند ادیب معتبر ناقد اور محقق شین کاف نظام کے فن اور شخصیت کا احاطہ کرتی ہے۔ مرتب ڈاکٹر نثار راہی نے کتاب کو کئی ابواب میں تقسیم کیا ہے مثلاً باب اول میں نظام صاحب کی شاعری سے متعلق مضامین ہیں تو دوسرے باب میں ان کی نثر کے بارے میں مشاہیر اردو کے مضامین پیش کیے گئے ہیں جبکہ تیسرے باب میں نظام صاحب کی شخصیت سے متعلق دو مضمون ہیں۔ چوتھے باب میں شین کاف نظام سے لیے گئے انٹرویو ہیں تو پانچویں باب میں ایک ملاقات بہ تفصیل تذکرہ ہے۔ چھٹے یعنی آخری باب میں اردو کے مایہ ناز قلم کاروں کے نظام صاحب کے بارے میں تذکرہ، مقدمہ اور تبصرے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اردو کے اس اہم شاعر اور ادیب کی مختلف اہم ادبی، سیاسی و سماجی ہستیوں کے ساتھ یادگار تصاویر ہیں۔ مرتب ڈاکٹر نثار صاحب نے اس کتاب کو محترمہ کملا جی بستا کے نام نامی سے منسوب کیا ہے۔ 'اپنی بات' کے زیر عنوان نثار راہی نے نظام صاحب سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ بعد ازاں شین کاف نظام کے سوانحی کوائف دیے گئے ہیں۔

نظام صاحب کی شاعری سے متعلق مضامین میں مخمور سعیدی، کالی داس گپتا رضا، عبدالاحد ساز صادق، محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر فاروق بخشی، ارشد عبدالحمید، ڈاکٹر نثار راہی، وسیم بیگم، محمد شاہد پٹھان، عادل رضا منصوری اور پرمود شاہ نفیس کے پرمغز، بیباک اور فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے شین کاف نظام کے فن و شخصیت کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مستند ادیب اور معروف شاعر مخمور سعیدی اپنے مضمون 'حدوں کو توڑتا نغمہ، شین کاف نظام' میں تحریر فرماتے ہیں' شین کاف نظام کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری کی بھی کئی جہتیں ہیں، وہ روایت کے تسلسل کو قبول کرتے ہیں لیکن تسلسل کو تجدید کے منافی نہیں سمجھتے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اپنی روایت سے مکمل باخبری اور محرمانہ شناسائی ہی جدت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ نظام کی شاعری اس پر مہر تصدیق ثبت کرتی نظر آتی ہے۔ ان کا ذہنی سفر ماضی بعید سے شروع ہو کر ماضی قریب سے گزرتا ہوا زمانہ حال تک پہنچا ہے اور اس لمبے سفر کے مشاہدات و تجربات نے انھیں جو نگاہ دی ہے وہ مستقبل میں بھی بہت آگے تک دیکھ سکتی ہے''۔

ماہر غالبیات و معتبر ناقد کالی داس گپتا رضا اپنے مضمون 'جودھپور کے نظام الملک' میں شین کاف نظام کی شاعری کے محاسن بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ''نظام کے یہاں تازگی تو بہر حال ہے ہی مگر ان کی غزلوں میں ردیف بھی ایک خاص پارٹ پلے کرتی ہے۔ وہ عموماً ایسی ردیف کو چنتا ہے جو اس غزل کا عنوان بن کر غزل کو قریب بہ نظم کر دیتی ہے لیکن تغزل کی شان برابر قائم رکھتی ہے''۔

نظام صاحب کی نثر سے متعلق مضامین میں سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر رفعت اختر، اشراق الاسلام ماہر اور ڈاکٹر رئیس احمد نے اظہار خیال فرمایا ہے۔ سلمان اطہر جاوید اپنے مضمون ''شین کاف نظام کی تحقیق و تنقید نگاری میں لکھتے ہیں۔'' شین کاف نظام کا اردو شعر و ادب بالخصوص کلاسک کا مطالعہ خاص گہرائی و گیرائی کا حامل ہے اور اردو ہی نہیں فارسی اور ہندی شعر و ادب ہی نہیں سنسکرت شعریات پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔ اس وجہ سے وہ تخلیق کو ایک وسیع تناظر میں آنکتے تجزیہ کرنے اور تحقیق ہو کہ تخلیق اس کا حق ادا کرتے ہیں۔'' اسی طرح ڈاکٹر رفعت اختر خاں اپنے مضمون ''عالمی تناظر میں اردو تنقید اور راجستھان رشین کاف نظام'' میں لکھتے ہیں۔'' نظام نہ صرف قد آور شاعر کا نام ہے بلکہ تنقید کے شعبہ میں بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے امتزاج سے عبارت ہے۔ کسی بھی تخلیق کے تجزیہ میں موصوف سائنٹفک نظریہ اپناتے ہیں۔ ان کی نظر میں جدید یا جدیدیت شجر ممنوعہ نہیں بلکہ نئے موسموں کی نئی فصل کا نام ہے۔ نظام بنیادی طور پر فیصلہ اور تعین قدر کو تنقید کی اساس سمجھتے ہیں''۔

زیر نظر کتاب میں نظام صاحب کی شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر نثار راہی اور ڈاکٹر سریتا جوشی کے مضامین بھی پر مغز اور پر فکر ہیں۔ شاعر و ادیب نعمان شوق، پروفیسر محمد زماں آزردہ اور خالد علوی کے انٹرویو بھی زینت کتاب بنے ہیں۔ 'اگیے'، نند کشور آچاریہ، شافع قدوائی، انور سدید، محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر ثاقب رضوی، بشیر بدر اور سیفی سرونجی وغیرہ نے نظام صاحب کی کتب میں مقدمے، تذکرہ اور تبصرے لکھ کر اس اہم شاعر و ناقد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ رسالہ شاعر نے بھی 'ناد' پر تبصرہ کرتے ہوئے نظام صاحب کے فن و شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر نامور سنگھ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، کمار پاشی، انور سدید، پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، ندا فاضلی، بلراج

کول، جوگندر پال، پروفیسر وہاب اشرفی اور پروفیسر صادق جیسے مشاہیر نے بھی شین کاف نظام کی شعری، تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کو سراہا ہے۔ کتاب کے آخر میں 37 یادگار تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

کمپوزنگ اور طباعت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب دیدہ زیب ہے۔ لہٰذا توقع ہے کہ اردو دنیا بالخصوص نظام صاحب کے چاہنے والے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔ اردو کی ہر لائبریری میں ڈاکٹر نثار راہی کی مرتب کردہ یہ کتاب ہونی چاہیے۔

شاخسار کے اداریے اور تبصرے (ادبی تنقید)

مصنف: کرامت علی کرامت

صفحات: 311، قیمت: 300 روپے

ناشر: انشا پبلی کیشنز، کلکتہ 73

مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ریسرچ فیلو

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی 25

اردو ادب میں کرامت علی کرامت کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نثار، تنقید و تذکرہ نگار کے ساتھ ایک ادبی سرجن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کو پڑھ کر خیالات میں ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے مصنف کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں طلوع سحر (1961)، آب خضر (1963)، شعاعوں کی صلیب (1972)، اضافی تنقید (1977)، لفظوں کا آسمان (1984)، شاخ صنوبر (2006)، نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (2009)، گل کدۂ صبح و شام (2016) وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں 1990 میں انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ "The Story of the way and other poems" کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

زیر نظر کتاب 'شاخسار کے اداریے اور تبصرے' کے متعلق سب سے پہلے یہ عرض کردوں کہ اس کتاب میں مصنف نے ان تمام اداریوں اور تبصروں کو یکجا کر دیا ہے جو جون، جولائی 1965 سے مئی 1973 تک اڑیسہ سے نکلنے والا رسالہ 'شاخسار' میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں کرامت علی کرامت کے چند تبصرے ایسے بھی شامل ہیں جو 'شاخسار' کے علاوہ دیگر رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ رسالہ 'شاخسار' کے مدیر اعلیٰ امجد نجمی صاحب تھے، جو شاعر ہونے کے ساتھ ادب کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے تھے۔ 'شاخسار' میں 'نقش اول' کے نام سے جو اداریے تحریر کیے گئے وہ ان ہی کے قلم کا نتیجہ ہیں، لیکن مشترکہ شمارہ 25-24، 1969 سے اداریے کی ذمہ داری کرامت علی کرامت نے سنبھالی اور اداریے کا عنوان 'نقش اول' سے بدل کر 'میرا صفحہ' کر دیا گیا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے بیشتر تبصرے بھی کرامت علی کرامت کی جنبش قلم کے مظہر ہیں۔

رسالہ 'شاخسار' بنیادی طور پر جدیدیت کا علمبردار تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس رسالے نے ان جدیدیوں پر جو بے راہ روی کے شکار ہو رہے تھے سخت تنقید کی۔ اس سے رسالے کی غیر جانب داری کا شدید احساس ہوتا ہے۔ احتشام حسین نے جب دوبارہ ترقی پسند تحریک کو زندہ کرنے کی کوشش کی تو اس پر طنز کرتے ہوئے امجد نجمی نے رسالے کے اداریے میں لکھا:

"...ترقی پسند تحریک کے تعطل کے بعد اب جب کہ اس کی جگہ اردو میں جدیدیت نے لے لی ہے، پھر سے ترقی پسند تحریک کو زندہ کرنے کی تجویز 'ساز بے ہنگام' نہیں تو اور کیا ہے؟"

ایک اداریے میں کرامت علی کرامت نے 'غزل' اور 'اینٹی غزل' کے متعلق چند قلم کار کے خیالات نقل کرتے ہوئے اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ 'غزل' اور 'اینٹی غزل' کے مابین کیا فرق ہے اور قارئین کے درمیان کس قسم کی غلطیاں راہ پا گئیں ہیں۔ علاوہ ازیں اس رسالے میں شائع ہونے والے اداریوں میں ہندوستان میں منعقد ہونے والے ادبی سیمینار، موجودہ زمانے میں اردو کی صورت حال، اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے حکومت کی طرف سے ملنے والے عطیات وغیرہ کا ذکر ہوتا تھا۔ ایک اداریے میں پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے انتقال پُر ملال پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خدمات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ میرے علم کے مطابق 'شاخسار' میں شائع ہونے والے تمام اداریوں میں یہ سب سے طویل اداریہ ہے۔

زیر تبصرہ کتاب چوں کہ شاخسار کے اداریے اور تبصرے پر مبنی ہے۔ اس لیے کتاب کے ایک حصے میں اداریے اور دوسرے میں تبصرے کا التزام رکھا گیا ہے۔ شاخسار میں جو تبصرے شائع ہوئے ان میں یحییٰ پریمی (خلش)، ساحل مانک پوری (آپ کی غزلیں)، عنوان چشتی (ذوق جمال)، مظفر حنفی (پانی کی زبان، تیکھی غزلیں)، ندا فاضلی (لفظوں کا پل)، بشیر بدر (اکائی)، مخمور سعیدی (سیہ بر سفید)، کیف احمد صدیقی (دلچسپ نظمیں) وغیرہ کے مجموعہ کلام شامل ہیں۔ نثری کتابوں میں غالب نمبر (شبستان)، تجسس اعجازی (غالب تصویر کا دوسرا رخ)، امام مرتضیٰ نقوی (اردو ادب میں سکھوں کا حصہ)، علی گڑھ میگزین (1970) وغیرہ پر تبصرے کیے گئے۔ سب سے طویل تبصرہ شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد کی کتاب 'نئے نام' پر کیا گیا تھا جو نئی شاعری کا ایک انتخاب تھا۔ کتاب کے آخر میں چند تبصرے ایسے بھی شامل ہیں جو شاخسار میں تو شائع نہیں ہوئے لیکن کرامت علی کرامت کے ہی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ (صادق)، روشنی کے پھول (انور مینائی)، اگلی عید سے پہلے (آنند لہر)، پس دیوار حرف (فضا ابن فیضی)، گم گشتہ (اعجاز عسکری) وغیرہ شامل ہیں۔

رسالہ 'شاخسار' نے 1965 سے 1973 تک جس طرح جدید ذہن کی آبیاری کی، اس کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا اپنی کم نصیبی ہے۔ یہ کتاب بھی جو اسی رسالے کے اداریوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے موجودہ دور کے قارئین کے لیے بیش قیمت سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے ایسے قارئین کے نام کیا ہے جو جدید شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ فہرست سے پہلے رشید احمد صدیقی کا ایک خط شامل ہے جس میں شاخسار کی کامیابی پر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی پشت پر رسالہ 'شاخسار' کے متعلق قاضی عبدالودود، علی جواد زیدی، خلیل الرحمٰن اعظمی، علی عباس حسینی کی آرا شامل ہیں۔ مختصر طور پر مصنف کی اس کتاب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کے سرمائے میں یہ ایک مثبت اضافہ ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مصنف کی اس کتاب کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

فکشن

سہ شب کا قصہ

مصنف: ناصر راہی

صفحات: 144، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: کتاب دار، ممبئی

مبصر: طارق سہراب غازی پوری

B-2، مجیب پارک، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

ناصر راہی کے افسانوں مثلاً گریہ شیشہ، مرد خدا، رات کا آخری پہر، تھوک،

چھومنتر، سہ شب کا قصہ وغیرہ کے غائرانہ مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راہی صاحب کو انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے وہ کردار کی ذہنی تہوں کو آہستہ آہستہ نمایاں کرتے ہیں جس سے اس کی مکمل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ان کے بعض افسانوں مثلاً رات کا آخری پہر، بھوت آتا ہے، شبھ راتری، بلی لوٹن وغیرہ میں واقعات کی نفسیاتی طوالت تو ہے مگر انشائیہ میں جھول پیدا نہیں ہوتا اور قاری تجسس کی دنیا میں پورے مضمون کو پڑھتے ہوئے اس کے ماحصل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

راہی کے افسانے قاری کو ایک نئے انداز میں سوچنے کے لیے کبھی کبھی طلسماتی دنیا کی سیر کراتے ہوئے حیرت زدہ کر دیتے ہیں لیکن وہ ذائقے اس قدر لذیذ ہوتے ہیں کہ وہ (قاری) ان لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے انھیں اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ راہی کے افسانے انسانی زندگی میں ہونے والے واقعات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر راہی کا افسانہ 'سہ شب کا قصہ' قصوں کی کسوٹی پر اگر پرکھا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ سہ شب یعنی تینوں راتیں ابوخان دارا کی افسردگی کے عالم میں بسر ہوتی ہیں۔ اس افسانے کی گتھیاں پر پیچ ہونے کے ساتھ ہی طلسماتی بوالعجبی سے پر ہے تاہم قاری افسانے کی کلیدی عبارتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے اس کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگاتا کہ افسانہ نگار کے کہنے کا ماحصل کیا ہے۔ اس افسانے کے ایک اہم کردار پر نظر ڈالیں کہ کس طرح افسانہ نگار 'ناصر راہی' نے اسے ادبیت کا اسلوبی جامہ پہنایا ہے۔

یک شب، اس یک شب میں ابوخان دارا جس قدر اذیت اور استعجابی عمل سے گزرا تھا، اسی قدر اپنی متجسس آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لینا چاہتا تھا جس کے لیے وہ باہر آیا تھا مگر اوسر میں پھیلے ہوئے اندھیرے کہرے اس کے اس عمل میں مانع آئے تھے۔ اسی یک شب میں تو اس نے جانا کہ رات اندھیرے میں اس کے بیٹے عموخان کے غائبانے میں کوئی آتا ہے جسے وہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ گہری دھندلی یخ بستہ رات نے اس کے خدوخال پر پردہ ڈال دیا تھا ورنہ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کے علاوہ اوسرے کسی کے گزرنے کی آہٹ بھی تو اس نے وہاں سنی تھی۔

آخر کون ہے وہ؟ آتا کدھر سے ہے اور رہتا کہاں ہے وہ؟ یہ راز یخ بستہ شب کے سینے میں ابھی پوشیدہ تھا۔"

اس قصے میں پہلی شب کے بعد دوسری شب ابوخان دارا اپنے بیٹے عموخان سے محو گفتگو ہوتا ہے لیکن تیسری (سہ) شب تجسس کی دنیا میں ایک بھونچال آجاتا ہے۔ ابوخان کی بے قراری اور بڑھ جاتی ہے جب گذشتہ رات کی طرح نہایت عمدگی سے دروازے پر پے در پے تین دستک ہوئی۔ پٹ کھلے اور دستک دینے والا شخص کمرے کے اندر چلا گیا۔

اور پھر دیکھیں اس آدمی کے داخل ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے:

"میرے ہاتھ پر ہاتھ دے کر آگے پلنگ کی طرف بڑھو" کمرے میں نسوانی آواز ابھری۔

اب وہ دونوں پلنگ پر جا بیٹھے تھے۔

"تم نے لیمپ کیوں نہیں جلایا!" دستک دے کر آنے والا آدمی سرگوشی میں بولا۔

"گناہ مجھے اجالے میں پسند نہیں" عورت بولی "مگر تمھاری سانسیں کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی ہیں۔"

مذکورہ افسانے میں افسانہ نگار کی خوبی کہی جائے گی کہ اس نے اس طرح کی سماجی برائی کو تاریکیوں کی گھنگھور تاریک فضا میں بیان کیا ہے تاکہ خلوت کی جلوہ نمائی نہ ہو۔ اس افسانے کی جسامت جو بھی ہو مگر صحیح بات یہ ہے کہ سماج کی جو برائیاں ہیں اسے ایمانداری کے ساتھ ظاہر کرنے کی بھی تو کوئی کوشش نہیں کرتا اور شاید کہ افسانہ نگار کا مقصد یہی ہو کہ سماج کی آلودگی کو ظاہر کیا جائے تاکہ لوگ اس سے اجتناب کریں۔

افسانہ نگاری میں اسلوبی کشش کی اپنی ایک الگ پہچان ہے اور راہی صاحب کی افسانوی ادبیت کے یہ اسلوب جگہ جگہ نمایاں ہیں مثلاً آپ کے افسانہ 'القصہ' میں اس کلیدی جملے پر غور فرمائیں کہ اس میں قارئین کو مائل کرنے کی کتنی کشش ہے:

"رفتہ رفتہ رات سناٹے کے حصار میں سمٹ آئی تو قطب مینار پر روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا؛ کوئی روشن شبیہ تھی، سر پر سبز سنہرے تاروں کی روشنی پگڑی اور بدن پر ہلکی سبز چادر۔ کوئی فرشتہ تھا کیا، معاً وہ قطب صاحب کی بلند چوٹی سے اڑا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر پر پہنچ گیا۔"

اس طرح ایک تو جملوں کی لطافت پر غور فرمائیں اور دوسری طرف یہ بھی دیکھیں کہ کس پس منظر میں افسانہ نگار نے یہ باتیں کہیں۔ ہندوستان میں آئے دن ہندو مسلمان کو مختلف زاویے سے آنکا جاتا ہے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد جن کا تذکرہ اس افسانے میں کر کے افسانہ نگار نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اتحاد و یگانگت کے پیکر مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان میں جو اتحاد کی عمارت تعمیر کی ہے اسی کی چھت کے نیچے ملک کو سکون میسر ہوگا اور ملک ہندوستان اسی کے اتحادی دروازوں سے گزر کر ترقیوں کی جانب گامزن ہوگا۔

المختصر یہ کہ ناصر راہی کے افسانے موجودہ دور کے سماج کی تصویر کشی کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے لیے یہ کہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

شاعری

ماحول کی خوشبو (بچوں کے لیے نظمیں)

شاعر: متین اچل پوری

صفحات: 128، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: رحمانی پبلی کیشنز 1032 انصار روڈ، اسلام پورہ، مالیگاؤں

مبصر: ماریہ سعید، نزد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ 276121

ماحولیاتی آلودگی ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے جو دراصل فطرت سے چھیڑ چھاڑ اور ترقی کی دوڑ میں آگے رہنے کی دھن میں کثافت کو فروغ دینے کا نتیجہ ہے۔ کارخانے کے دھویں، گاڑیوں کے شور اور پانی کے ذخائر کی گندگی کے سبب فضائی، صوتی اور آبی آلودگی وجود پذیر ہوئی ہے۔ یوں ساری فضا زہر آلود ہو رہی ہے۔ متین اچل پوری حساس دل رکھنے والے شاعر ہیں جنھوں نے ماحولیاتی آلودگی کے خلاف مہم چھیڑ رکھی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص بالخصوص نئی نسل کے بچے اس مہم کا حصہ بنیں اور فضائی آلودگی کے انسداد کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ایک تخلیق کار ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داریاں بطریق احسن نبھا رہے ہیں اور اس کار خیر میں شریک ہیں۔

'ہم ماحول کے رکھوالے' اور 'ماحول نامہ' کے بعد 'ماحول کی خوشبو' انسداد کثافت کے خلاف تیسری کاوش ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان نظموں میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اپنے اردگرد کی گندگی کو ہٹانے کے ساتھ ساتھ اپنی فکر، رجحان اور کردار کی غلاظت کو بھی دور کیجیے۔ تن صاف اور من صاف ہوگا تبھی دیگر آلودگیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ان کا ایقان ہے کہ ماحول کے ساتھ اندرون بھی صاف رہے، اخلاقی برائیوں سے دوری رہے سماج میں پنپنے والی خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم راسخ ہو تبھی ہم کامیاب ہو سکتے

ہیں اور ملک وقوم کو ترقی دے سکتے ہیں۔ وہ اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

خوشبو ہو ماحول میں بھائی   شہد ہو اپنے بول میں بھائی
ہولب پہ مسکان بھلی سی   پاکیزہ ادھ کھلی کلی سی
آنکھ سے اپنی کرن سی پھوٹے   کھل جائیں دل میں گل بوٹے

انھوں نے جابہ جا اخلاقی اقدار کو فروغ دینے والی باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے جسے وہ خوشبو سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

خوشبو ہے اچھائی کی   اچھائی ، سچائی کی
خوشبو یہ کردار میں ہو   مفلس میں، زردار میں ہو
روشن کردار ایسا چاند   گھٹتا نہیں، پڑتا نہیں ماند
خوبی یہ اعمال میں ہو   ہرجا ہو، ہر حال میں ہو

سچ اور جھوٹ کی جنگ میں دونوں خود کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر جتلاتے ہیں۔ اس کی منظرکشی ان اشعار میں دیکھیے۔

جھوٹ کا کالا کالا چہرہ ہے   تاج سر پہ مگر سنہرا ہے
بات کرتا ہے سخت لہجے میں   خوب کڑوے کرخت لہجے میں
جھوٹ سب داؤں پیچ جانتا ہے   ظلم کو اپنا بھائی مانتا ہے
روپ سچ کا مگر نرالا ہے   ہرکہیں اس کا بول بالا ہے
نور چہرے سے پھوٹ پڑتا ہے   جھوٹ جب اس پہ ٹوٹ پڑتا ہے
میٹھی بولی سے رام کرتا ہے   جھوٹ کو زیر دام کرتا ہے

اس پٹارے میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اچھی کتاب، ماں باپ، محنت، مٹکے کا پانی، ڈھیلا ڈھالا لباس، نیک ارادے، مسکراہٹ، میٹھے بول، ہمدردی، صدقہ، متوازن غذا، سادگی وغیرہ۔ سب سے قابل ذکر 'چالیس حدیثیں' جن کے موضوعات ہیں۔ علی الصبح بیداری، سلام، طہارت، وضو، نماز، دعا، تلاوت، روٹی کا احترام، بازار میں کھانے پینے سے گریز، پانی پینے کا درست طریقہ، حصول علم، حیا، صفائی، والدین اور چچا و خالہ کا احترام، پڑوسی کا حق، بڑوں کا ادب، بھائی چارگی، شیریں کلامی، بدزبانی، خوش خلقی، رحم دلی، معافی، غرور، عاجزی، ہنسی، سچائی، جھوٹ، غصہ، غیبت، چغلخوری، صبر، امانت داری، وعدہ، سخاوت، بخالت، رات کا کھانا، عمل، رات میں باوضو سونا۔ آخر میں علم وعمل پر گفتگو اور بچوں کے لیے کارآمد نصیحت۔

علم کی ساری شان عمل سے   اس پتلے میں جان عمل سے
علم ایسا جو نور ہو دل کا   داغ عمل سے دور ہو دل کا
علم وعمل کا اک اک خوشہ   اپنے سفر کا آخری توشہ

ڈرامے

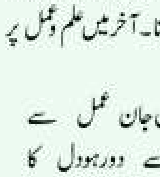

روشن اندھیرے

مصنف: خورشید نواب
صفحات: 264، قیمت 164 روپے
ناشر: اپلائڈ بکس، دہلی
مبصر: نورالصباح ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'روشن اندھیرے' ڈراموں کا مجموعہ ہے جو پانچ ڈراموں پر مشتمل ہے جن کے نام یوں ہیں۔ 'ہم خیال'، 'نہ تم بے وفا ہو'، 'رستے ہوئے رشتے'، 'روشن اندھیرے' اور 'خون کے آنسو'۔ اس میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرازی کے مقدمہ کے ساتھ ساتھ خود خورشید نواب کا پیش لفظ شامل ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے تخلیقاتی سفر میں بیان کرتے ہوئے، اپنی تخلیقات کے لفظ لفظ کو بوند بوند اور ساگر ساگر کا نام دیا ہے جو خود ان کی عمیق قلبی کی مظہر ہے۔ موصوف ایسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جو آزادی سے قبل راجپوتانہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ یہ ایسی زرخیز زمین ہے جہاں 'ناٹک گھروں' نے بھی اپنا مقام بنالیا ہے اور وہاں سے ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے۔ اردو ڈرامہ پارسی ارباب کی سرپرستی میں چڑھا ان کی ہی سرپرستی میں بڑی بڑی کمپنیاں اور تھیٹر وجود میں آئے ان کے قصے دیو مالا اور قرون وسطی کی داستانوں اور شیکسپیئر کے ڈراموں پر مبنی ہوتے تھے۔ اردو ڈراموں کے سب سے اہم مرکز ڈھاکہ اور ممبئی تھے۔ آزادی کے بعد راجستھان میں بھی اردو ڈرامے کی ابتدا ہوئی۔ معدودے چند ڈرامہ نگار ایسے تھے جو اسٹیج پر بھی ڈرامے کا مظاہرہ کرتے تھے جن میں خورشید نواب بھی شامل ہیں۔ انھیں ابتدا سے ڈرامے کا شوق تھا، فن موسیقی کے بھی دلدادہ تھے اور ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ یہی دلچسپی پروان چڑھی تو ان کا میدان وسیع ہوتا گیا جن میں ریڈیو پلے لکھنا، ایکٹنگ کرنا، غزل وغیرہ کے پروگراموں میں حصہ لینا، قومی ایکتا کے پروگراموں میں حصہ لینا، ناٹکوں میں ڈائریکشن دینا ان کے اہم مشغلوں میں شامل ہوگیا۔ انھوں نے اردو، ہندی اور راجستھانی میں تقریباً 69 ڈرامے لکھے ہیں۔

موصوف اودے پور کی کئی ادبی اور ثقافتی تنظیم سے وابستہ بھی ہیں جن میں ڈائریکٹر ابھینو کلا سنگم، صدر ہمدرد یکتا سنستھان، یگ دھارا ادبی سنگم ہیں۔ وہ ادبی و ثقافتی پروگراموں میں انہماک سے کام لے رہے ہیں جس کی غمازی ان کی زیر نظر کتاب بھی کررہی ہے۔ مجموعے کا پہلا منظوم ڈرامہ 'ہم خیال ہے' جو ایک خوش لحن شاعر کی زندگی پر محیط ہے، جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ ان کی شاعرانہ محفلوں میں چند نسوانی کرداروں کی آمد ہوتی ہے۔ جس میں نزاکت حسن میں سب سے یکتا ہے۔ شاعر صاحب اور وہ دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہوجاتے ہیں، مگر ایک تاجر کی آمد ان دونوں کے رشتوں کے کھوکھلے پن کا مظاہرہ کردیتی ہے جس کی وجہ سے شاعر کا دل پاش پاش ہوجاتا ہے اور رند بلانوشی میں گرفتار ہوکر اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نزاکت کی سہیلی ترانہ انسانیت کے تحت اس اسیر محبت کو سنبھالتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔

اسی طرح 'رستے ہوئے رشتے' میں ایک ماں کی محبت کے ذریعہ انسانیت کا درس دیا ہے کہ کس طرح قومی یکجہتی قائم کرکے انسانیت کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ 'روشن اندھیرے' میں انٹر کاسٹ شادی کو پیش کیا ہے جو موجودہ عہد میں ایک فیشن کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ مگر اس کے پس پردہ صنف نازک کے ان غلط اقدامات کو پیش کیا ہے جو وہ بنا سوچے سمجھے اٹھالیتی ہیں اور کسی اجنبی پر اعتماد کرکے اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑ کر ان سے ملاقات کی خواہش میں دوسرے وطن چلی جاتی ہیں اور پھر کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا ان کا مقدر بنتا ہے۔

مذکورہ ڈرامے میں لو جہاد کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں جہاں مسلم معاشرے پر یہ الزام تراشیاں کی جاتی ہیں کہ وہ لوگ غیر مسلم لڑکیوں کو ورغلا کر ان سے شادی کرتے ہیں مگر ان شادیوں کی وجوہات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کا سبب بنتی ہیں۔ موصوف نے اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرتی برائیوں کی بیخ کنی کی ہے۔ مسائل سے پردہ اٹھایا ہے اور اسے سلجھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ اسی طرح 'خون کے آنسو' کے ذریعے معاشرے میں پھیلنے والی غلط فہمیوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے اکثر

ڈراموں میں ہندو مسلم کردار نظر آتے ہیں جس کا مقصد ہندو مسلم کے درمیان پنپ رہی دشمنی کو ختم کرنا ہے۔ جو غلط فہمیوں کی وجہ سے در آئی ہیں۔ اپنی تخلیقات کے ذریعے سے انھوں نے حل بھی تلاش کیا ہے اور اس کا ازالہ بھی پیش کیا ہے۔ اگر ان کے ڈراموں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے نکات نظر آئیں گے جو ہندو مسلم کے مابین ناچاقیوں کا سبب بنے، اگر ڈرامہ اسٹیج کیا جائے تو غلط فہمیوں کے ختم ہونے کا امکان پیدا ہو، ذہن و دل کے درمیان ہم آہنگی ہونا ممکن ہو، خیالات وسیع ہونے کا ایقان ہو، نظریات ایک دوسرے کے حق میں ہوں۔

آخر میں رہی بات کچھ کتاب کے بارے میں کہ کہیں کہیں جملوں میں بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔ اور مقدمے کے حوالے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ سرورق عمدہ ہے جو عنوان کے مطابق ڈھلتے ہوئے سورج پر مبنی اندھیرے اجالے کی عکاسی کرتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ ابھی بھی معاشرتی افراد غلطیوں کو سمجھ کر ان کا ازالہ کر کے دنیا کو روشن کر سکتے ہیں۔

رسائل و جرائد

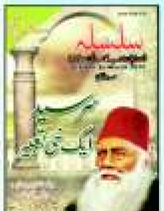

سہ ماہی ادب سلسلہ

مدیر: محمد سلیم (علیگ)

جلد: 4، شمارہ: اکتوبر تا مارچ 2019

صفحات: 364، قیمت: -/500 روپے

مبصر: مبشر عالم، 275/6، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی 92

اللہ تبارک تعالیٰ نے انسان کو اظہار مافی الضمیر کے لیے جو ذرائع و وسائل عطا کیے ہیں ان میں سب سے اہم و ممتاز تحریر ہے۔ اسی کے وسیلے سے انسان اپنے خیالات و تاثرات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ادب سلسلہ ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ہے جو بے باکی کے لیے مشہور ہے۔ تازہ شمارہ سرسید پر تحریری سلسلہ ہے، جسے مدیر نے 'سرسید ایک نئی تعبیر' کے عنوان سے شامل اشاعت کیا ہے۔ اردو زبان کے قلمکاروں نے رسالے کی زینت کو بڑھایا ہے۔ مذکورہ رسالہ 9 ابواب پر شامل ہے۔ پہلا باب مضامین کا ہے جس کا عنوان 'سرسید ایک نئی تعبیر' ہے۔ اس باب میں 27 مضامین شامل ہیں جس کے قلمکاروں میں اختر الواسع، شافع قدوائی، صغیر افراہیم، علی احمد فاطمی، حقانی القاسمی، مظفر حسین سید، شہپر رسول، آفتاب احمد آفاقی، مولا بخش، سید لطیف حسین کاظمی، ڈاکٹر سید احمد قادری، صاحب علی، ڈاکٹر راحت ابرار، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر مشتاق صدف، جاں نثار معین، محمد عباس دھالیوال، پرویز نذیر، ڈاکٹر عبدالحی، محمد قمر عالم، ایم جے وارثی، محمد تاج الدین، ندیم احمد انصاری، محی الدین زور، جاوید دربھنگوی، ابراہیم افسر اور عمران عظیم ہیں۔ تمام قلمکاروں کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سبھی کی تحریریں متنوع اور ہمہ جہت صفات کی حامل ہیں۔ ان کے یہاں تعلیم و ادب و افکار کی غمازی سبھی مضامین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ سرسید پر سبھی فنکاروں کی گہری نظر ہے۔ پروفیسر شہپر رسول اپنے مضمون 'عہد حاضر میں سرسید کی معنویت' پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب ہم 19 ویں صدی کے ہندوستان کو دیکھتے ہیں اور ان شخصیات پر غور کرتے ہیں جنہوں نے ماضی پر نظر کرنے، حال کی صداقتوں اور پیچیدگیوں سے نبرد آزما ہونے اور مستقبل کے اسرار کا مطالعہ و تجزیہ کرنے کے لیے زاویوں اور منفرد طریقوں سے روشناش کر دیا تو ان میں سرسید احمد خاں ہمیں بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں اور ان کے مطالعہ کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح نوجوان قلم کار عمران عظیم تعمیری فکر و نظر کے حامل اہل قلم ہیں۔ ان کی وسعت علمی اور مطالعاتی گہرائی کا ثبوت ہیں۔ وہ اپنے مضمون "انیسویں صدی کی ایک منفرد آواز: سرسید احمد خاں' میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

17 اکتوبر 1817 ہندوستانی تاریخ میں اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا دن ہے کہ اس تاریخ کو ایک عظیم رہنما کی ولادت دہلی کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس عظیم ہستی کا نام سید احمد تھا۔ سید احمد کے والد ماجد کا نام اسم گرامی میر متقی تھا۔ سید احمد نے جہاں خود اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہاں سن شعور کو پہنچ کر انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات کو دیکھ کر ان کو تعلیمی پستی سے نکال کر انہیں جدید علوم و فنون سے مستفیض کرنے کا خیال اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔ ابتدا میں سید احمد ضروریات زندگی کو پورا کرنے آخر کار اس مقام کو پہنچ گئے جہاں انہوں نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا ہے چنانچہ سید احمد نے ایم، اے، او، کالج علی گڑھ میں قائم کیا۔ اسی طرح بہت سی شخصیات کے مضامین طوالت کے خوف سے سپرد قلم نہیں کیے جا سکتے۔

دوسرا باب نیا قلم نئی روشنائی کے تحت ہے جو دس مضامین پر شامل ہے۔ جس کے قلم کار صالحہ صدیقی، عزہ معین سنبھلی، عاتکہ ماہین، شگفتہ پروین، مسرت حمزہ لون، محمد شاہد، محمد فرحان خان، ارشد احمد کوچھے، ریاض احمد اور حارث حمزہ لون ہیں۔ دہلی کی ادبی فضا میں ان قلمکاروں نے جو پھول کھلائے ہیں۔ ان کی خوشبو سے سارا ہندوستان مہک اٹھا ہے۔ تیسرا باب افسانہ ہے۔ افسانہ نگاروں کا گلشن افسانہ گلہائے رنگا رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں شموئل احمد، نعیم جعفری پاشا، انیس رفیع، محمد بشیر مالیرکوٹلوی اور رشدہ شاہین کے افسانے قاری کے دل کو چھونے کا کام کرتے ہیں۔ چوتھا باب بعنوان 'نظمیں' میں ابوبکر عباد، سلیم انصاری اور نسترن احسن کی نظموں نے کافی حد تک متاثر کیا۔ اسی طرح پانچواں باب 'غزلیں' کے عنوان سے پیش کیا ہے اس میں کمار نین اور محبوب خان اصغر کی غزلیں بھی داد و تحسین سے نوازی جانی چاہئیں۔ چھٹا باب شعبہ ہائے حیات ہے جس میں ڈاکٹر ذوالفقار علی اعظمی نے بچوں کی نگہداشت پر خوب لکھا ہے۔

ساتواں باب یاد رفتگاں میں سہیل انجم کا انور جلال پوری پر ہے 'میرا انتظار مت کرنا' یہاں مدیر محترم محمد سلیم کی کم علمی کہوں گا کہ یہی مضمون فروری 2018 کے 'آجکل' رسالے میں شائع ہوا ہے۔ شائع شدہ مطبوعات سے رسالوں کو گریز کرنا چاہیے۔ آٹھواں باب 'تبصرہ' ہے اس میں ساحر داؤد نگری، محمد غالب نشتر اور مبین نذیر مالیگاؤں کے تبصرے ہیں۔

آخری باب خبر نامہ ہے جو صفحہ 335 سے شروع ہو کر صفحہ 356 پر اختتام پزیر ہوتا ہے۔ ادب سلسلہ سرسید احمد خاں کے تحت متعدد مضامین کا حسین مرقع ہے۔ رسالے کا آغاز مدیر محمد سلیم کے اداریہ 'سرسید......ایک نئی تعبیر' سے ہوتا ہے۔ دوسرا صفحہ ڈاکٹر تنویر فریدی (چیف ایڈیٹر کے قلم سے) ہوتا ہے۔ مدیر اور مدیر اعلیٰ دونوں نے رسالے کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ محمد سلیم نئی نسل کے ان پختہ کار صحافیوں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی محنت، جدوجہد، لگن، ریاضت اور جاں فشانی کے ساتھ اردو صحافت میں نام پیدا کیا ہے۔ وہ اس راہ کے مسافر آج ہوئے ہیں جب ایمانداری ہی کامیابی اور اعتبار کرنے کا وسیلہ ہے۔ بزرگان صحافت جن کے نقش قدم پر چل کر ہم اس کارواں میں شامل ہوئے ان سے بھی دعائیں درکار ہیں۔

مختصر تبصرے

تفکرات	ص 158	سنہ اشاعت: 2018
تسلیمات	ص 180	سنہ اشاعت: 2018
مرقع فکر	ص 163	سنہ اشاعت: 2018

شاعر: چمن آہوجہ

ناشر: گلوبل فرٹانٹی آف پوئٹس، گروگرام، ہریانہ

مبصر: زبیر خان سعیدی، سینئر جرنلسٹ ایشیا ٹائمز، ایف 33، شاہین باغ، نئی دہلی 25

جب مجھے چمن آہوجہ کی تین تخلیقات تبصرے کے لیے موصول ہوئیں تو ابتدا میں ایسا لگا کہ یہ بھی عام شعری ونثری تخلیقات کی طرح ہی ہوں گی مگر جب ایک بار پڑھنا شروع کیا تو احساس کچھ مختلف تھا، کئی روز تک مسلسل انھیں پڑھنے کے بعد آج تبصرہ کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

تینوں تخلیقات اپنی نوعیت میں یکتا وجداگانہ اوصاف کی حامل ہیں کہ اگر الگ الگ تبصرہ کرنا شروع کردوں تو کئی سو صفحات بھی کم پڑ سکتے ہیں۔ عنوانات کا تنوع اپنی مثال آپ ہے۔ میں اس وقت 'مرقع فکر' کو 'تسلیمات' کے پیمانے پر قبول کرتے ہوئے اپنے 'تفکرات' رقم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

'تفکرات' کی پشت پر ایک تحریر ہے ''اس مجموعے میں کیا ہے یہ تو پڑھنے پر ہی پتہ چلے گا لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شاعر کی کوشش کچھ ہٹ کر کہنے کی رہی ہے۔ اگر آپ پاپولر قسم کی رومانٹک اردو شاعری کے ہی دلدادہ ہیں تو ہوسکتا ہے یہ کتاب آپ کی جمالیاتی توقعات پر پوری نہ اترے، لیکن اگر آپ کی روشن خیالی کچھ نیا سا پڑھنے کی مائل ہے تو یہ کتاب شاید آپ کے لیے ہی لکھی گئی ہے۔ خود ٹائٹل ہی جذبات کے بجائے تفکرات کی دنیا میں لے جانے کا وعدہ کر رہا ہے۔ دراصل یہ وعدہ تو بت شکنی کی محض ابتدا ہے۔ کم از کم شاعر کا ماننا ہے کہ اس کے معاصرانہ موضوع، اس کا سنجیدہ لب ولہجہ اور کی عروضی پابندیوں اور مقبولیت کے تئیں بے نیازی.. ان سب میں اپنے قسم کی وہ انفرادیت ہے جو کچھ لوگوں کو کج روی لگے گی تو کچھ کو ان میں آزاد تر شاعری کی چنگاری سلگتی مل سکتی ہے!''

شاعر نے تفکرات میں سب سے پہلے اپنی شاعری کو کٹگھرے میں کھڑا کیا ہے۔ رقمطراز ہیں: ''ہوں سوچتا میں اکثر۔ ہے کیا میری شاعری میں، ہاں، مانا، کچھ نہیں ہے! لیکن یہ ایسا کیوں ہے، یہ کیوں نہیں 'پابند' کیوں نہ قافیہ، ردیف؟ عروض سے بے بہرہ، بحر تک نہیں یاں۔ اس میں ہیں بہار۔ نہ مے ہے۔ نہ نشہ ہے۔''

پھر آگے کہتے ہیں اپنے اپنے رس ہیں، پر ہے تو شاعری ہی!

کبھی کبھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے کھو جاتے ہیں۔ ماضی میں اور یاد کرتے ہیں اپنے وہ ایام، جب آغاز کیا تھا شاعری کا۔ جب زعم تھا بڑا کہ اللہ نے بھیجا ہے شاعر بنا کے۔ تفکرات میں شاعری ہی شاعری ہے۔ کہتے ہیں کہ ''ہے آج جو بیکار۔ بن سکتی ہے کل شاہ کار۔''

شاعری کے بعد وہ گرنتھوں کو یاد کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ ''زندگی ہے اب وہ بھی فکر کی دلدل میں'' پھر اپنے وجود کو 360 ڈگری پر پرکھتے ہیں۔ اپنے وجود کو جنموں کا جنجال لکھتے ہیں۔ آواگمن کے چکر کو ایک بے رحم سزا بتاتے ہیں اور فنا کے فضل سے کس طرح چلتی ہے زندگانی اسے ثابت کرتے ہیں۔ تفکرات کی ذیل میں وہ ارتقا کا منتھن کرتے بھی نظر آتے ہیں اور سب سے آخر میں انسانیت اور اشرف المخلوقات کو موضوع بحث بناتے نظر آتے ہیں۔

چمن آہوجہ کی تخلیقات شعری پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اس کا خالق ایک ایسا سوچنے والا ذہن رکھتا ہے جس نے زندگی کے حوادثات کو جھیلے تمام پڑاؤ بہ حسن خوبی پار کیے ہوں اور اب اپنے تجربات کی خوشبو کو آنے والی نسل کے لیے بطور سرمایہ وقف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

چمن آہوجہ کو پڑھنے سے مجھے ایسا لگا کہ وہ ایک شاعر بھی ہیں، مصور بھی ہیں۔ فلسفی بھی ہیں اور ایک عظیم اور جلیل القدر انسان بھی۔

ان کے انوکھے خیالات نثری نظموں کا روپ کس طرح دھار لیتے ہیں وہ آپ اسے پڑھ کر ہی سمجھ پائیں گے۔ ویسے میں اشارۃً بطور جھلک کچھ روپ قارئین کو ضرور دکھاؤں گا۔

دوسری کتاب 'تسلیمات' میں چمن آہوجہ لکھتے ہیں کہ ''جو بھی ہے مجھ کو پڑھتا ہے، ہے احسان مجھ پہ کرتا'' اور عنوانات پر نظر ڈالیں۔ 'وقت آیا فیصلے کا'، 'قسمت ہے ساتھ تیرے'، 'دنیا کے عجوبے'، 'وہ تو غلط تھا ہی، یہ بھی غلط ہے!'

'دنیا یہ الوحانہ!'، 'تو سن لے میرے یارا'، 'میں آدمی ہوں نیارا'، 'میری کی مشکلوں کا کرتا جو سامنا'، 'شب وصل منتظر ہی منتظر ہوتا ہے'، 'منکر رہا عمر بھر، اس میں نہیں ہے شک' اور 'سفید بیچتا ہوں، سیاہ بیچتا ہوں'۔

تسلیمات کے ان عنوانات پر نظر ڈالنے سے ہی شاعر کی وسعت نظری کا بہ خوبی اندازہ قاری کرسکتا ہے۔

ایک بات اور۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف زندگی کے فلسفے اور مشکل موضوعات پر ہی آپ نے اکتفا کیا ہو۔ بچوں کے لیے بھی بطور خاص کچھ اشعار کہتے ہیں۔ جیسے

گر چاہتے ہو لگنا ہمیشہ خوبصورت — بس پہنیے مسکان، نہیں گہنے کی ضرورت
چابی ہے خوشی کی پیار اور شفقت — خوراک آتما کی رحم دلی، مروت

ساتھ ہی کچھ لوک کتھاؤں کو بھی منظوم کر کے آپ نے اپنی کاوش کو مکمل کیا ہے۔

تیسری تصنیف 'مرقع فکر' میں 'سوغات فکر' کے عنوان سے ایک بڑا سوال کرتے ہیں کہ کیا واقعی شاعر ہوں میں، اور کیا یہ پاگل پن ہے؟'

آگے دنیا کو ایک نیلام گھر ثابت کرنے کے بعد روح اور ضمیر کا مقابلہ کرتے ہیں اور اصل کامرانی کی کلید کی طور پر ایک راز سے پردہ اٹھتے ہیں کہ دراصل کامیابی کا کوئی فارمولہ ہوتا ہی نہیں ہے۔

جنگل میں مشینیں چل رہی ہیں، آخر کس کا ارتقا ہو رہا ہے یہ۔ خیالوں کے جنگل میں۔ یہ داد، وہ بے داد۔ ہے کون کس سے اچھا۔ سب ہے قدرت کا دستور۔ ہنڈولہ ارتقا کا۔ سب اس کے کرامات ہیں۔ سب اس کی خرافات ہیں۔ جا جا کر ڈاکٹر سے پوچھو۔ ہر طرف آفات کی سوغات ہی سوغات ہیں۔

دراصل شاعری کرنا اصل کمال نہیں، اصل کمال تو یہ موضوعات اور عنوانات ہیں جو قاری کو اپنی طرف مہمیز کرتے نظر آتے ہیں۔

دراصل یہ کوئی عام شاعری نہیں۔ یہ فکر پارے ہیں چمن آہوجہ کے۔ جن کا اصل تعلق پڑھنے سے ہے۔ یہ تبصرہ حق ادا نہیں کرسکتا کیونکہ ایک ایک عنوان اپنے اندر ایک طوفان سمیٹے ہوئے ہے۔

میں قارئین سے سفارش کروں گا کہ ان شہ پاروں کو اپنے ساتھ رکھیں، زندگی میں جب تھکاوٹ محسوس ہو ان کا مطالعہ آپ کو ایک نئی زندگی عطا کرے گا۔

اشاعت بڑے پبلشرز نے کی ہے تو قیمت بھی کچھ زیادہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر یہ شہ پارے کچھ کم قیمت پر دستیاب ہوتے۔ طباعت شاندار ہے۔ اوراق کا حجم اور وزن دوستانہ ہے۔ امید کہ قارئین اسے بہت پسند کریں گے۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

قومی اردو کونسل کا ذیلی دفتر حیدرآباد کے محبان اردو کے لیے ایک تحفہ: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

حیدرآباد: قومی اردو کونسل کے ذیلی دفتر کو بہت جلد فعال کیا جائے گا۔ قومی اردو کونسل بھی یہاں ہر سال اردو سے متعلق ایک بڑے پروگرام کا انعقاد کرے گی۔ یہاں ایک ریڈنگ روم بھی بنایا جائے گا جس میں مقامی لوگ

اخبارات و رسائل اور کونسل کی مطبوعات کا مطالعہ کرسکیں گے۔ دفتر کے ہال کو بھی اردو زبان و ادب سے متعلق سرگرمیوں اور تقریبات کے لیے کھول دیا جائے گا۔ حیدرآباد یوں تو اردو زبان و ادب کا گہوارہ ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں کے مقامی اردو والے فروغ اردو کی ہماری کوششوں میں تعاون کریں اور قومی اردو کونسل کے ذیلی مرکز تشریف لائیں۔ یہاں موجود کتابوں سے استفادہ کریں اور اپنے پروگرام و تقریبات کا اہتمام ہمارے ہال میں کریں تاکہ ہمارا مرکز اردو سے متعلق سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ہم اپنا ہال اردو سے متعلق پروگراموں کے لیے مفت فراہم کریں گے۔ قومی اردو کونسل نے ادب اطفال، زبان و ادب، تعلیم و تربیت، فلسفہ، تاریخ، طب، سائنس جیسے مختلف موضوعات پر تقریباً 1400 کتابیں شائع کی ہیں، یہ کتابیں حیدرآباد کے دفتر سے خریدی جاسکتی ہیں۔ اسکولوں کالجوں کے اساتذہ سے درخواست ہے کہ وہ بچوں کی دنیا اور خواتین دنیا خرید کر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کونسل کے چاروں رسائل بھی یہاں پابندی سے آتے ہیں، انھیں بھی مطالعہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ قومی اردو کونسل کا ذیلی دفتر حیدرآباد کے محبان اردو کے لیے ایک تحفہ ہے اس سے اہل حیدرآباد کو فیضیاب ہونا چاہیے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے آج حیدرآباد میں اپنے ایک بیان میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمارا دفتر حیدرآباد میں چارمینار کے قریب واقع ہے اور ایسی جگہ پر ہے جہاں قرب وجوار میں ایک بڑی اردو آبادی رہتی ہے۔ ہم حیدرآباد کے اردو والوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ قومی اردو کونسل کی اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں اور مزید معلومات کے لیے وہ ہمارے دفتر آسکتے ہیں۔ اردو سے متعلق ہماری تمام اسکیموں کی جانکاری ہمارے دفتر سے حاصل کی جاسکتی ہے ساتھ ہی ہماری ویب سائٹ پر بھی تمام تفصیلات موجود ہیں۔ ہمارے دفتر کے آڈیٹوریم میں بچوں اور خواتین سے متعلق پروگراموں کا بھی انعقاد کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کے صحافیوں سے اپیل ہے کہ وہ بھی ہمارے دفتر سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے پروگرام اور تربیتی ورکشاپ کا یہاں اہتمام کریں۔ حیدرآباد میں قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر اور کیلی گرافی کے بھی مراکز چل رہے ہیں ان سے بھی مستفید ہوا جاسکتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ نئی نسل میں اردو کا فروغ ہو اور قومی اردو کونسل حیدرآباد کے ہر گھر میں اردو کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ اردو آپ کی قیمتی ثقافت کا آئینہ ہے، اس کی بقا کی کوشش میں ہمارا ساتھ دیں۔ ایک پروگرام کے دوران آل انڈیا اردو ماس سوسائٹی فار پیس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد فردین نے گائڈنس اسکول کے بچوں کے لیے کونسل کے رسالے بچوں کی دنیا کی 50 کاپیاں خریدنے کا بھی اعلان کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 اگست 2019

تاریخ ادب اردو کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل اردو کا ایک بڑا ادارہ ہے جہاں نہ صرف ادب بلکہ دیگر مختلف علوم وفنون کے ساتھ بچوں کے ادب پر بھی بہت سی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ تاریخ ادب اردو کی بہت سی اہم کتابیں منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔

لیکن ان میں طلبا اور اساتذہ کو کہیں نہ کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ مکمل ومستند جانکاری مہیا کرانے کی غرض سے تاریخ ادب اردو کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ تاریخ اردو ادب پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعات کے معتبر ترین اور ماہرین کی رہنمائی میں تاریخ ادب اردو کی از سرِ نو ترتیب کا کام کیا جائے گا اور اسے ہر طرح کے تحفظات سے پاک رکھنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ اس میں پسند اور ناپسند کی قطعی گنجائش نہیں ہوگی بلکہ غیر جانبدارانہ معروضی طریقوں کا خیال رکھا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ داستانوں میں ہماری تہذیب اور کلاسیکی زبان کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔ ہماری موجودہ نسل اپنی تہذیب وثقافت سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ ساتھ ہی بہت سی پرانی داستانوں کے نسخے لائبریوں میں موجود نہیں ہیں اور جو موجود بھی ہیں، وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہیں، اس لیے قومی اردو کونسل کی کوشش ہے کہ کچھ اہم اور معروف داستانیں شائع کی جائیں تاکہ نئی نسل اس سے روشناس ہوسکے۔ اس حوالے سے کونسل نے پیش رفت کی ہے اور آئندہ مہینوں میں اشاعتِ نو کی صورت میں کچھ داستانیں منظر عام پر آجائیں گی۔

میٹنگ کی صدارت مشہور ومعروف ناقد وادیب اور محقق پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو ادب کی تاریخ میں مبالغہ آرائی بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور مناسب اور نامناسب باتوں کی افراط وتفریط بھی بہت زیادہ ہے۔ کونسل ان خامیوں اور کمیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کرے گی۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ہم اپنی تاریخ اور تہذیب سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے میں کم از کم ایک مستند تاریخ ادب کی شدید ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ یہ ایک چیلنج بھرا کام ہے مگر اس کے باوجود قومی اردو کونسل سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ معینہ مدت میں اپنے ہدف کو حاصل کرلے گی۔ میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں پروفیسر شاہد پرویز، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر شرف النہار، ڈاکٹر اطہر سلطانہ، ڈاکٹر رحمٰن اختر، ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری کے علاوہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک، ڈاکٹر فیروز عالم اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، محمد شہاب الدین ریسرچ اسسٹنٹ، ساجد الحق ریسرچ اسسٹنٹ اور ڈاکٹر شاہد اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6اگست 2019

فارسی زبان میں ہماری تاریخ وتہذیب کی جڑیں پیوست ہیں: ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: فارسی زبان میں ہماری تاریخ وتہذیب کی جڑیں پیوست ہیں۔ ایک عرصہ تک ہمارے ملک میں اس زبان کا بول بالا رہا ہے۔ اس زبان نے گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی کا بھی فریضہ انجام دیا ہے لیکن آج ہندوستان میں اس کا دائرہ سکڑتا جارہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فارسی زبان کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد کی جائے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے فروغ اردو بھون میں 'فروغ فارسی زبان' کے موضوع پر منعقدہ پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی سے اردو کا بھی مضبوط اور گہرا رشتہ ہے۔ اردو کے اچھے اسکالر ہونے کے لیے فارسی دانی بہت ضروری ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فارسی کی تاریخی وتہذیبی اہمیت کے پیش نظر قومی کونسل فارسی زبان کے فروغ کے لیے گزشتہ کئی برسوں سے کوشاں ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں فارسی کے سینٹر چلا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سینٹروں سے فارسی سیکھیں۔ اسی کے ساتھ فارسی کے قیمتی ذخیرے کو اردو

میں منتقل کرنے اور ترجمہ کرنے کا کام بھی کونسل کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ عنقریب داراشکوہ کی تمام کتابوں وتحریروں پر مشتمل کلیات کو کونسل کی جانب سے شائع کیا جائے گا۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی نے داراشکوہ پر باضابطہ کام سے متعلق کونسل کے ڈائریکٹر کے عزم کو سراہا اور کہا کہ داراشکوہ پر کام وقت کی اہم ضرورت ہے اور یقیناً یہ کونسل کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ انھوں نے اس کام کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس طرح ہندوستان کے ایک عہد کی تاریخ محفوظ ہوجائے گی۔ پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ کونسل کی جانب سے فارسی زبان وادب پر کیا جانے والا کام تسلی بخش، معیاری اور اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ 'ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ' کے حوالے سے کونسل جو کام کرنے جارہی ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

میٹنگ میں کونسل کے زیر اہتمام چل رہے فارسی کے تمام کاموں کا سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا اور کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے متعدد تجاویز پر غور وخوض کیا گیا، متعدد نئے منصوبوں پر بھی بات کی گئی۔ میٹنگ میں فارسی کے جن ادبا و ماہرین نے شرکت کی ان میں پروفیسر عین الحسن، پروفیسر حسن عباس، پروفیسر جمیل احمد، منصور عثمانی، پروفیسر عبدالحلیم، پروفیسر قاضی حبیب، پروفیسر عثمان غنی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں میٹنگ میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک، ڈاکٹر فیروز عالم اسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، محمد ساجد الحق اور یوسف رامپوری بھی شریک رہے۔ آخر میں قومی کونسل کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانان وشرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 18 جولائی 2019

قومی اردو کونسل کے دفتر میں طب یونانی پینل کی میٹنگ

نئی دهلی: طب یونانی ہمارا تہذیبی ورثہ ہے، اس کا تحفظ وفروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اردو کو زندگی بخشنے میں طب یونانی کا بھی بڑا رول رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں

منعقدہ طب یونانی پینل کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ طب یونانی اور اردو کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ اسی لیے طب یونانی کا خاصا بڑا ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے۔ ہندوستان میں طب یونانی کے ماہرین نے یونانی طریقہ علاج کے لیے جس زبان کا سہارا لیا، وہ اردو ہی ہے۔ اس طرح اردو کے ذریعہ طب یونانی کا اور طب یونانی کے ذریعہ اردو کا فروغ ہوتا رہا ہے۔ دونوں کے باہمی رشتہ کو رواں صدی میں بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جائے اور اس سمت میں مثبت ومضبوط اقدامات کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنی اس تاریخی وتہذیبی وراثت کے تحفظ وفروغ کے لیے قومی اردو کونسل گذشتہ کئی برسوں سے کام کررہی ہے اور کونسل سے یونانی طریقہ علاج، یونانی ادویہ اور طب یونانی کی تاریخ پر کئی اہم کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور اس حوالے سے مزید کئی کتابیں جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔

ڈاکٹر محمد خالد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ قومی اردو کونسل کی بڑی کامیابی ہے کہ اس نے قلیل مدت میں بڑے پیمانے پر اردو میں طب یونانی سے متعلق مواد کی اشاعت کو یقینی بنایا اور متعدد اہم کتابیں شائع کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ حال ہی میں کونسل نے صحت سے متعلق ایک اہم کتاب 'حفظان صحت' شائع کی ہے اور امراض اطفال اور امراض نسواں سے متعلق کتابوں کی اشاعت کے ساتھ تاریخ طب، معالجات، جراحت، علم الادویہ اور کلیات ادویہ جیسی کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ ڈاکٹر اشہر قدیر نے کہا کہ گزشتہ چند برسوں میں ہم طب یونانی پر اچھی خاصی کتابیں شائع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اگلے چند سالوں میں یہ دائرہ مزید وسیع ہوجائے گا۔

میٹنگ میں نئے منصوبوں پر بھی غور وخوض کیا گیا اور کئی اہم تجاویز سامنے آئیں۔ میٹنگ میں پروفیسر محمد ایوب، ڈاکٹر وسیم احمد، ڈاکٹر شمیم ارشاد اعظمی، ڈاکٹر محمد اکرم، حکیم وسیم احمد اعظمی، ڈاکٹر شبیر احمد کے علاوہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک، ڈاکٹر محمد فیروز عالم اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، ذیشان فاطمہ اور یوسف رامپوری شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 جولائی 2019

اردو میں بچوں کے لیے علاقائی زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ اور انتخاب ضروری: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دهلی: ہندوستان ازمنۂ قدیم سے ہی قصے کہانیوں اور دیگر علوم وفنون کی وجہ سے عالمی شہرت کا حامل رہا ہے۔ یہاں بہت سی بولیاں اور زبانیں رائج ہیں۔ ان زبانوں میں ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ کونسل ان خزانوں میں سے بہترین اور منفرد کہانیوں کا انتخاب کرکے اردو زبان میں ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اردو بھون میں منعقدہ تخلیقی ادب پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج بچوں کے تخلیقی ادب پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے میں کونسل کی ذمے داری بنتی ہے کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کی ایسی نادر ونایاب کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے جو بچوں کے شوق مطالعہ کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہو۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو میں بچوں کے لیے اچھی کہانیوں کے انتخاب کے لیے ساہتیہ اکیڈمی اور بھارتیہ گیان پیٹھ جیسے بڑے اداروں سے گفتگو کی جائے گی۔

میٹنگ کی صدارت کررہے مشہور ومعروف تخلیق کار پروفیسر گنگا پرساد بمل نے کہا کہ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ عالمی زبانوں میں لکھی گئی بہترین کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ایک دوسرے کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے میں مدد ملے۔ انھوں نے کہا کہ اس سمت میں قدم بڑھاتے ہوئے کونسل بہت جلد ایسی کہانیاں شائع کرنے جارہی ہے جس کا عنوان 'عالمی کہانیاں' ہوگا۔ اس موقع پر جناب بلراج بخشی نے کہا کہ کونسل کی تاریخ میں یہ ایک اہم کارنامہ ہوگا۔ میٹنگ میں جن نئی کتابوں کی اشاعت پر ممبران نے اطمینان ومسرت کا اظہار کیا، ان میں محمود ایاز کی تحریریں 'صرف تمھارے لیے' اور 'ایک ندی نام سرسوتی' قابل ذکر ہیں۔ مشہور فکشن نگار شموئل احمد نے کونسل کے اس اقدام کی تعریف کی اور کہا کہ ایسے تراجم سے مختلف زبانوں کی باتیں ہماری زبان میں منتقل ہوں گی اور دوسری قوموں کی تہذیب وثقافت کو ان کہانیوں کے توسط سے ہم کسی حد تک سمجھ سکیں گے۔ میٹنگ میں نئے منصوبوں اور تجاویز پر بھی غور وخوض کیا گیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 جولائی 2019

آزادی کی شان وشوکت ملک کی سالمیت اور یکجہتی میں پنہاں ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 73 ویں جشن آزادی کا اہتمام

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں 73 واں جشن آزادی انتہائی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ایگزیکٹیو بورڈ کے ممبر جناب جاوید ملک اور دیگر عملہ کی موجودگی میں پرچم کشائی کی اور قومی ترانہ کے ساتھ پرچم کو سلامی دی گئی۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ آج کا دن ہم ہندوستانیوں کے لیے بہت ہی خوشی کا دن ہے۔ ہمارے مجاہدین آزادی نے اپنی قربانیاں دے کر اس ملک کو آزادی دلائی۔ ان کی جدوجہد کی وجہ سے ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ملک کی آزادی میں جہاں مختلف زبانوں نے اپنا اپنا رول ادا کیا وہیں ان میں سب سے زیادہ اردو زبان کی خدمات رہی ہیں۔ اس زبان نے ایسے نعرے دیے جس نے مجاہدین آزادی کے اندر جوش وجذبہ پیدا کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں ورثے میں ملی اس آزادی کی شان وشوکت کو بحال رکھنا ہے اور ملک کی سالمیت اور یکجہتی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنا ہے۔ آیئے ہم سب اس موقعے پر اس بات کا عہد کریں کہ نئے ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں اپنا مثبت کردار نبھائیں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2019

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں مرزا عبدالقیوم ندوی کے لیے تقریبِ تہنیت

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون جسولہ میں اورنگ آباد مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے، مرزا ورلڈ بک ہاؤس کے پروپرائٹر مرزا عبدالقیوم ندوی کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر

شیخ عقیل احمد نے مرزا عبدالقیوم ندوی کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور شال اوڑھا کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے اس موقع پر کہا کہ مرزا عبدالقیوم ندوی جیسے اردو کے شیدائی جب تک زندہ ہیں اردو زبان وادب کا مستقبل محفوظ ہے۔ ہمیں پورے ہندوستان میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے جو اردو رسائل وجرائد اور کتابوں کی ترسیل کو بہتر طریقے سے انجام دے سکیں۔ ہم قومی اردو کونسل کی جانب سے مرزا صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انھیں مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہمارا رسالہ 'بچوں کی دنیا' پورے مہاراشٹر خصوصاً اورنگ آباد اور مالیگاؤں کے سبھی اسکولوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرزا عبدالقیوم ندوی نے 'بچوں کی دنیا' کی اشاعت کے ایک سال سے بھی کم وقفے میں ایک لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت کردی تھیں۔ واضح ہو کہ مرزا عبدالقیوم ندوی نہ صرف یہ کہ کتابوں کی فروخت اور ترسیل سے جڑے ہیں بلکہ مختلف سماجی وفلاحی کام بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے لیڈ اینڈ ریڈ فاؤنڈیشن کا بھی آغاز کیا ہے جس کے تحت بچوں سے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے روزانہ جمع کرنے کو کہا جاتا ہے اور ایک دو مہینوں کے بعد مرزا صاحب اسی اسکول میں بچوں کی کتابوں کا اسٹال لگاتے ہیں تاکہ بچے اپنی پسند کی کتابیں خرید سکیں۔ اسی طرح مرزا عبدالقیوم مہاراشٹر کے اسکولوں میں 'بچوں کی دنیا' بھی مفت تقسیم کرتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ اس تقریب میں قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب اجمل سعید اور عبدالحی کے علاوہ ایم آر پبلشرز کے پروپرائٹر جناب عبدالصمد وغیرہ موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 جولائی 2019

رائے چوٹی میں قومی اردو کونسل کی کتاب گاڑی

رائے چوٹی: رائے چوٹی، ضلع کڈپہ، آندھرا پردیش میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کا

گشتی کتب خانہ رائے چوٹی پہنچا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی میں اردو کتابوں کی نمائش اور فروخت کا اہتمام کیا گیا۔ شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی کے طلبہ و طالبات اور اساتذہ نے کتابیں خریدیں۔ ڈاکٹر شیخ فاروق باشا، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، خواجہ اویس قرنی اور محمد اسماعیل نے کتابوں کی خریداری میں طلبہ کی رہنمائی کی۔ بعد ازاں رائے چوٹی کے گورنمنٹ ڈائٹ (ٹیچر ٹریننگ کالج) میں کتابوں کی بس کا استقبال کیا گیا۔ ڈائٹ کے پرنسپل جناب چندریا نے گشتی کتب خانے کا افتتاح کیا۔ جناب شمین میم ہاشم طلیق، سمیع اللہ خان راحت اور جناب لیاقت علی نے طلبہ و طالبات کے ہمراہ کالج کی لائبریری کے لیے کتابیں خریدیں۔ طلبہ و طالبات نے طریقۂ تدریس پر مشتمل کتابوں کے علاوہ قومی کونسل کے انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں خریدیں۔ اس کے بعد گورنمنٹ جونیئر کالج فار گرلز، رائے چوٹی کے میدان میں کتابوں کی بس پہنچی۔

پرنسپل جناب ایشور ریڈی، جناب محمد علی، جناب اسماعیل خان، فیروز خان اور دیگر اساتذہ و طالبات نے کتابیں خریدیں۔ اس کے بعد گورنمنٹ بوائز جونیئر کالج، بنگلہ کے گراؤنڈ میں قومی کونسل کی بس کی نمائش اور فروخت کا انتظام کیا گیا۔ رائے چوٹی کے اہل اردو نے قومی کونسل کے گشتی کتب خانہ کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور رعایتی قیمت پر اردو کتابوں کی فراہمی پر قومی کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر فاروق باشا، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، سمیع اللہ خان راحت، ناصر خان اور شمین میم ہاشم طلیق نے قومی کونسل کے ارباب مجاز سے مطالبہ کیا کہ مستقبل میں کونسل کی نئی مطبوعات کے ساتھ گشتی کتب خانہ کا دوبارہ رائے چوٹی اور رائل سیما کے علاقوں میں دورے کا اہتمام کیا جائے۔

پریس ریلز: وصی بختیاری، آندھرا پردیش، 31 جولائی 2019

'بچوں کی دنیا' کی ساڑھے 5 لاکھ کاپیاں فروخت کا ریکارڈ

اورنگ آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی سے بچوں کے لیے شائع ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کے صرف چھ سال سے کم عرصہ میں اورنگ آباد کے مرزا عبدالقیوم ندوی نے 5,56,800 (پانچ لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو) سے زائد ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کے شمارے فروخت کرکے بنایا ایک عالمی ریکارڈ بنایا۔ اس سلسلے میں مرزا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ قومی کونسل نے جون 2013 میں بچوں میں اردو زبان کو فروغ دینے اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' جاری کیا تھا۔

جولائی 2013 میں پہلا آرڈر ایک ہزار کاپیوں کا تھا، جبکہ دسمبر میں 20 ہزار کاپیاں فروخت کی گئیں اور جنوری 2014 میں 30 ہزار پانچ سو، فروری میں 50 ہزار کاپیاں صرف دو ہفتوں میں فروخت ہوگئی تھیں۔ یہ ہمارا عالمی ریکارڈ ہے۔ قومی کونسل کے ریکارڈ کے مطابق انھوں نے گذشتہ 6 سالوں میں کونسل سے 5,56,800 (پانچ لاکھ چھپن ہزار آٹھ سو) بچوں کی دنیا کی کاپیاں منگوا کر فروخت کی ہیں۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مرزا عبدالقیوم ندوی جیسے عاشق اردو کے ہاتھوں اردو کا مستقبل روشن و محفوظ ہے۔

روزنامہ 'ایشیا ایکسپریس' اورنگ آباد، 29 جولائی 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو بین الاقوامی مزاج کی حامل زبان ہے

ھاپوڑ: اردو ایک زندہ زبان ہے اور اپنی ساخت میں بین الاقوامی مزاج رکھتی ہے۔ یہ زبان غیر معمولی لسانی مفاہمت کا نام ہے۔ اردو ایک بین الاقوامی مزاج کی حامل زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے مزاج میں لچک اور رنگارنگی ہے لیکن وہ کسی زبان کی مقلد نہیں ہے، بلکہ صورت اور سیرت دونوں کے اعتبار سے اپنی ایک الگ اور مستقل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لاکالج ڈپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر شکیل صمدانی نے آئی ایم آئی ٹی کالج بلند شہر روڈ میں منعقد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر انتظام سیمنار میں کیا۔ پروگرام کی صدارت آئی ایم آئی ٹی کالج کے بانی و چیئرمین حاجی امین انصاری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض فاخر ادیب اور انور غازی آبادی نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

سیمنار کے چیف گیسٹ و ماہر لسانیات پروفیسر شکیل صمدانی نے اردو زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اردو مخلوط زبان ہونے کے باوجود اپنی رعنائی، صناعی اور افادیت کے لحاظ سے اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی ساخت، مزاج اور سیرت کو دوسری زبانوں کے تابع نہیں کیا۔ ان ہی ظاہری و معنوی خصوصیات اور محاسن کے اعتبار سے یہ دنیا کی اہم زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے 'اردو زبان کے فروغ میں مدارس کا کردار' کے عنوان سے ایک پر مغز لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اپنی خامیوں پر نظر کریں اور کمزوریوں پر غور کریں۔

مونا ڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جاوید خان نے کہا کہ اردو زبان میں بہت زیادہ شیرینی ہے۔ پاکستان میں 48 فیصد افراد پنجابی زبان بولتے ہیں اور صرف چند فیصد افراد ہی اردو بولتے ہیں جبکہ ہندوستان میں عام ہندوستانیوں کی زبان اردو ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جولائی 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

لوگوں کی پڑھنے کی عادت کو بڑھاوا دیا جانا چاہیے: پرکاش جاوڈیکر

ای- پروجیکٹوں کا آغاز

نئی دهلی: مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے پبلی کیشنز ڈویژن کے بہت سے ای- پروجیکٹوں کا آغاز کیا، جن میں نئے سرے سے تیار کی گئی ڈائنامک ویب سائٹ، موبائل ایپ ڈیجیٹل ڈی پی ڈی، روزگار سماچار کا ای- ورژن اور ای بک ستیہ گرہ گیتا شامل ہیں۔ انھوں نے یہ آغاز دہلی میں سوچنا بھون میں بک گیلری کے دورے کے دوران کیا۔

اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے مسٹر جاوڈیکر نے کہا کہ 2.0 پروگرام 'من کی بات' میں وزیراعظم نے شہریوں سے جو کچھ کہا ہے کہ وہ پڑھنے کو اپنی عادت بنائیں، اس کے مطابق ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے پڑھنے کی عادت کو بڑھاوا دیں۔ انھوں نے پڑوس میں ریڈنگ کلب بنانے پر زور دیا، تاکہ پڑھنے کے ماحول میں بہتری آئے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر کالجوں میں روزگار سماچار تقسیم کیا جائے تو اس سے طلبہ کو اپنے ہنر میں بہتری لانے میں مدد ملے گی اور انھیں خود کو روزگار مارکیٹ کے مطابق بنانے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ پبلی کیشنز ڈویژن کی نئے سرے سے بنائی گئی ویب سائٹ دلکش اور فعال لگتی ہے اور اسے روزانہ اپڈیٹ کرنے سے لوگ اس سائٹ پر جلدی جلدی آئیں گے۔ انھیں پبلی کیشنز ڈویژن کے لیے ایک موبائل ایپ کے آغاز پر

خوشی ہے، جس سے ای- بکس اور کنڈل کے دور میں لوگوں کے پڑھنے کی عادتوں کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

ای- پروجیکٹوں کے آغاز کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں: 1۔ نئے سرے سے بنائی گئی ڈائنامک ویب سائٹ:(www.publicationsdivision.nic.in) جس میں رقم کی ادائیگی کے لیے گیٹ وے شامل کیا گیا ہے۔ بروقت خریداری کی سہولت اور پبلی کیشنز ڈویژن کی کتابوں اور رسالوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس ویب سائٹ سے خریداری میں آسانی ہوجائے گی۔ بھارت کوش کے رقم کی ادائیگی کے گیٹ وے کے ذریعے خریداری کی ویب سائٹ پر بھی کتابیں دستیاب ہیں۔ یہ ویب سائٹ دلکش ہے اور اسے منصوبہ بند طریقے سے تشکیل دیا گیا ہے۔ کتابوں کے کیٹلاگ اور تازہ ترین معلومات اور نئی کتابوں کے اجرا کو خوبصورتی کے ساتھ موثر انداز میں دکھایا گیا ہے، جس میں پرسکون رنگوں کا استعمال کرتے ہوئے عمدہ ڈیزائن کے آئیکون دیے گئے ہیں اور ان آئیکون اور پس منظر میں کنٹراسٹ دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو آسانی ہو۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا'، دہلی 1 اگست 2019

پروفیسر نجمہ اختر کی ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ سے ملاقات

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے جامعہ کی چانسلر اور منی پور کی گورنر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ سے ملاقات کی جس میں صد سالہ جشن، جلسہ تقسیم اسناد اور جامعہ کے دیگر امور پر غور وخوض کیا گیا۔ واضح رہے کہ کنووکیشن پروگرام اکتوبر یا نومبر میں منعقد ہونے کا امکان ہے، جس میں صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند کو بطور مہمان خصوصی شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ منی پور بھون میں منعقدہ میٹنگ میں وائس چانسلر

نے صدر جمہوریہ ہند اور وزیراعظم ہند سے ملاقات کا ذکر کیا اور چانسلر کو اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ حال ہی میں انھوں نے وزیراعظم نریندر مودی سے بھی ملاقات کی تھی اور ان سے یونیورسٹی کے صد سالہ جشن جسے آئندہ سال منانا جانا ہے کے بارے میں تعاون کی اپیل کی تھی، ساتھ ہی انھوں نے جامعہ میں ایک میڈیکل کالج کے قیام کے لیے راستہ ہموار کرنے سے متعلق بھی ان سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ چانسلر اور وائس چانسلر دونوں نے یونیورسٹی کے سو سال مکمل ہونے پر منعقد کیے جانے والے مجوزہ پروگراموں کے بارے میں بھی بات چیت کی۔ روزنامہ'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 27 جولائی 2019

تمام ریاستوں میں اردو اکادمیاں، اردو سیل قائم کیے جائیں گے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

حیدرآباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان کی اُن تمام ریاستوں میں جہاں اردو اکادمیاں نہیں ہیں، ان کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے نمائندگی کرے گی اور جہاں اردو آبادی کا تناسب بہت کم ہے وہاں کم از کم ایک

اردو سیل قائم کیا جائے گا۔ یہ اعلان این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ وہ 3 میڈیا پلس آڈیٹوریم حیدرآباد میں بچوں کے ادب پر سمینار کے افتتاح کے بعد مہمان خصوصی کی حیثیت سے مخاطب تھے۔

اس سمینار کا اہتمام کاروانِ ادب اور اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔ جناب رحیم الدین انصاری چیئرمین اردو اکادمی نے صدارت کی۔ ایڈیٹر ماہنامہ گل بوٹے جناب فارق سید، ایڈیٹر گواہ ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز، عابد صدیقی صدر کاروان ادب اور سکریٹری افتخار مشرف، مختار احمد فردین کوآرڈینیٹر، سردار سلیم، شبینہ فرشوری، م ق سلیم اور مجیب احمد شہ نشین پر موجود تھے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو کے بغیر ہندوستان کی تہذیب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اردو کی ترویج واشاعت اور اردو اداروں کے استحکام کے لیے این سی پی یو ایل کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو کے سپاہیوں کے لیے بھی ایوارڈس کی ضرورت پر زور دیا۔ بچوں کے ادب کے احیا کے لیے خواتین کے رسائل کے اجرا کو ناگزیر قرار دیا۔ انھوں نے تلنگانہ اردو اکادمی کو مختلف پروگرامس کے لیے تعاون کی پیشکش کی اور کل ہند سطح پر تمام اکادمیوں اور این سی پی یو ایل کے باہمی اشتراک وتعاون سے اردو کو ترقی کے ایک نئے دور سے ہمکنار کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ انھوں نے بچوں میں اردو کی دلچسپی کے لیے کوئز اور بیت بازی مقابلوں کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے حیدرآباد کی تہذیب، اخلاص ومروت کو خراج تحسین پیش کیا اور منتظمین کو بچوں کے ادب پر سمینار کے کامیاب انعقاد کے لیے مبارکباد پیش کی۔ چیئرمین اردو اکادمی جناب رحیم الدین انصاری نے تلنگانہ اردو اکادمی کی کارکردگی پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو کی ترویج واشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ ستمبر میں ماہنامہ گل بوٹے کی جانب سے دہلی میں منعقد ہونے والے بچوں کے ادب پر پانچ روزہ ورکشاپ وسمینار کے لیے انھوں نے تلنگانہ اردو اکادمی کی جانب سے تعاون کی پیش کش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اگست 2019

ریختہ اردو لرننگ پروگرام

نئی دھلی: 'ریختہ' جس سطح پر لوگوں میں اردو کا عشق پیدا کر رہا ہے، اس کی وجہ سے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اس کی ایک شناخت قائم ہو چکی ہے۔ سنجیو صراف کی انتھک کوششوں سے ایک ایسا ادارہ قائم ہوا ہے، اردو زبان وادب کو جس کی بہت ضروری تھی۔ اس

ویب سائٹ پر معیاری کلام کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی اہم اور نادر کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریختہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ ریختہ اردو لرننگ پروگرام کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعے پر بحیثیت مہمان خصوصی دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے کیا۔ انھوں نے طلبا سے گفتگو کرتے ہوئے مزید کہا کہ اردو زبان ہمیں بولنے کا سلیقہ اور درست تلفظ کا صحیح طریقہ سکھاتی ہے۔ اس موقعے پر پروگرام کے دوسرے مہمان خصوصی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد، پروفیسر احمد محفوظ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مستقبل میں آگے بڑھنا اچھی بات ہے لیکن ماضی کی اپنی روایات کو فراموش کرنا مناسب نہیں۔ اردو زبان ایک بڑی تہذیب کی نمائندہ ہے اور ریختہ نے نہ صرف اردو زبان کو بلکہ ہندوستانی تہذیب کو دنیا کی ایک بڑی آبادی تک پہنچایا ہے۔ سنجیو صراف کا یہ غیر معمولی کارنامہ ہے۔ دھرمیندر سا بھی ان کے رفیق ومددگار کی حیثیت سے ہمیشہ ان کے ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ دور حاضر میں 'ریختہ' اردو کی ایک اہم ویب سائٹ ہے۔ اس ویب سائٹ پر تقریباً ساڑھے چار ہزار شاعروں (کلاسیکی اور جدید) کی کم وبیش پچاس ہزار غزلیں اردو، ہندی اور رومن رسم الخط میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہاں آڈیو، ویڈیو کے علاوہ ای بکس کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار سے زائد ہے، جن میں نہایت نادر ونایاب کتابیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں گذشتہ برس اگست سے ریختہ کیمپس میں اردو رسم الخط کی تدریس کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کورس کا بنیادی مقصد ایسے غیر اردو داں لوگوں کو اردو رسم الخط سکھانا ہے جو یا تو اپنی پیشہ ورانہ ضرورت کے پیشِ نظر اردو سیکھنا چاہتے ہیں یا اردو ادب بالخصوص اردو شاعری سے گہرا شغف رکھتے ہیں، لیکن اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس کورس میں داخلہ لیتے ہیں اور تیس سے چالیس گھنٹوں میں اس قابل ہوجاتے ہیں کہ اردو شعر وادب کے اہم نمونوں کو بذات خود پڑھ اور لکھ سکیں۔ اب تک ڈھائی سو سے زیادہ لوگ اس کورس سے استفادہ کر چکے ہیں۔ اس میں داخلہ لینے والوں میں وکیل، انجینئر، صحافی، انگریزی اور دیگر علوم کے پروفیسر، ریسرچ اسکالر اور شاعر شامل رہے ہیں۔ ریختہ کیمپس میں درج بالا کورس کے ساتویں گروپ کا جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ پروفیسر شہپر رسول (وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی، دہلی) اور پروفیسر احمد محفوظ (استاد، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، نے اپنے دست مبارک سے اس گروپ کے 45 شرکا کو سرٹیفکٹ تقسیم کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جولائی 2019

دھلی:

اردو ڈرامہ فیسٹول

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی ثقافتی تنظیم 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کے زیر اہتمام 26 جولائی سے 30 جولائی تک 5 روزہ اردو ڈرامہ فیسٹول کا اہتمام کیا گیا۔ اس

فیسٹول کا افتتاح جموں وکشمیر کے سابق چیف جسٹس اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس بدردریز احمد نے کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیئرمین اور حکومتِ راجستھان کے سابق وزیر صحت عمادالدین احمد خاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے موجود تھے۔

اس موقعے پر فیسٹول سے متعلق کتابچے کی بھی رسم رونمائی ہوئی۔ رسم رونمائی کے وقت ہم سب ڈرامہ گروپ کی چیئرمین ڈاکٹر رخشندہ جلیل اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر موجود تھے۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے جب سے ہم سب ڈرامہ گروپ کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ یہ تنظیم مسلسل کامیابیوں کی طرف گامزن ہے۔ 26 جولائی کو افتتاحی تقریب کے بعد سب سے پہلا ڈرامہ معروف ہدایت کار اور فن کار ڈاکٹر سعید عالم اور ان کے ساتھیوں نے قدسیہ زیدی کا تحریر کیا ہوا ڈرامہ 'چچا چھکن ان ایکشن' کو نہایت خوبصورتی اور طنز ومزاح کے ساتھ پیش کیا۔ 27 جولائی کو جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح حیات 'یادوں کی بارات' کے کچھ حصے کو سلیمہ رضا اور ارشد اقبال نے پیش کیا۔ فیسٹول کا تیسرا ڈرامہ معروف ڈرامہ نگار جاوید صدیقی کا لکھا ہوا ڈرامہ 'گڑمبا' لبنیٰ سلیم نے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا۔ اس ڈرامے کی ہدایت کا فریضہ سلیم عارف نے انجام دیا۔ طلسم ہوشربا ہماری داستانوی تاریخ میں ایک اہم کتاب ہے، فوزیہ داستان گو نے طلسم ہوشربا کے کچھ حصے کو اپنے حسین انداز میں پیش کیا۔ اس فیسٹول کا آخری ڈرامہ 30 جولائی کو پیش کیا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر رخشندہ جلیل اور ڈاکٹر رضا حیدر نے تمام ڈرامہ نگاروں اور ہدایت کاروں کو مومنٹو پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 اگست 2019

جے این یو میں ادبی نشست کا اہتمام

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے زیراہتمام ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں معتبر فکشن نگار پروفیسر غضنفر نے اپنا شاہکار افسانہ 'مسنگ مین' پیش کیا اور انھوں نے معاصر افسانوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ خاص طور پر انھوں نے نئے لکھنے والوں کے سامنے تخلیقی عمل سے گزرنے اور افسانہ بننے کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ اس موقعے پر گفتگو کرتے ہوئے فکشن ناقد پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ کامیاب افسانہ لکھنے کے لیے دانشورانہ شعور ضروری ہے۔ افسانہ، کسی کہانی کو محض بیان کردینے کا نام نہیں، بلکہ اس میں فلسفیانہ اساس اور معاشرے کو شامل کرنا لازمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاصر فکشن میں غضنفر مجھے اس لیے بھی پسند ہیں کہ ان کے یہاں دانشورانہ شعور پایا جاتا ہے۔ تخلیقی رچاؤ اور دانشورانہ شعور سے وہ معمولی واقعات کو غیرمعمولی بنادیتے ہیں۔ افسانہ 'مسنگ مین' کا منفرد انداز

میں تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر پاشا نے کہا کہ ایک چھوٹے افسانے میں غضنفر نے بڑی فن کاری سے تین نسلوں کو پیش کیا۔ ان تین نسلوں سے جڑے ہوئے کرداروں میں ہم بدلتے سماج کو بڑی آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ افسانہ پیش کرنے میں غضنفر کا انداز بھی جداگانہ ہے اس لیے ایسے تخلیق کاروں سے نئے لکھنے والوں کو منظم سطح پر روبرو کرانا چاہیے، تاکہ وہ لکھنے کے ہنر کے ساتھ ساتھ انداز پیش کش بھی سیکھ لیں۔ مخصوص انداز کے علاوہ نئی نسل کی تخلیقی تربیت کے لیے چھوٹی چھوٹی نشستوں کا انعقاد ضروری ہے۔ گفتگو کے دوران پروفیسر غضنفر نے اپنی تخلیقات اور معاصر افسانوں کے متعلق ریسرچ اسکالروں سے بات چیت کی اور کئی اہم سوالوں کے جوابات دیے اور کئی تخلیقات کے کچھ نئے گوشوں کی طرف اشارے بھی کیے۔ اس افسانوی نشست میں ڈاکٹر توحید خان، ڈاکٹر حافظ محمد عمران، ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی اور محمد انصر کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں ریسرچ اسکالر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جولائی 2019

اتر پردیش:

منشی پریم چند کی عصری معنویت

مراد آباد: کسی بھی عظیم فنکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقی معنویت اور بڑھتی جاتی ہے۔ منشی پریم چند ایک ایسے ہی فنکار ہیں جن کی فکر کا سورج ہر زمانے میں عدم مساوات، ظلم وجبر فرقہ پرستی، تعصب پرستی وتنگ نظری وغیرہ ہر طرح کی ناانصافیوں کی تاریکیوں کو مٹانے کی قوت رکھتا ہے۔ آج بھی ہم اپنے سماج اور معاشرے پر نگاہ ڈالیں تو سیکڑوں ہوری، گھیسو، مادھو اور دھنیا موجود ہیں پھر ہم کیسے کہیں کہ آج پریم چند مقبول نہیں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف ادیب ونقاد پروفیسر عابد حسین حیدری نے مہاراجہ ہریش چندر پی جی کالج میں شعبۂ اردو کے زیراہتمام منعقد پروگرام 'منشی پریم چند کی عصری معنویت' کے موضوع پر توسیعی خطبہ میں کیا۔ پروگرام کا افتتاح پروفیسر اے جیمنی، کاویہ سوربھ رستوگی، پروفیسر عابد حیدر نے شمع روشن کرکے کیا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبدالرب نے بتایا کہ آج کا پروگرام اس اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں ملک کے مایہ ناز ادیب کی یاد میں توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی شعبہ اردو میں ایک لائبریری کا قیام کیا جارہا ہے۔ جو منشی پریم چند سے منسوب ہے جس کا افتتاح پروفیسر اے جیمنی کے دست مبارک سے ہورہا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر اے جیمنی نے پروگرام کے انعقاد پر ڈپارٹمنٹل لائبریری کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا۔ مہمان اعزازی کاویہ سوربھ رستوگی نے شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبا کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔ کالج کی پرنسپل اور معروف شاعرہ وکہانی کار پروفیسر مینا کول نے لائبریری کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا۔ شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر اسما عزیز نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 جولائی 2019

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مرکزی حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کیا

دیوبند: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مرکزی حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری 23 سال کی قانونی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ زبان اردو کے ساتھ ساتھ دیگر علاقائی زبانوں کو بھی ان کا آئینی حق مل رہا ہے اور صدر جمہوریہ کے حکم 1960 کا نفاذ 50 سال بعد سب سے پہلے محکمہ ریلوے نے یو پی اے کی حکومت میں کیا اور اب محکمہ ڈاک نے بی جے پی کی حکومت میں کیا ہے۔ یہ جانکاری اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے کنوینر تحسین علی اساروی نے پریس کو جاری بیان کے ذریعے دی۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لیے ہندوستان کے اردو داں عوام وزیر اعظم

کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور ان کے اس فیصلے کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ کیونکہ عدالت عظمیٰ نے 2015 میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے 8 مقدموں پر مشترکہ فیصلہ دیا تھا کہ تنظیم اپنی شکایتوں سے متعلق مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کو دوبارہ درخواست لکھے۔ چنانچہ دوبارہ درخواست لکھنے پر مرکزی حکومت نے تسلیم کرلیا ہے کہ اب محکمہ ڈاک میں تقرری کے لیے علاقائی زبان اردو کے ساتھ ساتھ دیگر علاقائی زبانوں میں بھی امتحانات لیے جائیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 جولائی 2019

اردو کے فروغ کے لیے میٹنگ

دیوبند: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن مظفرنگر کی ایک میٹنگ شمیم قصار کی رہائش گاہ پر ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر شمیم الحسن و نظامت سکریٹری شمیم قصار نے کی۔ میٹنگ میں اردو زبان کے فروغ کو لے کر تبادلہ خیال ہوا۔ اس موقعے پر تحسین علی اساروی نے اردو داں عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردو رسالوں اور اردو اخبارات خرید کر پڑھیں تاکہ اردو زبان کا فروغ ہوسکے۔ میٹنگ میں مشترکہ طور سے طے پایا کہ ضلع مظفر نگر میں اردو فروغ کے لیے سبھی تحصیلوں کی کمیٹیوں کو مضبوط کیا جائے گا۔ اس کے لیے تحصیل کی سطح پر پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مولانا موسیٰ قاسمی نے بتایا کہ تحصیل صدر کا پہلا پروگرام نگلہ راعی چرتھاول میں منعقد ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا پروگرام تحصیل بڈھانہ کے قصبہ شاہپور میں ہوگا۔ ان پروگراموں میں اردو داں عوام کو سرکاری دفتروں میں اردو میں خط و کتابت کرنے، بینکوں میں اردو کا استعمال کرنے، داخلے کے وقت بچوں کی مادری زبان اردو لکھوانے، گھر و دوکان کے باہر نیم پلیٹ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی لکھوانے کے لیے بیدار کیا جائے گا۔ میٹنگ میں گلفام احمد، بدرحان، سلیم احمد سلمانی، قاری سلیم میربان وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 29 جولائی 2019

بزم ادب خواتین کے زیراہتمام تقریب

علی گڑھ: بزم ادب خواتین کے زیراہتمام اردو باغ میں منعقد ایک تقریب میں بزم ادب میگزین کا اجرا بیگم ساجدہ نبی صدر بزم ادب نے کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بزم ادب کی سابق سکریٹری اور بزم ادب کی ایڈیٹر مرحومہ راشدہ خلیل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ ان سے ہماری جو یادیں وابستہ ہیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔

انھوں نے اس موقعے پر ان کی بیٹی ہما خلیل کی بھی ستائش کی کہ انھوں نے مرحومہ کے ذریعے نکالی گئی میگزین کی ادارت سنبھال لی ہے، توقع ہے کہ وہ بزم ادب کے اغراض و مقاصد کو مزید تقویت دیں گی۔ بیگم شمیم آصف نے بھی اپنی تقریر میں راشدہ آپا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب بزم ادب کے قیام کے بعد ان کے بغیر میگزین کا اجرا ہو رہا ہے۔ بیگم کہکشاں خان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق اپنا معلوماتی مضمون پڑھ کر سنایا۔ بیگم نکہت بلگرامی نے ایک نظم پیش کی۔ عفت صدیقی نے اپنی دو عمدہ نظمیں سنا کر حاضرین سے داد وصول کی۔ آصف اظہارعلی نے اپنا افسانہ 'تائی جی' حاضرین کے روبرو پیش کیا جسے کافی سراہا گیا۔ میزبان کے فرائض انجام دیتے ہوئے شیدا اسلمان نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جولائی 2019

بشیر فاروقی پر مذاکرہ

لکھنؤ: نسیم اختر صدیقی اکادمی اور روبرو فاؤنڈیشن کے زیراہتمام بابا ٹھاکرداس انٹر کالج کے کشادہ ہال واقع رسی بٹان میں شہر لکھنؤ کے ممتاز و منفرد شاعر بشیر فاروقی کو یاد کیا گیا۔ ناقد اور محقق پروفیسر فضل امام نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ بشیر فاروقی اسم بامسمّیٰ تھے، دیگر اوصاف کے ساتھ شعری رموز و نکات سے کماحقہ واقف تھے۔ لکھنؤ والوں کو ان کی یاد کی شمع روشن رکھنی چاہیے۔ سہیل کاکوروی نے کہا کہ مرحوم بشیر فاروقی نے آبرومندانہ زندگی گزاری، تغزل کے دائرے بھی بنائے، اور تصوف و دیگر موضوعات سے شغف بھی رکھا۔ نجیب مصر اشوق کے مطابق حب الوطنی اور روحانیت ان کی شاعری میں رچی بسی تھی۔ ناظم مذاکرہ رضوان احمد فاروقی نے ان کی شخصیت اور فن پر کتاب کی اشاعت پر زور دیا اور ان کی غیر مطبوعہ نعتیں پیش کیں۔ صوفی سید اظہار علی نے بشیر فاروقی کو صاحب نسبت شاعر قرار دیا۔ روبرو فاؤنڈیشن کے سکریٹری اظہر حسین نے آئندہ بھی اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد کا اعلان کیا۔ فرزند بشیر مبشر فاروقی (مکی) نے شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جولائی 2019

اردو کی اہمیت اور معنویت

فیض آباد: اردو بچاؤ تحریک کے تحت 'اردو کی اہمیت اور معنویت' کے موضوع پر ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت تحریک کے صوبائی جنرل سکریٹری ارشاد ربانی اور نظامت قاری ندیم فیضی نے کی۔ جمال الدین سفر کی زیرسرپرستی منعقد ہوئے اس پروگرام میں امبیڈکر نگر کے استاد محمد اسلم خان نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی زبان ہے، جسے گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ زبان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کسی خاص قوم یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ ہندوستان کی بیشتر تہذیبوں اور ثقافتوں کا علمی ورثہ اس زبان میں موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی پرورش و پرداخت کسی ایک فرقہ یا طبقہ یا مذہب کے ماننے والوں نے نہیں کی بلکہ اس میں تمام ہندوستانیوں کی شرکت رہی ہے۔ محمد اسلم خان نے کہا کہ آج کے دور میں ایسے غیرمسلموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اردو سے پیار کرتے ہیں، جنھیں اس سے عشق ہے اور جو اس کی بقا کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آخر میں ارشاد ربانی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو کے تحفظ اور اس کے حقوق کی لڑائی ان تمام لوگوں کو لڑنی چاہیے جو اردو سے محبت کرتے ہیں یا پھر جن کی روزی روٹی کا سلسلہ اردو کے توسط سے قائم ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اردو کی ترویج و ترقی کے لیے اس مہم میں شریک ہوں۔ انھوں نے محبان اردو سے اپیل کی کہ خدارا اس کا عملی ثبوت بھی پیش کرنے کی کوشش کریں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جولائی 2019

ڈاکٹر الف ناظم کو الوداعیہ

دیوبند: پروفیسر عنوان چشتی مرحوم کے قائم کردہ شاہ ولایت موڈرن گرلز ہائی اسکول میں بزم ابر اور انجمن ترقی

اردو کے اشتراک سے ڈاکٹر الف ناظم صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج دیوبند کے اعزاز میں ایک وداعیہ نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سابق ممبر پلاننگ کمیشن اتراکھنڈ پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم مخلص

خادم اردو ہیں، جن کی متعدد مطبوعہ کتابیں ہیں۔ مثلاً بیان مصحفی، مصحفی اور مثنویات مصحفی، سرور جہان آبادی اور اکبر سخن نیز سرور جہان آبادی کا نو دریافت کلام کے علاوہ عنوان چشتی کی شاعری پر ایک کتاب زیر طباعت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم مصحفی اور سرور جہان آبادی پر خاص نظر رکھتے ہیں اور سنجیدہ تنقیدی رجحانات کے ساتھ مصروف سفر ہیں۔ مولانا تنویر صدیقی نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم ہمہ وقت اردو کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور وہ ایک تخلیقی فنکار بھی ہیں۔ مولانا رئیس کلیری نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم علم عروض کا درک رکھتے ہیں۔ حافظ ابراخادم نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم اچھے ادیب اور دردمند انسان ہیں۔ نیاز منگلوری نے کہا کہ ڈاکٹر الف ناظم قلیل مدت کے لیے دیوبند میں قیام پذیر ہوئے مگر محبان اردو کے دلوں پر انمٹ چھاپ رکھتے ہیں۔ صحافی رضوان سلمانی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر الف ناظم کے اخلاق و کردار کو سراہا۔ ڈاکٹر اسلم قاسمی نے الف ناظم کی تنقیدی بصیرت پر پر مغز معلومات فراہم کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 15 جولائی 2019

امیر مینائی کی علمی خدمات

رام پور: معروف علمی و ادبی کتب خانہ رام پور رضا لائبریری کے خیابان رضا میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی سابق صدر شعبۂ اردو رضا پی جی کالج کی صدارت میں ایک توسیعی خطبہ 'امیر مینائی کی علمی خدمات' پروفیسر ایس فضل امام سابق صدر شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی جے پور نے پیش کیا۔ ڈائرکٹر لائبریری ڈاکٹر سید حسن عباس نے ابتدائی کلمات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ امیر مینائی 21 فروری 1829 کو شاہ نصیر الدین شاہ حیدر نواب اودھ کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق امیر احمد نامی مولوی کرم محمد کے صاحبزادہ اور مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تھا۔ درسی کتب مفتی سعد اللہ اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محلی سے پڑھیں۔ خاندان صابریہ چشتیہ کے سجادہ نشین امیر شاہ سے بیعت تھی۔ پروفیسر ایس فضل امام نے کہا کہ امیر مینائی نے شاعری میں اسیر لکھنؤ کی شاگردی اختیار کی۔ 1852 میں نواب واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی اور حسن الحکم دو کتابیں شاد سلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کیں۔ 1857 کے بعد نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر رام پور گئے۔ ان کے فرزند نواب کلب علی خاں نے ان کو اپنا استاد بنایا۔ نواب کے انتقال کے بعد رامپور چھوڑا۔

بعد میں حیدرآباد میں بیمار ہوگئے اور 13 اکتوبر 1900 کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نہ صرف ایک بہترین شاعر بلکہ لغت نویس اور ماہر لسانیات تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اگست 2019

اتر پردیش: پی سی ایس جے میں مسلم نوجوانوں کا جلوہ

لکھنؤ: اتر پردیش پبلک سروس کمیشن (یو پی پی ایس سی) کی طرف سے جیوڈیشیل سروسز (سول جج جونیئر ڈویژن) ایگزام 2018 کے نتائج میں لکھنؤ کی آنکانکشا تیواری سرفہرست رہی ہیں جبکہ اس بار مسلم نوجوانوں نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرکے تاریخ رقم کردی ہے۔ پی سی ایس جے میں اس مرتبہ 39 مسلمانوں نے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے، ان میں 18 خواتین شامل ہیں۔ مسلم امیدواروں میں شاہنواز صدیقی سرفہرست ہیں۔ انھوں نے امتحان میں 11 ویں رینک حاصل کی ہے، جبکہ لڑکیوں میں حنا کوثر کو 96 ویں رینک حاصل ہوئی ہے۔ یو پی پی ایس سی کا یہ امتحان 16 دسمبر 2018 کو منعقد ہوا تھا، جس میں کل 64691 امیدوار شریک ہوئے تھے۔ پریلمس کا نتیجہ 4 جنوری 2019 کو جاری ہوا اور اس میں 6041 امیدواروں کو کامیاب قرار دیا گیا۔ امتحان میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کا امتحان الہ آباد اور لکھنؤ کے مراکز میں 30 اور 31 اور یکم جنوری کو منعقد ہوا۔ امتحان میں کل 5795 امیدوار شریک ہوئے تھے۔ 13 جون 2019 کو مین امتحان کا رزلٹ جاری کیا گیا اور 1847 امیدواروں کو انٹرویو کے لیے کامیاب قرار دیا گیا۔ انٹرویو 21 جون 2019 کو کرایا گیا، جس میں 1823 امیدوار شامل ہوئے، جبکہ 24 امیدوار غیر حاضر رہے۔ انٹرویو کے بعد کل 610 امیدواروں کو کامیاب قرار دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جولائی 2019

بہار:

یوم خدا بخش تقریبات

پٹنہ: 2 اور 3 اگست خدا بخش خاں کی ولادت اور وفات کا دن ہے۔ اسی مناسبت سے ہر سال اگست کے پہلے ہفتہ میں یوم خدا بخش تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ 3 اگست 2019 کو صبح 6 بجے سے 9 بجے تک قرآن خوانی، گلپوشی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا سید شاہ مصباح الحق عمادی، سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب نے خصوصی طور پر فاتحہ خوانی میں شرکت کی اور اپنے ناصحانہ کلمات سے سامعین کو مستفیض کیا۔ بعد نماز مغرب جلسہ سیرت النبی کی محفل منعقد ہوئی۔ قاری محمد اکرم سابق مدرس، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نے تلاوت قرآن پاک اور نعت پاک سے جلسہ کا آغاز کیا۔ مولانا عتیق اللہ قاسمی نے سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ رسول پاکؐ کی بعثت کے اہم مقاصد میں مکارم اخلاق کی تکمیل بھی ہے۔ خود قرآن میں موجود ہے کہ آپ اخلاق کی اعلیٰ بلندی پر فائز ہیں۔ یہ اخلاق ہی ہے جو دلوں کو جوڑتا ہے۔ اس موقعے سے اکبر رضا جمشید، ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، این سی ماتھر اور پنکج نے مختصر اور جامع الفاظ میں سیرت نبوی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو اپنانا چاہیے جنھوں نے ایکتا اور بھائی چارے کی تعلیم دی، جنھوں نے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ سے پرہیز سکھایا اور سب سے زیادہ اخلاق پر زور دیا۔ ڈاکٹر شائستہ بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے یوم خدا بخش تقریبات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ آج اگر ہم کتاب و سنت پر عمل پیرا ہوں تو دنیا میں امن و آشتی کی فضا قائم ہوجائے۔ اخلاق و محبت اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی بنیادی روح ہے اور یہ ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں مغل، راجپوت، تجور مصوری کے بہترین نمونے ہیں جن کی نمائش لگائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان میں خاص کر شاہ نامہ کے کئی نسخے ہیں۔ ہندو مت پر بہترین مصور نسخے ہیں جیسے بھگوت گیتا، رامائن، سراکبر وغیرہ۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اگست 2019

شمیم مظفرپوری اور جمیل مظہری یادگاری تقریبات

پٹنہ: شمیم مظفرپوری ایک مایہ ناز ادیب، بہترین افسانہ نگار، اعلیٰ ناول نگار، عمدہ انشائیہ نگار اور ریڈیائی ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے سہارے ہر میدان میں اپنا سکہ جمایا۔ انھوں نے سیکڑوں کہانیاں، ایک ناولٹ، چار ناول، کئی درجن مزاحیہ مضامین کے علاوہ کئی خاکے، تقریباً ایک درجن ریڈیائی ڈرامے اور سیکڑوں اداریے سپرد قلم کرکے ملک کے معروف فنکاروں میں اپنا مقام پیدا کیا۔ ان کے ان کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار امتیاز احمد کریمی نے کیا۔ وہ اردو ڈائرکٹوریٹ

کے زیرِ اہتمام اَبھیلیکھ بھون، بیلی روڈ میں منعقد 'شمین مظفرپوری اور علامہ جمیل مظہری کی یادگاری تقریبات' سے خطاب کررہے تھے۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ممتاز احمد خاں نے کی۔ طلبا و طالبات میں حذیفہ شکیل، ریحان احمد، شیریں آفتاب نے شمین مظفرپوری پر اپنی کاوشیں پیش کیں۔ ڈاکٹر ساجد حسین، اکٹر ابرار احمد اجراوی، ڈاکٹر صوفیہ شیریں اور ڈاکٹر عارف حسن وسطوی نے شمین مظفرپوری کی حیات و خدمات پر اپنے قیمتی مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس میں علامہ جمیل مظہری کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اس میں پروفیسر ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر عاصم شہواز شبلی، شعبہ اردو مولانا آزاد کالج کولکاتا، ڈاکٹر غالب، ناقد و ادیب، رانچی نے مشترکہ طور پر بتایا کہ جمیل مظہری ایک بلند پایہ قادرالکلام شاعر، صاحبِ طرز نثر نگار، ایک پرجوش مجاہد آزادی، ایک شفیق استاد اور ایک خلیق انسان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ غزل میں وہ فیض و فراق جیسے ممتاز ہم عصر شعرا کے رفیق سفر رہے ہیں۔ نئی نسل کی پیش کش کے تحت تنویر، عالیہ نعمت، سید ذیشان احمد نے جمیل مظہری کی حیات و خدمات پر اپنی باتیں پیش کیں۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے ابتدائی کلمات پیش کیے اور دونوں اجلاس کی نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جولائی 2019

اردو میں غیرافسانوی نثر

مظفرپور: بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں غیرافسانوی نثر کے موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا افتتاح پروفیسر آر کے منڈل پرووی سی بہار یونیورسٹی نے شمع روشن کرکے کیا۔ اس دو روزہ سمینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت پروفیسر رئیس انور رحمٰن ایل این متھلا یونیورسٹی نے کی۔ اس موقعے پر کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے غیرافسانوی ادب میں افسانویت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں جس موضوع کو منتخب کیا گیا اس میں بے شمار اصناف شامل ہیں، ان میں ایک بات تو مشترک ہے کہ یہ سب تو افسانہ نگاری سے الگ ہیں لیکن اس کے بیان و تحریر میں افسانوی رنگ ضرور مل جایا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے تفصیل سے غیرافسانوی نثر ایک تجزیہ، رپورتاژ نگاری کا فن، اردو میں خودنوشت نگاری، مکالمہ نگاری اور سوانح نگاری پر کلیدی خطاب کیا۔ شعبہ کی طالبہ رقیہ پروین، حشمت پروین نے 'کہاں ہے میرا ہندوستان' نظم پیش کرکے حاضرین کو محظوظ کیا۔ مہمانوں کا استقبال شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر حامد علی کان نے گلدستہ پیش کرکے کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 17 جولائی 2019

تلنگانہ:

گائیڈنس اسکول میں ڈائرکٹر این سی پی یو ایل کو استقبالیہ

حیدرآباد: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ڈائریکٹر این سی پی یو ایل اپنے حیدرآباد دورہ کے موقع پر ایک ایسے مثالی اسکول کا

دورہ کیا جہاں 500 سے زاید طلبا و طالبات کو مفت اور معیاری تعلیم دی جاتی ہے، اس اسکول کا نام گائڈنس اسکول ہے جہاں شہر حیدرآباد کی مخلص شخصیات کے مشورے سے بہتر تعلیم میرٹ کی بنیاد پر دی جاتی ہے، آج کے مہمان خصوصی اور بچوں کے مرکز نگاہ شیخ عقیل احمد تھے، خیر مقدمی تقریر میں اسکول سکریٹری جناب فیض احمد مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے اسکول کی رپورٹ پیش کی، ڈاکٹر مختار احمد فردین نے مکمل تعارف کراتے ہوئے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے علمی خدمات سے روشناس کرایا۔ خصوصی خطاب میں بچوں سے شیخ عقیل احمد نے انھی کی زبان میں بات کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ تعلیم حاصل کرکے ملک و قوم کا نام روشن کریں تو آپ کا مستقبل بھی شاندار ہوگا۔ قابل ستائش ہیں اسکول انتظامیہ، جنھوں نے ضرورتمند طلبا و طالبات کے لیے یونیفارم کا مکمل سیٹ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کیا۔ دیانت چیریٹیبل ٹرسٹ خاموش طریقے سے سماج کی ضرورت پورا کرنے میں مصروف ہے، دیگر مہمانان نے بھی اپنے خطاب میں بچوں کو تعلیم ایمانداری سے حاصل کرنے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر فیض احمد اور ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر وہاج انصاری جاوید لئیق اسکول کرسپانڈنٹ اور مولانا ندوی میڈم مہیشوری اور طالبات نے پروگرام کے اہتمام میں پیش پیش رہے۔ اس خاص موقعے پر ڈاکٹر غوثیہ صاحبہ کو اردو انمول رتن ایوارڈ سے نوازا گیا اور میڈم ارچنا کو تلگو رتن ایوارڈ جناب جاوید لائق صاحب کو بیسٹ ٹیچر انمول رتن ایوارڈ ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کے ہاتھوں دیا گیا، صدائے شبلی کا خصوصی شمارہ پروفیسر شیخ عقیل احمد صاحب کے ہاتھوں کیا گیا اور اس کے بعد ووکیشنل ٹریننگ کے سرٹیفکیٹ مہمانان کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے، آخر میں تمام طلبا و طالبات میں یونیفارم تقسیم کیے گئے، پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے طالبعلم نے کیا اور شکریہ ڈاکٹر فیض احمد نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: مختار احمد فردین، حیدرآباد، 5 اگست 2019

نصابی اور علمی کتابوں کی فروخت کاؤنٹر کا افتتاح

حیدرآباد: علوم کی ترویج میں کتابوں کی اشاعت اور سوشل میڈیا کے ذریعے ان کے پھیلاؤ کا بہت اہم کردار ہے اور یہ بات قابل ستائش ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ان دونوں محاذوں پر انتہائی محنت سے کام کررہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے کیا۔ وہ یونیورسٹی میں ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے کتابوں کے سیلس کاؤنٹر کے افتتاح کے بعد مرکز مطالعات اردو ثقافت کے کانفرنس ہال میں شرکا سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو یونیورسٹی کو نوڈل ایجنسی بن کر اردو کے تئیں سارے ہندوستان میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی انھوں نے ڈائرکٹوریٹ کو مشورہ دیا کہ وہ علمی ادب کو غیرافسانوی ادب کے زمرے میں شامل کرنے کا جرأت مندانہ کام انجام دے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں دیوانگی سے کام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ فرزانگی دیوانگی کے قدم چومتی ہے۔

ڈاکٹر عابد معز، مشیر، اردو مرکز برائے فروغ علوم، مانو نے بھی اس تقریب سے خطاب کیا۔ اس سے قبل پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈائرکٹر، نظامت ترجمہ و اشاعت نے پاور پوائنٹ پریزنٹیشن کے ذریعے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کے قیام کی ضرورت اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈائرکٹوریٹ سے شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف پیش کیا اور بتایا کہ ڈی ٹی پی تین قسم کی کتابیں یعنی فرہنگیں، علمی کتب اور نصابی کتب شائع کرتا ہے۔ انھوں نے ڈائرکٹوریٹ سے شائع ہونے والے ادبی و تحقیقی جریدہ 'ادب و ثقافت' کا بھی تعارف کروایا جو کہ مانو کا پہلا تحقیقی جریدہ ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 15 جولائی 2019

ہریانہ:

شبانہ ومحمد عاقل نے اردو سبجیکٹ میں کیا یونیورسٹی میں ٹاپ

نوح، میوات: حال ہی میں مہرشی دیانند یونیورسٹی روہتک کے جاری ہوئے ایم اے اردو کے نتائج میں صوبہ ہریانہ کے تعلیمی، اقتصادی ومعاشی اعتبار سے انتہائی پسماندہ ضلع میوات کے 2 طالب علموں نے صوبہ میں اول پوزیشن حاصل کر کے اپنے کالج وعلاقہ کا نام صوبہ کی سطح پر روشن کیا ہے۔ جہاں ایک طرف یٰسین میو ڈگری کالج کی ہونہار طالبہ شبانہ بنت مقبول ساکن کھیڑلا نوح نے 89 فیصد نمبر حاصل کر کے لڑکیوں میں اول پوزیشن حاصل کی، وہیں یٰسین میو ڈگری کالج کے ہی دوسرے ہونہار طالب علم محمد عاقل ولد شمس الدین ساکن گلالتہ پونہانا نے ایم اے سال اول کے سالانہ امتحانات میں 77 فیصد نمبر حاصل کر کے لڑکوں میں صوبہ میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ دونوں طلبا کی اس نمایاں کامیابی پر نہ صرف ان کے آبائی گاؤں کھیڑلا وگلالتہ میں بلکہ علاقہ بھر میں خوشی کا ماحول ہے۔ طالب علم محمد عاقل اردو سبجیکٹ میں پی ایچ ڈی کرنے کا خواب رکھتے ہیں جبکہ طالبہ شبانہ اردو مضمون میں اسسٹنٹ پروفیسر بن کر میوات میں تعلیم کی شمع روشن کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کامیابی کا سہرا اپنے والدین کی دعا وخاص طور سے اپنے استاذ محترم اسسٹنٹ پروفیسر ناصر الدین اظہر کی محنت کے سر باندھا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 جولائی 2019

اعزاز و اکرام:

شفیق الحسن کے اعزاز میں تقریب

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے زیر اہتمام 2 سال قبل سے سوشل میڈیا کے ذریعے نیوز کلپنگ شیئر کرنے والے معروف جرنلسٹ وسماجی خدمتگار محمد شفیق الحسن کے اعزاز میں منعقد ایک تقریب میں اہم شخصیات نے شرکت کرتے ہوئے انھیں مبارکباد دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ خیال رہے کہ شفیق الحسن یومیہ مقررہ وقت پر ہندوستان بھر کے اہم اردو، ہندی و انگریزی کے اخبارات کی مخصوص خبریں وہاٹس ایپ، فیس بک، انسٹا گرام، ٹوئیٹر کے ذریعے اہم شخصیات کو شیئر کرتے ہیں اور یہ خدمت پچھلے 763 دنوں سے بلا ناغہ بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ آئی آئی سی سی کے آڈیٹوریم میں منعقد پروگرام کا آغاز مولوی قاری حفظ الرحمٰن کی تلاوت قرآن مجید سے کیا گیا، جبکہ متین امروہوی نے شفیق الحسن کی خدمات کے اعتراف میں نظم پیش کی اور نظامت معروف صحافی عبدالودود ساجد نے کی۔ اس موقعے پر معززین شہر نے موصوف کی ستائش کی اور کہا کہ یقیناً یہ ان کے جنون کی بدولت ہی ممکن ہو پایا ہے، کیونکہ اکیلے کام کرنا نہایت مشکل ہے، لیکن شفیق صاحب نے اپنی اہم ذمے داری سمجھتے ہوئے اسے بخوبی انجام دیا۔ پروگرام کے روح رواں محمد شفیق الحسن ولد ظہور حسن (نیتا) نے اپنے خطاب میں سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میری اہلیہ وصاحبزادگان کے تعاون کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا اس لیے میں تمام اہل وعیال کا مشکور وممنون ہوں۔ لوک سبھا کے ممبر کنور دانش علی نے اپنی تقریر میں شفیق صاحب کو نیک خواہشات پیش کیں اور کہا کہ اخبارات کی کٹنگ بھیجنا آسان لگتا ہے، مگر یومیہ مقررہ وقت پر بھیجنا یقیناً مشکل کام ہے اور اس خدمت کو شفیق صاحب بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ مسٹر دانش علی نے مزید کہا کہ ان کی خدمات کے اعتراف میں پدم شری ملنا چاہیے اور میں اس کے لیے جلد ہی خط لکھوں گا، ساتھ ہی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی نام اندراج کی کوشش کروں گا۔ سابق سفیر اور کانگریس کے قومی ترجمان م افضل کا کہنا تھا کہ یہ انوکھی خدمت ہے، جس پر نئی نسل کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی (حیدرآباد) کے چانسلر فیروز بخت احمد نے کہا کہ اس کام کو مزید آگے لے جانے کی ضرورت ہے تاکہ قوم وملت کو خبروں کے ذریعے بیدار کیا جا سکے۔ صدارتی خطبے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (جودھپور) کے چانسلر پروفیسر اختر الواسع نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ شفیق صاحب کی خدمات نئی نسل کے لیے ایک پیغام ہے کہ کس طرح سے جدید ٹکنالوجی کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 جولائی 2019

ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کو شہریار ایوارڈ

سردھنہ: راجکیہ صنعتی اور زراعتی نمائش، علی گڑھ کی جانب سے نوجوان شاعر اور عمدہ ناظم ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کو

ان کے شعری مجموعہ 'خوشبو ادھر ادھر' پر عالمی شہرت یافتہ شاعر وادیب شہریار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نمائش میدان کے گیسٹ ہاؤس میں ایک اعزازی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعرہ ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر نے کی، ضلع مجسٹریٹ علی گڑھ چندر بھوشن سنگھ نے مہمانِ خصوصی اور اے ڈی ایم سٹی راکیش کمار مالپانی نے مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر راکیش سکسینا نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

اس موقعے پر مہمانِ خصوصی چندر بھوشن سنگھ ضلع مجسٹریٹ علی گڑھ، پروگرام کی صدر ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر اور مہمانِ اعزازی راکیش کمار مالپانی اے ڈی ایم سٹی نے مشترکہ طور پر ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی کو بطور ایوارڈ ایک لاکھ ایک ہزار روپے کا چیک، ایک سند اور ایک نشانِ یادگار دے کر اعزاز سے نوازا۔

پریس ریلیز: فرقان احمد، سردھنہ، 30 جولائی 2019

حنیفہ زارا کو انڈیا انوویشن اینڈ امپیکٹ ایوارڈ

نئی دہلی: سوچھ بھارت مشن کی برانڈ ایمبسڈر تمل ناڈو میں امبور کی رہنے والی سات سالہ بچی حنیفہ زارا کو ہیلتھ فار ہیومینٹی انڈیا انوویشن اینڈ امپیکٹ ایوارڈ 2019 سے نوازا گیا ہے۔ لڑکی کو حفظانِ صحت کے تئیں اس کے جذبے اور صفائی ستھرائی کے متعلق بیداری پھیلانے کی سمت میں اس کی خودسپردگی کے لیے یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔ حفظان صحت پر کوئی سمجھوتہ نہیں کے رخ کو دیکھتے ہوئے حنیفہ کو مرکزی حکومت کے حفظان صحت کے پروگرام

سووچھ بھارت مشن کا برانڈ ایمبسڈر بنایا گیا تھا۔ حنیفہ نے گھر میں بیت الخلا نہ بنانے کے لیے اپنے والد کے ہی خلاف مقامی پولس میں شکایت درج کرائی تھی۔ نہ صرف اپنے گھر میں بیت الخلا تعمیر کرایا بلکہ مزید بیت الخلا تعمیر ہوں، اس کے لیے اپنے گاؤں کے لوگوں کو بیدار کیا۔ حنیفہ کے ساتھ دو اور افراد رمیش کمار، ہیرالال اور تین تنظیموں کو شل بھواسکل سلوشن، دھن فاؤنڈیشن اور گرام اتتھان کو ستی رہائش، قائمی صفائی اور ڈیزاسٹر مینجمنٹ کے شعبے میں ان کے مثالی کام کے لیے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ دارالحکومت میں منعقدہ 7 ویں ایشیا پیسفک ہاؤسنگ فارم کے دوران یہ ایوارڈ دیے گئے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 22 جولائی 2019

رسم اجرا:

غبارِ دل

نئی دہلی: اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نے کہا کہ اردو ہندوستان کی تہذیب ہی نہیں، بلکہ ہندوستانی تہذیب کا چہرہ بھی ہے اور چہرہ کتنا خوبصورت ہوتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ بات انھوں نے غالب اکادمی میں ادبی ثقافتی تنظیم تہذیب کے زیر اہتمام سید ضیا الرحمٰن غوثی کی کتاب 'غبارِ دل' کا اجرا کرتے ہوئے کہی۔ 'غبارِ دل' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ غوثی صاحب بنیادی طور پر اردو کے سچے خادم ہیں۔ اردو کے تئیں لگاؤ اور اردو کی زبوں حالی پر ان کا درد ان کے اداریے میں جھلکتا ہے اور انھوں نے صحافت میں قدم اس وقت رکھا تھا جب ان کی عمر محض دس سال تھی۔ اس عمر میں انھوں نے قلمی رسالہ 'کہکشاں' شروع کیا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ اس کتاب میں کچھ تو بات ہے۔ اس میں صرف تلخ نوائی ہی نہیں بلکہ اس میں سچائی، بے باکی اور حق گوئی بھی ہے۔ انھوں نے بے باکی کے ساتھ تمام مسائل پر لکھا ہے اور قومی و بین الاقوامی مسائل پر بے باک رائے کا اظہار کیا ہے اور کسی لمحے اپنے ضمیر کی آواز کو دبنے نہیں دیا ہے۔ معروف نقاد اور صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی نے ماہنامہ مسرت کو بہار کا بچوں کا پہلا رسالہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس رسالہ نے نہ صرف معیار قائم کیا بلکہ بڑے بڑے اردو کے ادیب اور قاری پیدا کیے۔ انھوں نے کہا کہ غوثی صاحب کی خصوصیت تلخ نوائی ہے اور وہ ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ماہنامہ مسرت نے بچوں کے ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ معروف مصنف اور ادیب فاروق ارگلی نے تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر غوثی سے اپنے 40 سالہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کتاب دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک رپورتاژ، تاریخ، سفرنامہ اور ادب و کلچر کے بارے میں لکھا ہے۔ ہندی اردو کی معروف افسانہ نگار کرن شبنم نے غبارِ دل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں عوامی مسائل کا جس طرح احاطہ کیا گیا ہے اور اردو کے تعلق سے جس درد کا اظہار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے اس کتاب کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔ جدید خبر کے ایڈیٹر اور معروف صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ غوثی صاحب اردو کے شیدائی ہیں اس لیے غبارِ دل رکھتے ہیں اور ان کی یہ کتاب اسی درد کا اظہار ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح اردو کی کتابیں چھپ رہی ہیں اسی طرح قاری کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ امریکہ اور یوروپ میں لوگ کتابوں سے دوستی کرتے ہیں لیکن یہاں لوگ کتابوں سے بھاگتے ہیں۔ اردو کے مصنف اور سابق ایس ڈی ایم عظیم اختر نے کہا کہ غوثی نے اپنے کڑوے تجربات کو صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔ آل انڈیا تنظیم علمائے حق کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے کہا کہ صحافت وہ طریقہ ہے کہ اگر صحیح ہو تو کامل رہبر بن جاتا ہے اور غلط ہو تو قاتل و رہزن بن جاتا ہے اور غبارِ دل سے کامل رہبری ملتی ہے۔ غبارِ دل کے مصنف سید ضیاء الرحمٰن غوثی نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ نظامت کے فرائض معروف صحافی سہیل انجم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جولائی 2019

حیدرآباد میں اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ

حیدرآباد: حیدرآباد میں میڈیا پلس کے اے سی ہال میں 18 جولائی 2019 کو ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ کی معرکہ آرا تحقیقی کتاب 'حیدرآباد میں اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ' کی رسم اجرا احمد علی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام پروفیسر اشرف رفیع سابقہ صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس ادبی تقریب کے مہمانانِ اعزازی تھے۔ محترم رحیم الدین انصاری چیئرمین تلنگانہ اردو اکادمی، جناب عبدالرحمٰن سلیم آرکیٹکٹ جو امریکہ سے تشریف لائے۔ دوحہ قطر سے یاور حسین صاحب نے شرکت فرمائی۔ ادبی تنظیم کے صدر جاوید افروز نے مہمانانِ خصوصی و اعزازی کا استقبال کرکے اپنی نظامت کے جوہر دکھائے۔ ڈاکٹر م ق سلیم نے ڈاکٹر ناہیدہ سلطانہ کی کتاب کے ابواب کی تقسیم کے حوالے سے گفتگو کی۔ اسی طرح ڈاکٹر جاوید کمال نے بڑے شگفتہ انداز میں محترمہ کی تحقیقی صلاحیتوں کو سراہا۔ ڈاکٹر سمیہ تمکین اور ڈاکٹر حمیدہ بیگم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رؤف خیر، حیدرآباد، 20 جولائی 2019

شہنشاہِ تغزل جگر مرادآبادی

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں، ٹھاکرگنج میں بریلی کی معروف شاعرہ و ادیبہ ڈاکٹر شگفتہ غزل کی تازہ ترین تصنیف 'شہنشاہِ تغزل جگر مرادآبادی' کا اجرا شاندار پیمانہ پر اترپردیش اردو اکادمی کی چیئرپرسن پروفیسر آصفہ زمانی کے دست مبارک سے ہوا۔ اس موقع پر مہمانانِ گرامی میں صدر تقریب و خوش فکر شاعرہ سلمہ حجاب کے علاوہ ڈاکٹر جہاں آرا سلیم اور مجیب صدیقی کرنیل گنجوی بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر منصور حسن خاں کی سرپرستی اور شکیل گیاوی کی نظامت میں منعقد ہونے والی اس ادبی و شعری تقریب کے مہمانوں کا استقبال صدر شعبہ کیمیا شیعہ پی جی کالج ڈاکٹر ثروت تقی نے کیا۔ بطور تبریک آغاز تقریب ڈاکٹر منصور حسن خاں کی نعت پاک سے ہوا۔ اس کے بعد محمد کلیم خاں اور صادقہ تسنیم نے جگر مرادآبادی کی غزل اپنی خوش الحان آواز سے پیش کی۔ ڈاکٹر ثروت تقی نے شگفتہ غزل

کی کتاب پر ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی کا سیر حاصل مقالہ بھی پیش کیا اور مجیب صدیقی نے اجرا شدہ کتاب کی روشنی میں جگر مرادآبادی کی حیات وخدمات کی روشنی میں ان گوشوں سے روشناس کرایا جس کا تذکرہ کتابوں میں مشکل سے ملتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر آصف زمانی نے کہا کہ زیر نظر کتاب کے سرسری مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نثر میں یوں تو جگر مرادآبادی پر بہت کام ہوا ہے مگر شگفتہ غزل کی تازہ کتاب 'شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی' ریسرچ اسکالرس کے لیے کافی معاون ثابت ہوگی۔ صدر تقریب سلمہ حجاب نے کہا کہ جب تک شگفتہ غزل جیسی مصنفہ ہمارے ملک میں زندہ ہیں اردو زبان وادب کی تعمیر و ترویج میں رکاوٹ نہیں آسکتی۔ ان کی کتاب 'شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی' یقیناً عصر حاضر کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

پریس ریلیز: جلال الدین جلال لکھنوی، لکھنؤ، 27 جولائی 2016

سفرنامہ 'امام بخاری کے ملک میں چندروز'

نئی دھلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو

یونیورسٹی، نئی دہلی کی جانب سے ازبکستان سے آئے 13 اردو اور ہندی کے اساتذہ کو استقبالیہ دیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر اساتذہ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے تھے اور باقی اساتذہ لال بہادر شاستری اسکول اور تاشقند کے دیگر جامعات سے تھے۔ یہ سب کے سب علمی اور ادبی دورے پر ہندوستان آئے ہوئے ہیں۔ پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے چیئرمین پروفیسر اوم پرکاش سنگھ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ آج اتنی بڑی تعداد میں ازبکستان کے اردو ہندی اسکالرس ایک ساتھ جمع ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ ازبک اور ہندوستان کا رشتہ کافی قدیم ہے جس کی مضبوطی میں ہندوستانی زبان سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اہم موقعے پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی کتاب سفرنامہ' ازبکستان 'امام بخاری کے ملک میں چندروز' کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ اس کتاب میں ازبکستان کی تہذیب وثقافت کو ایک اردو اسکالر کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ازبکستان اور ہندوستان کا صدیوں پرانا تہذیبی پس منظر بھی اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ ازبکستان سے آئیں پروفیسر الفت محبّ نے اظہار خیال کرتے ہوئے ازبکستانی اسکول اور دانش گاہوں میں اردو اور ہندی کی تعلیمی صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ ہم سب کو ہندوستان خاص طور پر جے این یو سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا رشتہ یوں ہی برقرار رہے گا اور ہم سب اردو اور ہندی کی خدمت کرتے رہیں گے۔ دیگر مندوبین میں ڈاکٹر مرتضی خوجائیوا مکتوبہ، ڈاکٹر صادقوا موجودہ، ڈاکٹر شرماتوا گلیورا، ڈاکٹر سلیمانوا معموار، ڈاکٹر ایرگا شیوا کمولہ، ڈاکٹر مرزائیوا مخرم، ڈاکٹر نصیروا دلدورا، ڈاکٹر حبیبوا عزیزہ، ڈاکٹر رحمت جان کمولہ، ڈاکٹر محمد خوجائیوا امیدا، ڈاکٹر ترداخونوا محیا اور ڈاکٹر ذکروقدرت نے فرداً فرداً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جولائی 2019

کورڈرائیو

علی گڑھ: علی گڑھ کے کرکٹ کی تاریخ پر اکرام وارث کے ذریعے لکھی گئی کتاب 'کورڈرائیو' کی رسم اجرا بریلینٹ پبلک اسکول رام گھاٹ روڈ پر ہوا۔ اس موقعے پر کرکٹ کی دنیا سے جڑی کئی ہستیاں، تعلیمی میدان کی معروف شخصیات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی گیمس کمیٹی کے صدر موجود تھے۔ علی گڑھ کے کرکٹ کی تاریخ پر لکھی گئی 'کورڈرائیو' پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ان سبھی کھلاڑیوں کا ذکر ہے جنھوں نے علی گڑھ کو کرکٹ کی دنیا میں پہچان دلائی ہے۔ 'کورڈرائیو' میں ان کرکٹ کھلاڑیوں کا بھی ذکر ہے جو موجودہ وقت کی میں کرکٹ کی بلندی کو چھونے کے لیے میدان پر دن بھر پسینہ بہاتے ہیں۔ 'کورڈرائیو' میں مستقبل کے ستاروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مہمان خصوصی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی گیمس کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر امجد علی رضوی نے کہا کہ اکرام وارث نے علی گڑھ کے کرکٹ پر کتاب لکھ کر بہت ہی قابل تعریف کام کیا ہے۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر رکشپال سنگھ نے کہا کہ اکرام بھائی نے چھوٹی سی عمر میں بڑا کام کرکے دکھایا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جولائی 2019

قرآن انٹرپریٹیشن ان اردو: اے کریٹیکل اسٹڈی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے خلیق احمد نظامی مرکز برائے قرآنی مطالعات کے اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر نذیر احمد عبدالمجید کی مرتب کردہ کتاب 'قرآن انٹرپریٹیشن ان اردو: اے کریٹیکل اسٹڈی' کی اشاعت ویوابکس نے کی ہے۔ قرآن کریم کی مختلف اردو تفاسیر کے تنقیدی مطالعہ پر مبنی اس کتاب میں شاہ عبدالقادر کی تفسیر موضح القرآن (1829)، سید علی کی تفسیر توضیح الماجد فی تنقیح کلام اللہ الحامد (1836)، مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن (1908)، مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن (1930-36)، مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی (1960)، محمد کرم شاہ کی تفسیر ضیاء القرآن (1965)، محمد شفیع کی تفسیر معارف القرآن (1972) اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن (72-1949) کو خصوصی طور پر مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ کتاب میں پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر نذیر احمد عبدالمجید، ڈاکٹر محمد مبین سلیم، ڈاکٹر ابرار احمد، ڈاکٹر ایوب اکرم، ڈاکٹر رضا عباس، ڈاکٹر مشتاق احمد تجاروی، ڈاکٹر محمد رفیع الدین فاروقی، مسٹر رضی الاسلام اور مسٹر گوہر قادروانی وغیرہ کے مقالات شامل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 جولائی 2019

ہم تم دوست ہوئے

نئی دھلی: اس کائنات میں انسانی وجود کی اپنے چاروں طرف کے ماحول ہوا، پانی، زمین وآسمان سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ ماحول میں کثافت سے کرۂ ارض پر خوشگوار زندگی گزارنے میں رکاوٹ اور پریشانی پیدا ہوسکتی ہے۔ ماحولیات کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے بالخصوص بچوں میں بیداری پیدا کرنا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے الیکٹرانک میڈیا کی معروف شخصیت اور میڈیا کی درس وتدریس سے ایک طویل عرصہ سے وابستہ استاد منصور صفدر نقوی کی بچوں کے لیے لکھی گئی اردو کتاب 'ہم تم

عارف حسن وسطوی کی کتاب 'پروفیسر عبدالمغنی: ناقد ودانشور' کا اجرا

دوست ہوئے کے اجرا کے موقعے پر ماہنامہ 'آجکل' (اردو) کے دفتر سوچنا بھون میں منعقدہ ایک تقریب میں کیا۔ ماہنامہ 'آجکل' کے سینئر ایڈیٹر حسن ضیا نے کہا کہ منصور صفدر نقوی نے بچوں کو اردو زبان میں آسان اور دلکش پیرایہ میں ماحولیات اور اس کے تحفظ کی اہمیت سمجھانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ 'آجکل' اور 'یوجنا' کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کہا کہ بچوں کا ادب لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں ادب اطفال کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ ایسے میں یہ کتاب بچوں کے لیے ایک نعمت ہے۔ معروف فکشن نگار اور مصنف مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ ماحولیات ایک اہم موضوع ہے اور اردو میں بچوں کے لیے ماحولیات پر کتابیں تحریر کرنا اور اس موضوع پر فلمیں بنانا وقت کی ضرورت ہے۔ اس تقریب میں رضوان عباس، نرگس سلطانہ، ساحر داؤد نگری، آنند سور بھ، رقیہ زیدی، افتخار احمد اور دیگر مہمانوں نے شرکت کی۔ پروگرام کے آخر میں کنوینر رضوان عباس نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 اگست 2019

پروفیسر عبدالمغنی: ناقد ودانشور

پٹنہ: ادبی تنظیم 'ہم نشیں' بہار کے زیر اہتمام 30 جون 2019 کو الحرا پبلک اسکول شریف کالونی، پٹنہ کے اقرا ہال میں جواں سال اسکالر ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف 'پروفیسر عبدالمغنی: ناقد ودانشور' کی رسم اجرا بہار اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر جناب امتیاز احمد کریمی کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ تقریب کی صدارت ممتاز ادیب، ناقد وشاعر پروفیسر علیم اللہ حالی نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض 'ہم نشیں' کے جنرل سکریٹری اور سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے انجام دیے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کسی کتاب کی رسم اجرا کے موقع پر اتنا بڑا مجمع شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ مجمع دیکھ کر کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے مصنف کتاب ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں قومی سطح پر سمینار منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی نے تنقید کے حوالے سے اپنی منفرد اور معتبر پہچان بنائی تھی۔ جناب شفیع مشہدی نے کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی کے ادبی کارناموں کا اعتراف کرنا اردو والوں پر اب بھی قرض ہے۔

روزنامہ قومی تنظیم کے ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید نے اس موقع پر کہا کہ پروفیسر عبدالمغنی ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے اور ان کے ادبی وعلمی کارناموں کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ رسم اجرا کے اس موقع پر جواں سال شاعر وصحافی کامران غنی صبا نے 'پروفیسر عبدالمغنی: ناقد ودانشور' پر اپنا تحریری تبصرہ پیش کیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو 'ہم نشیں' کی جانب سے 'ہم نشیں ادبی ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ جناب شفیع مشہدی، پروفیسر علیم اللہ حالی، امتیاز احمد کریمی اور دیگر مہمانان نے ڈاکٹر عارف حسن وسطوی کو شال اور توصیفی سند پیش کر کے اعزاز سے نوازا۔

پریس ریلیز: عارف حسن، پٹنہ، 8 جولائی 2019

کچھ اور

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی جانب سے قطر سے تشریف لائے معروف شاعر افتخار راغب کی کتاب 'کچھ اور' کی رسم اجرا عمل میں آئی اور ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ ادیب اور شاعر چونکہ اقتدار کے ساتھ نہیں ہوتا اس لیے اس کے حصے میں تختہ دار آتا ہے۔ 'کچھ اور' شعری مجموعے کی رسم اجرا ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ انھوں نے افتخار صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ افتخار راغب، پیشے سے انجینئر ہیں لیکن ان کا ادبی شوق نہایت عمدہ ہے۔ وہ قطر اور ہندوستان کے ادبی پروگراموں میں مسلسل شریک ہوتے ہیں۔ آفتاب احمد نے بتایا کہ افتخار راغب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور آج کے اس مادہ پرستی کے زمانے میں وہ مادیت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے افتخار عارف کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ افتخار عارف کی شاعری میں سادگی ہے لیکن وہ مشکل سے مشکل بات کو نہایت آسانی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں تعمیری فکر اور بصیرت ہے۔ افتخار راغب سے جب گفتگو کی گئی اور ان سے قطر کے ادبی منظرنامے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ قطر کی ادبی فضا نہایت بہتر ہے۔ وہاں متعدد ادبی تنظیمیں سرگرم ہیں جو پابندی کے ساتھ ادبی مجالس کا انعقاد کرتی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اگست 2019

میرے تصور میں رنگ بھر دو

نئی دهلی: تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اور تسمیہ ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی نئی دہلی کے تعاون سے اوکھلا کے ادبی مرکز تسمیہ آڈیٹوریم میں ڈاکٹر بسمل عارفی کے 'مرے تصور میں رنگ بھر دو' شعری مجموعے کی رسم اجرا ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر سید فاروق اور نظامت مرزا ذکی احمد بیگ نے بحسن وخوبی انجام دی۔ مہمان خصوصی وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی اور سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شہپر رسول، مہمان ذی وقار پروفیسر کوثر مظہری شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ بسمل عارفی کے طرز شعری سادگی میں جو پرکاری ہے وہ دامن کو کھینچتی ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ بسمل عارفی انا گزیدہ شاعر ہیں، اپنی انا کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ صحافی سہیل انجم نے انھیں آج کی زندگی کا بہتر ترجمان شاعر بتاتے ہوئے آئندہ کا بہترین شاعر قرار دیا۔ اس موقعے پر صدر تعمیر ملت فاؤنڈیشن مرزا ذکی احمد بیگ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اگست 2019

محرم اسرار

پونہ: اردو زبان وادب اور فارسی زبان وادب کا دیرینہ تعلق ہے۔ اردو کی رگوں میں عربی اور ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی خون دوڑتا ہے۔ کلاسیکی اردو غزل کے

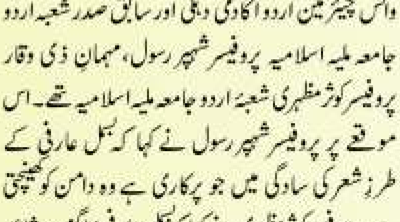

شاہکار نمونے اگر کسی فارسی شاعر سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں تو وہ ہیں فارسی غزل گویوں کے امام 'حافظ شیرازی'۔ یہ خیالات تھے اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی زبان کے معروف شاعر وادیب، مترجم اور محقق

جناب خان حسنین عاقب کے۔ انھوں نے یہ باتیں معروف شخصیت جناب محمد حسن اشرفی کی کتاب 'محرم اسرار' کی تقریب رونمائی کے موقعے پر کہیں۔ یہ کتاب حافظ شیرازی کی فارسی غزلوں کے اردو منظوم تراجم کا انتخاب ہے۔ 'محرم اسرار' (اردو منظوم ترجمہ از دیوان حافظ) کی رسم رونمائی بروز بدھ 12 جون 2019 بمقام جامعہ اشرفیہ حسامیہ شیخ صلاح الدین، اشرف نگر، گونڈوا، پونہ میں جناب خان حسنین عاقب کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ حسنین عاقب نے اپنے منفرد، نہایت دلچسپ اور پرلطف انداز میں بتایا کہ فارسی ہندوستان میں آٹھ سو سال تک دفتری زبان رہی ہے اور مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ساتھ براہمن پنڈت بھی اس زبان کے ماہر ہوا کرتے تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 جولائی 2019

وفیات :

علقمہ شبلی

کولکاتہ: مغربی بنگال کے مشہور استاد شاعر علقمہ شبلی کا 13 اگست کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اینگلو پرشین کولکاتہ مدرسہ کے سابق استاذ علقمہ شبلی گذشتہ دس

سالوں سے صاحب فراش تھے۔ علقمہ شبلی مقبول استاذ کے علاوہ ایک عظیم شاعر تھے، اور ان کی شناخت بچوں کے شاعر کے طور پر تھی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئرمین کے عہدے پر دو مدت تک کے لیے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ ان کے سفرنامہ حج پر بنگال اردو اکادمی ایوارڈ سے بھی نواز چکی ہے۔ گذشتہ سال بنگال اردو اکادمی نے علقمہ شبلی کے فن وحیات پر یک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ کولکاتہ میں ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سابق مرکزی وزیر سلطان احمد، مشہور صحافی سید جہانگیر رضا کاظمی، مشہور ڈرامہ نگار ظہیر انور وغیرہ شامل ہیں۔ مشہور ادبی میگزین مژگاں نے کئی سال قبل علقمہ شبلی کی ادبی خدمات پر خصوصی گوشہ شائع کیا تھا جس کی ادبی دنیا میں بہت ہی پذیرائی ہوئی تھی۔ ورثا کے ذرائع کے مطابق علقمہ شبلی کی آخری رسوم کی ادائیگی 15 اگست بعد نماز ظہر کی گئی۔ مژگاں کے ایڈیٹر ڈاکٹر نوشاد مومن نے علقمہ شبلی کے انتقال کو ایک عہد کے خاتمہ سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ علقمہ شبلی کا بنگال کے اس نسل سے تعلق تھا جنھوں نے بنگال میں اردو زبان و ادب کے فروغ بالخصوص شاعری کے صنف میں کولکاتہ کو شناخت بخشنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے ایک پوری نسل کی تربیت کی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اگست 2019

عبدالملک سلیم

رامپور: معروف قلم کار اور سینئر صحافی عبدالملک سلیم کا مختصر علالت کے بعد ان کی رہائش گاہ کھنڈسار کہنہ پر 19 جولائی

کو انتقال ہوگیا جس کی خبر ملتے ہی علمی و ادبی حلقہ میں سوگوار ماحول پیدا ہوگیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ جامعۃ الصالحات کے ناظم اعلیٰ مولانا یوسف اصلاحی نے مدرسہ جامعۃ الصالحات قدیم میں ادا کرائی اور مدرسہ سے ملحق قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ نماز جنازہ میں شعرا، ادبا صحافیوں کے علاوہ معززین شہر نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ مرحوم نہایت ملنسار صوم وصلوٰۃ کے پابند اور غریب پرور انسان تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں رسالہ 'الحسنات' کے علاوہ بتول، نور، ہادی اور بچوں کا ہلال وغیرہ کی ادارت کی ذمے داری کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑی ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 جولائی 2019

خالد نظامی

امروھہ: معروف سماجی شخصیت، راج محل بینکٹ ہال کے منتظم اور اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کے سرپرست خالد نظامی کا 5 اگست کو انتقال ہوگیا، جن کی تدفین بعد نماز ظہر اتراسی روڈ واقع قبرستان میں عمل میں لائی گئی۔ اس سلسلے میں اترپردیش اردو ادب سوسائٹی کی جانب سے اہل خانہ کو تعزیت پیش کی گئی۔ صدر کوثر علی عباسی نے مرحوم کے انتقال پر اظہار تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالد نظامی ہمیشہ ادبی وثقافتی تقریبات کے انعقاد میں پیش پیش رہتے ہیں۔ سوسائٹی ان کی کمی ہمیشہ محسوس کرے گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 5 اگست 2019

مشکور حسن شوق امروہوی

امروھه: سرگرم ادبی، سماجی و سیاسی کارکن مشکور حسن شوق امروہوی کا 4/ اگست کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا، ان کی عمر کم وبیش 85 سال تھی۔ قابل ذکر ہے کہ مشکور حسن شوق امروہوی ادبی و سماجی کاموں میں سرگرم رہے۔ مرحوم 'جنوادی لیکھک سنگھ' کے ضلع صدر ہونے کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صوبائی سکریٹری و انجمن ترقی اردو امروہہ کے کنوینر بھی تھے۔ ادبی و سماجی حلقوں میں مرحوم کی بے پناہ خدمات کے سبب بے حد احترام کیا جاتا تھا۔

انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین 'جنوادی لیکھک سنگھ' جیسی ادب تنظیموں کے امروہہ میں قیام اور سرکردہ سماجی کارکن ڈاکٹر سراج ہاشمی کے ساتھ مل کر امروہہ میں ان تنظیموں کی فروغ واشاعت میں مرحوم نے اہم کردار ادا کیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں ان کی چار بیٹیاں و ایک بیٹا ہے۔ اتوار کو بعد نماز عصر نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد ان کے آبائی قبرستان میں انھیں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے آخری سفر میں کثیر تعداد میں ادبی سماجی و سیاسی اشخاص نے شرکت کی جبکہ مختلف سماجی وادبی تنظیموں نے تعزیتی اجلاس منعقد کرکے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 اگست 2019

ایس۔ ایم عباس

ممبئی: 22 جولائی کی شب 10/ بجے دل کا دورہ پڑنے کے سبب جونپور، اترپردیش میں رہائش پذیر افسانہ نگار و نقاد ایس۔ ایم۔ عباس اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔

ایس۔ ایم۔ عباس کی ولادت 6/ جنوری 1945 کو مانی کلاں، جونپور کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی۔

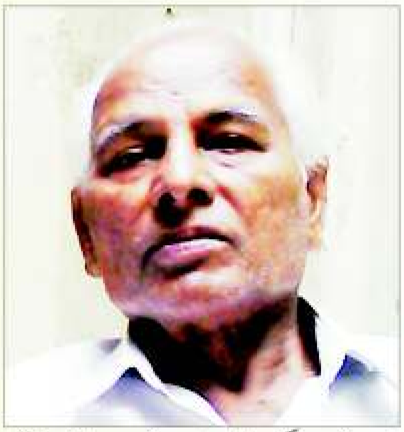

آپ پیشے سے وکیل تھے۔ ایس۔ ایم۔ عباس کا شمار ستّر کی دہائی میں اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ملک کے تمام موقر رسائل و جرائد میں آپ کے افسانے شائع ہوتے رہے۔ خاموش طبع اور کم گو ہونے کے سبب نظرانداز کیے گئے جبکہ آپ کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'درد کی آگ' 1980 میں منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں 'بدلتے موسم کا غم' 2016 میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ افسانوں کے علاوہ 'شفیق جونپوری، شخصیت اور فن'، 'وامق جونپوری، شخص اور شاعر'، 'جونپور کے چند شعرا' اور 'فکر و شعور' کو ملا کر چار تنقیدی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان تمام کتابوں پر اُتر پردیش اُردو اکادمی اور بہار اُردو اکادمی نے انعامات سے نوازا بھی ہے۔ مرحوم تیسرا افسانوں کا مجموعہ 'اور کیا لکھوں' کی اشاعت کی تیاری میں تھے۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی، 23 جولائی 2019

خراج عقیدت :

ساجد رشید

ممبئی: معروف فکشن رائٹر، صحافی اور ایکٹویسٹ ساجد رشید آٹھ برس قبل ۱۱ر جولائی کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، ہمارے دل میں اُن کے تئیں اس قدر محبت ہے جو آج بھی ہم انہیں بھولے نہیں ہیں۔ 'خبر مشن، ممبئی' کے روح رواں اشتیاق سعید نے ابتدائی کلمات نیز شرکاء محفل کا تعارف پیش کرتے ہوئے یہ جملہ کہا۔ 'سین ون ایڈورٹائزنگ' کے مالک محترم سیّد نسیم احمد کے زیر صدارت اس خوب سیرت محفل میں، مہمانانِ خصوصی کے طور پر معروف شاعر کمال احمد جائسی، زبیر احمد انصاری اور رُستم خان خاک نے شرکت کی جبکہ نظامت کے فرائض عبداللہ مسرور نے ادا کیے۔ معروف صحافی اور اسکرین رائٹر انور مرزا نے ساجد رشید کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن سے زمانۂ طالب علمی کے مراسم کے احوال بتاتے ہوئے کہا کہ ہم نے اسکول کے زمانے ہی میں اُردو میں بچوں کا ایک ماہنامہ 'لوٹ پوٹ' کے نام سے جاری کیا تھا جس کی ساری کاپیاں فروخت ہو جاتی تھیں۔ اخیر میں سیّد نسیم احمد نے صدارتی خطبہ میں ساجد رشید سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "یوں تو میں برسوں سے اُردو ٹائمز میں ساجد رشید کی تحریریں پڑھا کرتا تھا اور اُن کی بیباکی اور راست بازی سے مرعوب بھی تھا مگر اُن سے بالمشافہ ملاقات 'مہانگر اخبار' کے اجرا کے موقعے پر ہوئی۔" اس محفل میں آفاق الماس، غیاث الدین، سیّد عارف احمد، قدوس سلمانی اور سیّد اکمل نے خصوصی شرکت کی۔ اس محفل کے کنوینر عبدالباری ایم کے نے تمام شرکا و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی 13 جولائی 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.............................. بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

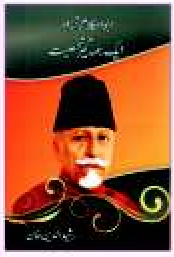

مصنف: رشید الدین خان

صفحات: 684

قیمت: 235 روپے

فرہنگِ مولانا ابوالکلام آزاد

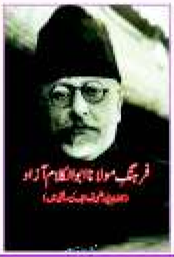

مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 669

قیمت: 290 روپے

درسِ بلاغت

ادارہ

صفحات: 230

قیمت: 85 روپے

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ابوسفیان

صفحات: 203

قیمت: 110 روپے

گوپال متل (مونوگراف)

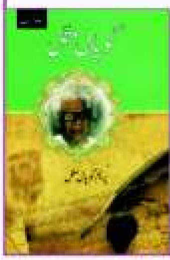

مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117

قیمت: 80 روپے

کوثر چاندپوری (مونوگراف)

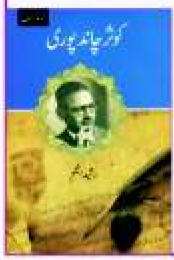

مصنف: رشید انجم

صفحات: 150

قیمت: 90 روپے

ہندوستان میں تانیثیت

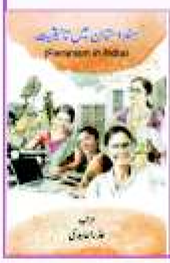

مرتبہ: عذرا عابدی

صفحات: 392

قیمت: 180 روپے

برق اور مقناطیس

مصنف: محمد یٰسین

صفحات: 158

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2019, Vol.21, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/08/2019**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025